رحمۃ اللہ علیہ

سیرۃ النعمان

مزار حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

سستی کتابیں ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ عزیزیہ کشمیری بازار لاہور

Price 1=8=

فہرست مضامین سیرۃ النعمان حصہ اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ لولیہ و نصلی علی نبیہ و نسلم علی آلہ و صحابہ

امابعد سیرۃ النعمان استاد الاساتذہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی تالیف سے ہے
یہ کئی مختلف مطابع میں چھپکر نکل چکی ہے لیکن ایسی مسخ صورت میں کہ اسکی تصحیح مشکل اور نئی تالیف
آسان نام نکو رفتگان ضائع مکن پر عمل پیرا ہو کر میں نے اسکی ہی تصحیح کی میں ہی جانتا ہوں۔ کہ
مجھے کتنی دقتیں اور مشکلیں پیش آئیں۔ خیر اللہ تعالی کا فضل شامل حال تھا۔ کتاب اب کتاب
کہلانے کی مستحق ہوگئی۔ مجھے اس کا صحیح شائع ہونا اس لئے بھی ضروری معلوم ہوا۔ کہ وہ امام جو
استاذ الکل محدث و فقیہ جن کی نظیر کیا بحیثیت علم اور کیا بحیثیت عمل تاریخ اب تک پیدا نہیں کر
سکی۔ اور آیندہ بھی امید نہیں کہ پیدا کر سکے اور جن کے کروڑوں مقلد دنیا میں موجود ہوں۔ اور ان کے
ہی حالات میں جو کتاب ہو وہ ہی ایسی غلط ملے۔ جو پڑھتے وقت دماغ پر سخت بوجھ ڈالے اور ایسے
علامہ کی تصنیف جو ایک ہی آخری زمانہ کا متفرد تھا۔ اسکی یہ گت بنے۔ دل برداشت نہیں کر
سکا تھا۔ اب مجھے امید ہے کہ مقلدان مذہب حنفی اسکو اپنا حرز جان بنا لینگے۔ اور میرے لئے
دعائے خیر فرمائینگے۔ میں نے بعض جگہ حواشی بھی لکھے ہیں۔ اس لئے اب حضرات تاجران کتب و
اہل مطابع کی خدمت میں ضروری گزارش ہے کہ للہ میری محنت برباد نہ کریں اور اسکو شائع
کرکے مجھے اور ناظرین کو تکلیف میں نہ ڈالیں۔ ہاں جتنے نسخے مطلوب ہوں۔ بہ نرخ تاجرانہ
عبدالرشید اینڈ برادر تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور سے طلب فرمائیں۔ امید ہے کہ اس طرح
بھی وہ معقول فائدہ میں رہینگے۔ وما علینا الا البلاغ

المطلع سید مبارک علی شاہ گیلانی (مولوی فاضل) مزنگ لاہور

قیمت قسم اول عہ/ قسم دوم عہ/

هو المستعان

سیرۃ النعمان

یعنی

امام ابو حنیفہ علیہ الرحمتہ کی سوانح عمری

کا

حصہ اوّل

مؤلفہ

مولانا محمد شبلی نعمانی

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ دیوانچند
پروپرائیٹر چھپا اور سید مبارک علیشاہ مرنگ نے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد و ستایش کہ بعنوان خوشست
نعت ہمانگونہ ہمانسان خوشست

شیفتگانیم و پیمبر پرست
سجدہ اگر نیست زمیں بوس ہست

تا بخودی پایہ نگہدار باش
دم ز شریعت زن و ہشیار باش

ہرچہ ز بیش ست و زکم باز دل
سجدہ و تعظیم زہم باز دل

در رہِ الفت کہ بود پیچ پیچ
پا چو نہی - بر تو نگیریم ہیچ

من کہ دریں دائرہ از دیر باز
پائے ز خلوت نہ نہادم فراز

باز برانم کہ دریں داوری
دل برم از خلق بافسونگری

خواستہ ام طرح دگر ریختن
شعبدۂ تازہ برانگیختن

بزم دگر ہست و تماشا دگر
بادہ دگر آرم و مینا دگر

زمزمۂ تازہ بساز افگنم
غلغلہ در حلقۂ راز افگنم

بادہ فرستم بحریفاں دگر
از مے دوشیں قدرے تند تر

زخمہ کہ بر تارِ سخن میزنم — ہاں بنگر تا بہ چہ فن میزنم
قاعدۂ سحر طرازیست ایں — نیک نگہ کن کہ چہ بازیست ایں
پا چو دریں معرکہ افشردہ ام — پایۂ فن تا بکجا بردہ ام
حرمت ایں کار نگہداشتن — ق — نامہ بہ لعل و گہر انباشتن
کارِ من ست ایں حد ہر خام نیست — ایں بود آں مے کہ بہر جام نیست
دست اگر سوئے قدح بُردہ ام — جائے عنب لختِ دل افشردہ ام
کانِ معانی ہمہ کاویدہ ام — کیں گہرے چند فراچیدہ ام
غارتِ بتخانۂ چیں کردہ ام — تا صنمے چند گزیں کردہ ام
خاک در میکدہ ہا بیختم — کیں مے صافی بقدح ریختم
مایہ اگر از دگراں خواستم — چارہ نہ بود ازاں خواستم
فنِ سِیر گرچہ بود دلپذیر — نیست دروغ و ز روایت گزیر
گرچہ متاع از دگر آوردہ ام — قطرہ ربودم گہر آوردہ ام

گرچہ مرا شیوۂ فن ایں نبود — حرف بہ اُردو زدن آئیں نبود
پیشتر ار گرم طلب بودہ ام — بادیہ پیمائے عرب بودہ ام
بزم چو آں فرّہ و آں ساز داشت — ساغرِ من بادۂ شیراز داشت
لیک چو آں مطرب و ساقی نماند — بوئے ازاں میکدہ باقی نماند
بزم بطرز دگر آراستم — خوشتر ازاں نیز کہ میخواستم
گرچہ سر و برگ سخن دیگرست — شمع ہمانست لگن دیگرست
باد گوارا بہ عزیزاں تمام — بادۂ گلگوں بہ سفالینہ جام

"ناموران اسلام" جس کا ایک حصہ المامون چھپکر شائع ہو چکا ہے۔ اوّل اوّل جب مجھکو اُس کا خیال پیدا ہوا۔ تو نہایت وسیع بنیاد پر ہوا۔ جس طرح میں نے خلافت و سلطنت کے مختلف خاندانوں سے ہیرو انتخاب کیے۔ ارادہ تھا کہ اسیطرح علوم و فنون کے جدا جدا خاندان

قایم کئے جائیں اور جو لوگ اُن خاص خاص فنوں میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اُن کو اس سلسلہ کا ہیرو قرار دیا جائے۔ مگر اتنا بڑا کام تنہا میرے بس کا نہ تھا مجبوراً حیثیت حکومت کی قید لگا کر میں نے اِس وسیع خیال کو بہت کچھ محدود کر دیا۔ بلکہ سلسلۂ حکومت سے بھی بہت سے خاندان چھوڑ دیئے۔ تاہم وہ خیال دل سے نہ گیا کہ فرصت ہو تو اہل کمال کا دربار بھی سجایا جائے کہ السیف والقلم توامان۔

المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی۔ اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا۔ لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لئے اُس کی تالیف سے ہاتھ اُٹھانا پڑا۔ اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں۔ حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپکر نہیں چکیں۔ اِس زمانۂ انتظار میں بیکار بیٹھنا تو مشکل تھا۔ خیال ہوا کہ کسی اور نامور کی لایف شروع کروں۔ لیکن یہ دیکھکر کہ الفاروق ناتمام ہے طبیعت رُک جاتی تھی۔ اور اس میدان میں قدم آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ اِدھر یہ خلش چین نہ لینے دیتی تھی۔ کہ علمی نامآوروں کے کارنامے دکھانے بھی ضرور ہیں۔ کیونکہ اسلام میں تیغ وقلم کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔

آخر یہ خیال غالب آیا اور چند روز کے لئے خاندانِ حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلہ کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ۔ حدیث۔ ادب۔ منطق۔ فلسفہ۔ ریاضی۔ مختلف خاندان سامنے تھے۔ بعض وجوہ سے فقہ کو ترجیح دی۔ اور امام ابوحنیفہ کو جو فقہ کے بانی ہیں اُس کا ہیرو قرار دیا۔ امام ابوحنیفہ کے اجتہادی مسائل قریبًا بارہ سو برس سے تمام ممالک اسلامی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی عظیم الشان اسلامی سلطنتوں میں اُن ہی کے مسائل قانونِ سلطنت تھے۔ اور آج بھی ہیں۔ اسلامی دنیا کا غالب حصہ اُن ہی کے مسائل کا پیرو ہے۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں اُن کی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ ظلم تھا۔ اگر اُن کی لائف خود اُردو میں نہ لکھی جاتی۔ جو بلحاظ غالب اُن ہی کے پیرؤں کی زبان ہے۔

امام ابوحنیفہ کو اسلام میں جو رتبہ حاصل ہے اُس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جس کثرت سے اُن کی سوانح عمریاں لکھی گئیں کسی کی نہیں لکھی گئیں مسلمانوں میں علم رجال کو جو ترقی ہوئی دنیا میں اُس کی کوئی نظیر موجود نہیں تراجم۔ طبقات۔ قرون۔ وفیات۔ اعیان۔ سنین وغیرہ کے نام سے جُدا جُدا عنوان قائم ہوئے۔ اور ایک ایک عنوان کے ذیل میں اس کثرت سے کتابیں لکھی گئیں کہ اُنکا شمار بھی مشکل ہے لیکن خاص سیرت (لایف) کے فن کو چنداں ترقی نہیں ہوئی۔ علماء۔ شعراء۔ قضاۃ حکماء۔ میں سے بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جن کے حالات مستقل تصنیفوں میں لکھے گئے۔ جہانتک ہم کو معلوم ہے۔ صرف امام ابوحنیفہ ایک شخص ہیں جنکے واقعات زندگی کے ساتھ معمول سے زیادہ اعتنا کیا گیا۔ نہایت کثرت سے اُن کی سوانح عمریاں لکھی گئیں اور اُن ناموروں نے لکھیں جو خود اس قابل تھے کہ اُن کی مستقل سوانح عمریاں لکھی جاتیں۔ اِس خصوصیت میں اگر کوئی شخص امام ابوحنیفہ کا ہمسر ہے تو صرف امام شافعی ہیں امام ابوحنیفہ کے حالات میں جسقدر کتابیں لکھی گئیں اُن میں سے جسقدر ہم تحقیق کر سکے حسب ذیل ہیں۔

نام کتابﷺ	نام مصنف	کیفیت
عقود المرجان	امام احمد بن محمد طحاوی المتوفی سنہ ۳۲۱	امام طحاوی حدیث و فقہ کے مشہور امام اور صرف ایک واسطہ سے امام شافعی کے شاگرد ہیں۔ اُن کی تصنیفات میں سے معانی الآثار چھپ گئی ہے۔
قلائد عقود الدر والعقیان	امام احمد بن محمد طحاوی	یہ عقود المرجان کا خلاصہ ہے۔
الروضۃ العالیۃ المنیفۃ	″	
مناقب النعمان	امام محمد بن احمد بن شعیب المتوفی سنہ ۳۵۷ھ	امام محمد بن احمد حدیث میں حاکم کے اُستاد ہیں یہ کتاب بیس جزوں میں ہے۔

ﷺ یہ فہرست زیادہ تر کشف الظنون سے ماخوذ ہے۔ بعض کتابوں کے نام یا مصنفین اور کتب کے زائد حالات اور کتابوں سے لئے گئے ہیں اور وہاں خاص تصریح کر دی گئی ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
مناقب النعمان	شیخ ابو عبداللہ الصیمری حسین بن علی	قاضی صیمری بڑے فقیہ اور فن حدیث میں دارقطنی کے شاگرد تھے۔ مورخ خطیب نے اُن سے روایت کی ہے قاضی ابو الولید باجی نے اُنکو امام الحنفیہ کہا ہے۔ ۴۳۶ھ میں وفات پائی۔ یہ تصنیف ایک ضخیم کتاب ہے اور امام ابوحنیفہ کے متعلق تصنیفات کا زیادہ تر ماخذ یہی کتاب ہے۔ (الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیہ)
مناقب النعمان	ابو العباس احمد بن الصلت الحمانی المتوفی ۳۰۸ھ	نہایت مفصل کتاب ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ خطیب بغدادی نے ابو العباس کی تضعیف کی ہے جیساکہ حنفیوں کی نسبت اُن کی عادت ہے
شقایق النعمان فی مناقب النعمان	علامہ جار اللہ زمخشری المتوفی ۵۳۸ھ	زمخشری ایک نامور مصنف ہیں تفسیر کشاف اُن کی مشہور کتاب ہے۔
مناقب النعمان	موفق الدین بن احمد الملکی الخوارزمی المتوفی ۵۶۸ھ	یہ کتاب چالیس بابوں میں ہے موفق الدین علامہ زمخشری کے شاگرد ہیں فقہ و ادب میں کامل تھے۔ حافظ سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں اِن کا ذکر کیا ہے۔
کشف الآثار	امام عبداللہ بن محمد الحارثی	مشہور مصنف ہیں۔ ابن جوزی نے ابو سعید سے روایت کی ہے کہ حدیث میں اُن کا

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		اعتبار نہیں۔ اس پر صاحب جواہر المضیہ فرماتے ہیں کہ امام عبداللہ کا رتبہ ابن جوزی و ابو سعید دونوں سے بڑھ کر ہے
مناقب النعمان	امام ظہیر الدین المرغینانی المتوفی سنہ ۵۰۶ھ	مشہور فقیہ ہیں۔ جواہر المضیہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ قاضی خاں انہیں کے شاگرد تھے۔
مناقب النعمان	امام محمد بن محمد الکروری المتوفی سنہ ۸۲۷ھ	گیارہ بابوں میں ہے۔ اس میں امام کے حالات کے ساتھ اُن کے مشہور تلامذہ یعنی قاضی ابو یوسف امام محمد۔ عبداللہ بن المبارک۔ امام زفر۔ داؤد الطائی۔ وکیع بن الجراح۔ حفص بن غیاث۔ یحییٰ بن زکریا۔ حسن بن زیاد کے حالات بھی جدا جدا بابوں میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب روم میں بہت متداول ہے۔ سلطان مراد ثانی کے حکم سے محمد بن عمر نے ترکی زبان میں اس کا ترجمہ کیا
مناقب النعمان	ابو القاسم بن کاس	عقود الجمان میں اس کتاب کے اکثر حوالے ہیں۔
کتاب الانتہا فی مناقب الثلاثۃ الفقہاء	قاضی بن عبد البر المتوفی سنہ ۴۶۳ھ	امام ابو حنیفہ و امام مالک و امام شافعی کے حالات ہیں۔ علامہ ابن خلکان نے قاضی ابو یوسف کے ترجمہ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		قاضی بن عبد البر بہت بڑے محدث اور امام ہیں ۔ اُن کی کتاب الاستیعاب صحابہ کے حالات میں ایک مشہور اور مستند کتاب ہے ۔
مناقب النعمان	ابو القاسم عبد اللہ بن محمد احمد المعروف بابن ابی العوام علّامہ ذہبی	علّامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ میں نے امام ابو حنیفہ کے مناقب ایک جداگانہ رسالہ میں لکھے ہیں ۔ علّامہ ذہبی بہت بڑے محدث تھے ۔ اس فن میں اُنکے بعد کوئی اس رتبہ کا نہیں ہوا میزان الاعتدال و کاشف و عبر و دول الاسلام و تذکرۃ الحفاظ اُن کی مشہور کتابیں ہیں
المواہب الشریفہ		اس کا ترجمہ ہو گیا ہے ۔ جس کا نام تحفۃ السلطان فی مناقب النعمان ہے
بستان فی مناقب النعمان	شیخ محی الدین عبد القادر القرشی المتوفی ۷۷۵ھ	الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیہ انہیں کی تالیف ہے ۔ حدیث میں حافظ تقی الدین سبکی کے شاگرد ہیں ۔
تبییض الصحیفہ فی مناقب ابی حنیفہ	حافظ جلال الدین سیوطی	مشہور مصنف ہیں ۔
عقود الجمان فی مناقب النعمان	محمد بن یوسف بن علی الدمشقی	زیادہ تفصیل آگے آئیگی ۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
الخیرات الحسان فی مناقب النعمان	حافظ ابن حجر مکی مصنف صواعقِ محرقہ	مشہور مصنف ہیں۔
قلائد عقود العقیان		مؤلف کا نام معلوم نہیں دیباچہ سے معلوم ہوا کہ یمن کا کوئی عالم ہے۔
مناقب النعمان	شمس الدین احمد بن محمد الستواہی	ترکی میں ہے اور نظم ہے۔
مناقب الامام الاعظم	شیخ ابو سعید عتیق بن داؤد الیمانی	فارسی زبان میں ہے۔
رسالہ فی فضل ابیحنیفہ		
نظم الجمان	شیخ صارم الدین ابراہیم بن محمد بن دقماق المتوفی سنہ ۸۰۹ھ	تین جلدوں میں ہے۔ امام ابوحنیفہ۔ قاضی ابویوسف و امام محمد ہر ایک کے حال میں الگ الگ جلد ہے۔
مناقب الامام اعظم	مولانا محمد کامی آفندی قاضی بغداد المتوفی سنہ ۱۱۳۶ھ	ترکی میں ہے۔
مناقب الامام اعظم	مستقیم زادہ سلیمان سعد الدین آفندی	ضخیم کتاب ہے سنہ ۱۱۶۸ھ میں تالیف ہوئی ترکی زبان میں ہے۔

افسوس ہے کہ یہ کتابیں ہمارے ملک میں ناپید ہیں۔ میرے پاس عقود الجمان و
الخیرات الحسان موجود ہیں۔ اور قلائد العقیان کا ایک عتیق نسخہ نظر سے گذرا ہے۔ الخیرات
الحسان اگرچہ اس وجہ سے کہ ابن حجر مکی کی طرف منسوب ہے۔ زیادہ مشہور ہے۔ لیکن
وہ خود کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ تمامتر عقود الجمان کا خلاصہ ہے۔ اور خود مصنف
نے دیباچۂ کتاب میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ قلائد العقیان کے دیباچہ سے ظاہر
ہوتا ہے کہ زیادہ تر قاضی صیمری کی تصنیف سے ماخوذ ہے۔ عقود الجمان جو نہایت جامع
اور مفصل کتاب ہے۔ اور میری تالیف کا عام ماخذ وہی ہے۔ حافظ ابو المحاسن محمد بن
یوسف بن علی الدمشقی الصالحی نزیل برقوقیہ کی تصنیف ہے۔ حافظ ابو المحاسن۔ جلال الدین
سیوطی کے شاگرد اور فن حدیث میں ممتاز ہیں یہ کتاب جیسا کہ خود مصنف نے خاتمہ
میں تصریح کی ہے۔ ربیع الثانی ۹۳۹ھ میں تمام ہوئی۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے
امام ابو حنیفہ کے حالات میں بہت سی کتابیں دیکھیں جن میں سے موفق بن احمد خوارزمی
کی تصنیف سب سے عمدہ تر اور جامع ہے۔ کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے۔ کہ میں نے اس بحث میں
جسقدر کتابیں دیکھیں اگر اُن سے لکھنا چاہتا تو یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں تیار ہوتی"

امام ابو حنیفہ کے حالات میں مستقل تصنیف تو مجھکو ایک ہی مل سکی۔ لیکن رجال و تاریخ
کی مستند کتابیں جن میں امام کا ذکر ہے اکثر میری نظر سے گذریں جن میں تاریخ صغیر بخاری
معارف بن قتیبہ۔ مختصر تاریخ خطیب بغدادی۔ انساب سمعانی۔ تہذیب الاسماء واللغات
للنووی۔ تذکرۃ الحفاظ علامۂ ذہبی۔ دول الاسلام للذہبی عبر فی اخبار من غبر للذہبی تہذیب التہذیب حافظ
بن حجر عسقلانی۔ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال للعلامہ صفی الدین الخزرجی۔ خاصۃً قابل ذکر
ہیں۔ کیونکہ یہ وہ کتابیں ہیں۔ جنپر آج فن رجال کا مدار ہے۔ اور حدیثوں کی تنقید کیلئے
زیادہ تر انہیں تصنیفات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

میری کتاب کا پہلا حصہ جس میں امام ابو حنیفہ کے عام حالات ہیں۔ انہیں تصنیفات
سے ماخوذ ہے۔ لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کی طرز اجتہاد و اصول استنباط
سے بحث ہے۔ اُس کے لئے یہ تمام دفتر بیکار تھا۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں سوانح

عمریوں کا یہ ڈھنگ ہی نہ تھا کہ حالات زندگی کے ساتھ اُس شخص کی تصنیفات یا مسائل سے بھی بحث کرتے۔ مناظرہ اور مذہبی حمایت کے پیرایہ میں البتہ ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اُن سے مسائل و تصنیفات پر تفصیلی ریویو لکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً ابن ابی شیبہ نے امام ابوحنیفہ کے مسائل پر جو اعتراضات کیے اور ثابت کیا کہ وہ حدیث کے مخالف ہیں۔ قاسم بن قطلوبغا المتوفی ۸۷۹ھ نے اُس کا مفصل جواب لکھا۔ شمس الائمہ کردری نے منخول کے جواب میں ایک مستقل کتاب لکھی۔ اسی طرح ترجیح مذہب ابی حنیفہ کے نام سے شیخ اکمل الدین محمد بن محمد البابرتی المتوفی ۷۸۶ھ اور شیخ ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ الجرجانی المتوفی ۳۹۷ھ نے مستقل کتابیں لکھیں۔ مؤرخ سبط ابن جوزی کے ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں لکھی۔ جس کا نام الانتصار لامام ائمۃ الامصار ہے۔ اسی مؤرخ کی ایک اور تصنیف ہے جو تیس بابوں میں ہے۔ اُس میں تفصیلاً امام ابوحنیفہ کے مسائل کی عمدگی ثابت کی ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ "یہ کتاب اپنے باب میں بے نظیر ہے"۔ اسی مضمون پر عمر بن محمد بن سعید الموصلی کی ایک تصنیف ہے جس کا نام الانتصار و الترجیح ہے۔ سب سے مفصل کتاب الابانۃ ہے جو قاضی ابوجعفر احمد بن عبداللہ بن القاسم کی تصنیف ہے۔ اور چھ بابوں پر منقسم ہے۔ پہلے باب میں ثابت کیا ہے کہ امام کا مذہب اصول سلطنت سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔ دوسرا باب اس بحث میں ہے کہ اُنکے مسائل حدیث و آثار سے ثابت ہیں۔ چھٹے باب میں اُن مسائل کا ذکر ہے جن پر مخالفوں نے اعتراض کیے ہیں۔ پھر نہایت تفصیل کے ساتھ اُنکے جواب دیئے ہیں۔ جواہر مضیئہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ "میں نے یہ کتاب دیکھی ہے۔ نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اور جو دعوےٰ کیا ہے اُسکے ثبوت میں بہت سی مثالیں دی ہیں"۔

بے شبہہ اس قسم کی تصنیفات سے بہت بڑی مدد مل سکتی تھی لیکن میں مصنف کشف الظنون کی سی قسمت کہاں سے لاتا کہ ان نایاب تصنیفات پر دسترس پا سکتا۔ بڑی تلاش سے شمس الائمہ کردری کا رسالہ بہم پہنچا۔ کہ اس ناداری میں وہ بھی غنیمت ہے

بعض بعض باتیں اس رسالہ سے لیں۔ باقی میرا تتبع اور تحقیق ہے جسکے لیے خوش قسمتی سے حدیث وفقہ کا بڑا ذخیرہ میرے پاس مہیا تھا

یہ بات بھی لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ امام ابوحنیفہ کی زندگی کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ ولادت نشوونما۔ طریقۂ معاش۔ طرز معاشرت وغیرہ۔ اس قسم کے حالات تاریخی پیرایہ رکھتے ہیں۔ روایت میں اُنکا ثقہ ہونا نہ ہونا محدثانہ بحث ہے۔ اُن کے مسائل و طریقۂ اجتہاد پر رائے قائم کرنی مجتہد کا کام ہے۔ اس لیے جو کتاب ان تمام حیثیتوں پر شامل ہوگی ضرورت ہے کہ مختلف بحثوں میں خود اُس کی حیثیتیں بھی بدلتی جائیں اُس کا طرز تحریر کہیں مورخانہ ہوگا۔ کہیں محدثانہ۔ اور کہیں دونوں پہلوؤں سے الگ مجتہدانہ روش ہوگی۔ اس کتاب میں میں نے ان مختلف حیثیتوں کا لحاظ رکھا ہے۔ جو حالات تاریخ سے متعلق ہیں اُن میں وہ شہادتیں کافی سمجھی ہیں جو عام مورخوں کے نزدیک مسلم ہیں جو واقعہ محدثانہ پہلو رکھتا ہے اُس میں زیادہ تر تدقیق کی ہے۔ اور تمام تر اُن اصول سے کام لیا ہے جو محدثین نے اخبار و روایت کے لیے قرار دیے ہیں۔ عام ناظرین کو شاید اُن بحثوں میں مزا نہ آئے مگر ایسے ضروری حصہ کو میں کیونکر چھوڑ سکتا تھا۔ عام تاریخی واقعات میں گو رُواۃ حدیث کی طرح بال کی کھال نہیں نکالی ہے تاہم کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا جس کی سند موجود نہ ہو۔ ساتھ ہی اس کا التزام کیا ہے کہ ایسی کتاب کا حوالہ نہ دیا جائے جو خود میری نظر سے نہ گذری ہو کیونکہ نقل در نقل ہو کر اکثر روایتیں اپنی حالت پر قائم نہیں رہتیں۔ ان احتیاطوں کے ساتھ بھی ممکن بلکہ ضرور ہے کہ مجھ سے مسامحات اور غلطیاں ہوئی ہوں۔ لیکن میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ وقال اللہ تعالیٰ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

امام ابوحنیفہ کا نام و نسب و ولادت

نعمان نام۔ ابوحنیفہ کنیت۔ امام اعظم لقب۔ شجرۂ نسب یہ ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی ابن ماہ۔ یہ امر جیسا کہ خود ناموں کی ترکیب سے ظاہر ہے عموماً مسلم ہے کہ امام صاحب

عجمی النسل تھے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کس نسل سے تھے اور عرب میں کیونکر آئے
خطیب مؤرخ بغدادی نے امام کے پوتے اسمٰعیل کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ
میں اسمٰعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہوں۔ ہم لوگ نسل فارس سے
ہیں اور کبھی کسی غلامی میں نہیں آئے۔ ہمارے دادا ابوحنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے
ثابت بچپن میں حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اُنہوں نے
اُنکے اور اُن کے خاندان کے حق میں دعائے خیر کی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ وہ دعا
بے اثر نہیں رہی[1]" اسمٰعیل نے امام صاحب کے دادا کا نام نعمان بتایا اور پردادا کا نام
مرزبان حالانکہ عام طرح پر زوطی اور ماہ مشہور ہے۔ غالباً جب زوطی ایمان لائے تو
اُن کا نام نعمان سے بدل دیا گیا۔ اسمٰعیل نے سلسلۂ نسب کے بیان میں زوطی کا وہی اسلامی
نام لیا اور حمیت اسلام کا مقتضا بھی یہی تھا۔ زوطی کے باپ کا اصلی نام غالباً کچھ اور ہوگا
اور ماہ اور مرزبان لقب ہوں گے۔ کیونکہ اسمٰعیل کی روایت سے اسقدر اور بھی ثابت
ہے کہ اِن کا خاندان فارس کا ایک معزز اور مشہور خاندان تھا۔ فارس میں رئیس شہر کو
مرزبان کہتے ہیں۔ اِس لئے نہایت قرین قیاس ہے کہ ماہ اور مرزبان لقب ہیں نہ
نام۔ حافظ ابوالمحاسن نے قیاس لگایا ہے کہ "ماہ اور مرزبان ہم معنی الفاظ ہونگے"
اُنہوں نے قیاساً کہا کیونکہ وہ فارسی زبان نہیں جانتے تھے۔ لیکن میں یقیناً کہتا ہوں
کہ درحقیقت ماہ اور مرزبان کے ایک معنی ہیں۔ ماہ دراصل وہی ماہ ہے جسکے معنی بزرگ
اور سردار کے ہیں مشہور مصرع ہے۔ نہ کہ رامنزلت بانند مہ را ۔ عربی لہجہ نے مہ کو ماہ
کر دیا ہے۔

بعض مؤرخوں نے زوطی کی نسبت لکھا ہے کہ "کابل سے گرفتار ہو کر آئے۔ اور
قبیلہ بنی تیم اللہ کی ایک عورت نے خریدا۔ کچھ دنوں غلامی میں رہے پھر اُسنے آزاد
کر دیا۔ اِس لئے امام کا خاندان مولیٰ بنی تیم اللہ کہلاتا ہے"۔ مخالفوں نے جنکو امام
کی تنقیص میں مزا آتا ہے۔ اس روایت کو زیادہ چمکایا ہے۔ حالانکہ اس قسم کی غلامی

[1] مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ - ترجمہ امام ابوحنیفہ ۱۲

زوطی غلام نہ تھے

ثابت بھی ہو تو کسرِ شان کی کیا بات ہے۔ زمانہ نے خاندان کسریٰ پر اس لقب کا داغ لگایا ہے۔ ہمارے علماء حضرت ہاجرہ کو کنیز تسلیم کرتے ہیں۔ (گو توریت سے ثابت نہیں) اسلام کے قریب تر زمانہ میں اکثر وہ لوگ حدیث و روایت کے امام نظر آتے ہیں جن پر اس قسم کی غلامی کا اطلاق ہو چکا تھا۔ امام حسن بصری۔ ابن سیرین۔ طاؤس عطا ابن یسار۔ نافع۔ عکرمہ۔ مکحول۔ جو اپنے زمانہ کے مقتدائے عام تھے۔ خود یا انکے باپ دادا غلام رہ چکے تھے۔

زوطی کا غلام ہونا بھی ثابت ہو تو کچھ عار نہیں۔ لیکن تاریخی شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔ امام کے نسب میں اور بھی اختلافات ہیں۔ ابو مطیع نے انکو نسل عرب سے شمار کیا ہے۔ اور سلسلہ نسب یوں بتایا ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن یحییٰ بن زید بن اسد بن راشد الانصاری۔ حافظ ابو اسحٰق نے شجرہ نسب کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے۔ نعمان بن ثابت بن کاؤس بن ہرمز بن بہرام۔ زوطی کے مقام سکونت میں بھی اختلاف ہے۔ اور یہ اختلاف ضرور ہونے چاہئیں تھے۔ زوطی اول اول جب عرب میں آئے ہوں گے تو برسوں تک اُن کی حالت بیگانگی کی حالت رہی ہوگی۔ لوگوں کو اُن کے حالات کے ساتھ چنداں اعتنا نہ ہوگا۔ اور ہوگا تو زبان کی اجنبیت کی وجہ سے صحیح حالات نہ معلوم ہو سکے ہونگے۔ معاشرت کی ضرورتوں نے زوطی کو مجبور کیا ہوگا کہ وہاں کے رہنے والوں سے دوستانہ تعلق پیدا کریں۔ یہ طریقہ عرب میں عام طور پر جاری تھا۔ اور اس قسم کے تعلق کو ولاء کہتے تھے۔ جسکا مشتق موسلے ہے۔ موالے غلام کو بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح لفظی مشارکت سے بعضوں نے زوطی کو غلام سمجھ لیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ خیال روایت کی شکل پکڑ کر کسیقدر عام ہوگیا جسکی وجہ سے اسمٰعیل کو دفع وخل کرنا پڑا کہ "واللہ ہمارا خاندان کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آیا" اسمٰعیل نہایت ثقہ اور معزز شخص تھے۔ اس وجہ سے دقیقہ سنج مورخوں نے اس بحث میں اُن ہی کی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ کہ صاحب البیت ادری بما فیہا۔ قاضی صیمری نے جو بڑے پایہ کے مصنف ہیں صاف تصریح کی ہے کہ "زوطی بنی تیم اللہ کے

حلیف یعنی ہم قسم[1] تھے۔ اُس روایت کا (جس میں زوطی کی غلامی کا ذکر ہے) یہ حصّہ بھی غلط ہے۔ کہ وہ کابل سے گرفتار ہو کر آئے۔ زوطی کے باپ دادا کے نام فارسی زبان کے ہیں۔ خود امام ابو حنیفہ کی نسبت ثابت ہے کہ وہ خاندانی حیثیت سے فارسی زبان جانتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ کابل کی زبان فارسی نہ تھی۔

زوطی کی نسبت ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص کس شہر کے رہنے والے تھے۔ مورخوں نے مختلف شہروں کے نام لئے ہیں۔ جن میں سے کسی کی نسبت ترجیح کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ یقینی طور پر جو ثابت ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ اقلیم فارس اور فارسی نسل سے تھے۔ یہ ممالک اُس زمانہ میں اسلامی اثر سے معمور تھے اور اکثر بڑے بڑے خاندان اسلام قبول کرتے جاتے تھے۔ غالبًا زوطی اِسی زمانہ میں اسلام لائے اور جوش شوق۔ یا خاندان والوں کی ناراضی سے جسکا باعث تبدیل مذہب تھا عرب کا رُخ کیا۔ یہ جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اور شہر کوفہ دار الخلافہ ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ اس تعلق سے زوطی نے کوفہ کو پسند کیا۔ اور وہیں سکونت اختیار کی۔ کبھی کبھی جناب امیر کے دربار میں حاضر ہوتے۔ اور خلوص عقیدت کے آداب بجا لاتے۔ ایک بار نوروز کے دن کہ پارسیوں کی عید کا دن ہے فالودہ نذر کے طور پر بھیجا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ "نوروزنا کل یوم" یعنی ہمارے ہاں ہر روز نوروز ہے"۔ ثابت امام ابو حنیفہ کے پدر بزرگوار کوفہ ہی میں پیدا ہوئے۔ زوطی نے کمسِنی کی حالت میں ثابت کو حضرت علی کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپ نے بزرگانہ شفقت فرمائی اور اُن کے اور اُن کی اولاد کے حق میں دعائے خیر کی۔

ثابت کے حالات زندگی بالکل نامعلوم ہیں۔ قرائن سے اسقدر پتہ چلتا ہے کہ تجارت کے ذریعہ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ چالیس برس کی عمر ہوئی تو خدا نے فرزند عطا کیا۔ جس کا نام والدین نے نعمان رکھا۔ لیکن زمانہ نے آگے چلکر امام

---

[1] دیکھو قلائد عقود العقیان باب اوّل۔ علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللغات کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ موتے کا لفظ زیادہ تر حلیف ہی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے ۱۲

اعظم کے لقب سے پکارا۔

اُس وقت عبدالملک بن مروان جو دولتِ مروانیہ کا دوسرا تاجدار شمار کیا جاتا ہے۔ مسند آرائے خلافت تھا۔ یہ وہ مبارک عہد تھا کہ رسول اللہ کے جمال مبارک سے جن لوگوں کی آنکھیں روشن ہوئی تھیں۔ اُن میں سے چند بزرگ موجود تھے جن میں سے بعض امام ابوحنیفہ کے آغاز شباب تک زندہ رہے۔ انس بن مالک نے جو رسول اللہ کے خادم خاص تھے ۹۳ھ میں وفات پائی۔ سہل بن سعد نے ۹۱ھ میں انتقال کیا۔ اور ابوطفیل عامر بن واثلہ تو سو ہجری تک زندہ رہے۔ لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امام ابوحنیفہ نے کسی سے بھی کوئی حدیث روایت کی۔ اس پر لوگوں کو نہایت تعجب ہے اور مورخوں نے اس کے مختلف اسباب خیال کئے ہیں۔ اور بعضوں کی رائے ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اُس وقت تک کسی قسم کی تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ اُنکے باپ دادا تجارت کرتے تھے۔ اس لئے اُن کی نشو و نما بھی ایک عام تاجر کی حیثیت سے ہوئی بڑے ہونے پر امام شعبی کی ہدایت سے علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُس وقت موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا یعنے صحابہ میں سے کوئی باقی نہیں رہا تھا۔

امام ابوحنیفہ نے صحابہ سے کیوں روایت نہیں کی

لیکن میرے نزدیک اس کی ایک اور وجہ ہے۔ محدثین میں باہم اختلاف کہ حدیث سیکھنے کے لئے کم از کم کیا عمر مشروط ہے۔ اس امر میں ارباب کوفہ سب سے زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ یعنی بیس برس سے کم عمر کا شخص حدیث کی درسگاہ میں شامل نہیں ہو سکتا تھا اُن کے نزدیک چونکہ حدیثیں بالمعنی روایت کی گئی ہیں اس لئے ضرور ہے کہ طالب علم پوری عمر کو پہنچ چکا ہو۔ ورنہ مطالب کے سمجھنے اور اُسکے ادا کرنے میں غلطی کا احتمال ہے غالباً یہی قید تھی جس نے امام ابوحنیفہ کو ایسے بڑے شرف سے محروم رکھا۔ اور سچ پوچھو تو یہ قید مصلحت سے خالی بھی نہیں۔ جن لوگوں نے دس بارہ برس کے سن میں صحابہ سے حدیثیں سنیں اُن کی روائتیں اس لحاظ سے تو نہایت قابل اعتماد ہیں کہ رسول اللہ تک صرف ایک واسطہ ہے۔ لیکن اس بات کا قوی احتمال موجود ہے کہ کم سنی

سلہ مقدمہ ابن الصلاح مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۱۲۔

کی وجہ سے مضمون حدیث کی تمام خصوصیتیں خیال میں نہ آئی ہوں جس کی وجہ سے ادائے مطلب میں عظیم الشان غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

بہر نوع وجہ کچھ ہو واقعہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے کسی صحابی سے کوئی حدیث نہیں سُنی۔ تاہم یہ شرف اُن کی قسمت میں تھا کہ جن آنکھوں نے پیغمبر کا جمال دیکھا تھا اُنکے دیدار سے عقیدت کی آنکھیں روشن کیں۔ یہ واقعہ ایک تاریخی واقعہ ہے لیکن چونکہ اس سے تابعیت کا رتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اِس لئے یہ مسئلہ مذہبی پیرایہ میں آگیا ہے۔ اور اُس پر بڑی بڑی بحثیں قائم ہوگئی ہیں۔ بے شبہ امام ابو حنیفہ کو اس شرف پر ناز تھا اور بجا تھا کہ اُنہوں نے حضرت انس صحابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غیر قومیں اِن باتوں کو معمولی امر خیال کرینگی لیکن اِن واقعات سے اُس محبت اور جوشِ عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے جو مسلمانوں کو رسول اللہ اور اُن کے تعلق کی وجہ سے صحابہ کے ساتھ تھا۔ سچ ہے۔ شعر

تابعیت کی بحث

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

ہمارے زمانہ کے بعض مصنفوں نے امام کی تابعیت سے انکار کیا ہے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پہلے بھی لوگوں کو شبہہ ہوا تھا۔ لیکن محدثین نے جن کو اس قسم کی بحثوں کے طے کرنے کا سب سے زیادہ حق حاصل ہے۔ امام کے موافق فیصلہ کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی سے کہ فن حدیث کے ایک عنصر ہیں فتویٰ لیا گیا تھا۔ اُنہوں نے یہ جواب لکھا۔ "امام ابو حنیفہ کے زمانہ میں کئی صحابی موجود تھے اِس لئے کہ امام ۸۰ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے۔ اور اُسوقت وہاں صحابہ میں سے عبد اللہ بن ابی اوفی موجود تھے۔ کیونکہ وہ ۸۲ھ میں یا اس کے بعد مرے۔ اور ابن سعد نے روایت کی ہے جس کی سند میں کچھ نقصان نہیں۔ کہ امام ابو حنیفہ نے انس بن مالک کو دیکھا تھا۔ اِن دو صحابہ کے سوا اور صحابہ بھی مختلف شہروں میں موجود تھے۔ بعض لوگوں نے اُن حدیثوں کو جمع کیا ہے جو امام نے صحابہ سے روایت کیں۔ لیکن ان حدیثوں کی سندیں ضعف سے خالی نہیں۔ اور صحیح یہی ہے کہ امام اُنکے ہمزماں تھے اور بعض صحابہ کو دیکھا تھا۔

حافظ ابن حجر کا فتوے

جیسا کہ ابن سعد نے روایت کی ہے۔ پس اس لحاظ سے امام ابوحنیفہ تابعین کے طبقہ میں ہیں۔ اور یہ امر اور اماموں کی نسبت جو اُن کے ہمعصر تھے مثلاً اوزاعی شام میں۔ حماد بصرہ میں۔ ثوری کوفہ میں۔ مالک مدینہ شریفہ میں۔ لیث مصر میں۔ ثابت نہیں ہوا واللہ اعلم[۱]

ابن سعد کی جس روایت کا حافظ ابن حجر نے حوالہ دیا ہے وہ صرف ایک واسطہ یعنی سیف بن جابر کے ذریعہ سے امام ابوحنیفہ تک پہنچتی ہے۔ یعنی ابن سعد نے سیف بن جابر سے سُنا اور سیف نے خود امام ابوحنیفہ سے۔ ابن سعد وہ شخص ہیں جن کی نسبت علامہ نووی نے تہذیب الاسمار میں لکھا ہے کہ "اگرچہ اُن کا شیخ واقدی ثقہ نہیں مگر وہ خود نہایت ثقہ ہیں"۔ سیف بن جابر بصرہ کے قاضی اور صحیح الرّوایت تھے۔ اس لحاظ سے یہ روایت اسقدر صحیح اور مستند ہے کہ قوی سے قوی حدیث بھی اُس سے زیادہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر تمام بڑے بڑے محدثین مثلاً خطیب بغدادی۔ علامہ سمعانی مصنف کتاب الانساب۔ علامہ نووی شارح صحیح مسلم۔ علامہ ذہبی۔ حافظ حجر عسقلانی۔ زین الدین عراقی۔ سخاوی۔ ابوالمحاسن دمشقی نے جن پر اب حدیث و روائت کا مدار ہے قطعاً فیصلہ کر دیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے حضرت انس کو دیکھا تھا[۲]۔ ابن خلکان نے بھی خطیب بغدادی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ لیکن چونکہ مؤرخ مذکور نے لکھا ہے کہ "امام ابوحنیفہ کو کسی صحابی سے ملاقات اور روایت حاصل نہیں ہوئی"۔ لوگوں کو دھوکا ہوا کہ ابن خلکان تابعیت کے منکر ہیں۔ حالانکہ ابن خلکان کو ملاقات اور روائت سے انکار ہے نہ رویت سے۔ لیکن اگر ابن خلکان کی عبارت کا وہی مطلب ہو جو بعض ظاہر بینوں نے قرار دیا ہے تاہم کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے بڑے بڑے محدثین کے مقابلہ میں اُن کی شہادت کچھ بھی اعتبار کے قابل ہوگی۔ اصول روایت میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ اگر کسی واقعہ کے اثبات

[۱] یہ فتویٰ کو حافظ ابوالمحاسن نے عقود الجمان میں بعبارتہا نقل کیا ہے اور میں نے اُسی کا لفظی ترجمہ کیا ہے ۱۲

[۲] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی میں تصریح موجود ہے ۱۲ [۳] مختصر تاریخ خطیب بغداد۔ کتاب الانساب و تہذیب الاسمار واللغات و تذکرۃ الحفاظ و عبر فی اخبار من غبر للذہبی و تہذیب التہذیب میں امام ابوحنیفہ کا ترجمہ دیکھو۔

ونفی میں برابر درجہ کی شہادتیں موجود ہوں تو اثبات کا اعتبار ہوگا۔ یہاں نفی کی شہادت ثبوت کے مقابلہ میں بالکل کم رتبہ ہے۔

بعض حنفیوں نے رؤیت سے بڑھکر روایت کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ اور تعجب ہے کہ علامہ عینی شارح ہدایہ بھی اس غلطی کے حامی ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ دعوے ہرگز پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ حافظ ابوالمحاسن نے عقود الجمان میں ان تمام حدیثوں کو مع سند نقل کیا ہے جن کی نسبت یہ خیال ہے کہ امام نے صحابہ سے سنیں تھیں۔ پھر اصول حدیث سے اُن کی جانچ کی ہے اور ثابت کردیا ہے کہ ہرگز ثابت نہیں محدثانہ بحثیں تو وقت طلب ہیں صاف بات یہ ہے کہ امام نے صحابہ سے ایک بھی روایت کی ہوتی تو سب سے پہلے امام کے تلامذۂ خاص اُس کو شہرت دیتے۔ لیکن قاضی ابو یوسف امام محمد۔ حافظ عبدالرزاق بن ہمام عبداللہ بن المبارک۔ ابو نعیم فضل بن دکین۔ مکی بن ابراہیم۔ ابو عاصم النبیل وغیرہ سے کہ امام کے مشہور اور بااخلاص شاگرد تھے۔ اور سچ پوچھئے تو زیادہ تر انہیں لوگوں نے اُن کے نام کو زندہ رکھا ہے، ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق منقول نہیں۔

صحابہ سے روایت نہیں کی

امام کی کنیت جو نام سے زیادہ مشہور ہے حقیقی کنیت نہیں ہے۔ امام کی کسی اولاد کا نام حنیفہ نہ تھا۔ یہ کنیت وصفی معنی کے اعتبار سے ہے۔ یعنی ابو الملۃ الحنیفہ قرآن میں خدا نے مسلمانوں سے خطاب کرکے کہا ہے۔ واتبعوا ملۃ ابراہیم حنیفا امام ابو حنیفہ نے اسی نسبت سے اپنی کنیت ابو حنیفہ اختیار کی۔

سن رُشد۔ تعلیم و تربیت۔ شیوخ و اساتذہ

امام کے بچپن کا زمانہ نہایت پُرآشوب زمانہ تھا۔ حجاج بن یوسف خلیفہ عبدالملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا اور ہر طرف ایک قیامت برپا تھی۔ چونکہ مذہبی گروہ کی مخالفت کی وجہ سے عرب و عراق میں اب تک مروانی حکومت کے پاؤں نہیں جمے تھے۔ حجاج کی سفاکیاں زیادہ تر انہیں لوگوں پر مبذول تھیں جو ائمہ مذہب اور علم و فضل کی حیثیت سے مقتدائے عام تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے نہایت سچ کہا

گئے اگر اور پیغمبروں کی امتیں سب ملکر اپنے اپنے زمانہ کے بدکاروں کو پیش کریں اور ہم صرف حجاج کو مقابلہ میں لائیں تو واللہ ہمارا پلہ بھاری رہیگا"۔ عبد الملک نے ۸۶ھ میں وفات کی۔ اور اُس کا بیٹا ولید تخت نشین ہوا۔ ولید کے زمانہ میں اگرچہ فتوحات نے نہایت ترقی کی اسپین وسندھ دو بڑی مملکتیں اسلام کے قبضہ میں آگئیں۔ خوارزم و سمرقند سے گذر کر کابل و فرغانہ پر علم اسلام نصب ہوا۔ مغرب کی طرف جزائر منورقہ ومیورقہ فتح ہوئے۔ لیکن اسلام کی روحانی برکتوں کا نشان نہ تھا۔ ملکی عہدہ داروں میں سے جو لوگ جسقدر زیادہ معزز اور با اختیار تھے اُسی قدر ظالم اور سفاک تھے۔ اُسی زمانہ کی نسبت حضرت عمر بن عبد العزیز فرمایا کرتے تھے کہ "ولید شام میں۔ حجاج عراق میں عثمان حجاز میں۔ قرۃ مصر میں۔ واللہ تمام دنیا ظلم سے بھر گئی"۔ اس عالمگیر آشوب میں بھی اگرچہ درس وتعلیم کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا۔ جا بجا حدیث و روایت کی درگاہیں موجود تھیں اور فقہاء ومحدثین باوجود بے اطمینانی کے درس وتدریس میں مشغول تھے تاہم اسلام کی حوصلہ مندیوں اور جوش کے لحاظ سے جسقدر تھا نہایت کم تھا۔

ملک کی خوش قسمتی تھی کہ حجاج ۹۵ھ میں مر گیا۔ ولید نے بھی ۹۶ھ میں وفات پائی ولید کے بعد سلیمان بن عبد الملک نے مسند خلافت کو زینت دی جس کی نسبت مورخین کا بیان ہے کہ خلفائے بنو اُمیہ میں سب سے افضل تھا۔ سلیمان نے اسلامی دنیا پر سب سے بڑا یہ احسان کیا کہ عمر بن عبد العزیز کو مشیر سلطنت بنایا۔ اور مرتے دم تحریری وصیت کی کہ "میرے بعد عمر بن عبد العزیز تخت نشین ہوں"۔ سلیمان نے ۹۹ھ میں وفات پائی اور وصیت کے موافق عمر بن عبد العزیز مسند خلافت پر بیٹھے۔ اُن کی خلافت نے دفعۃً حکومت مروانی کا رنگ بدل دیا۔ اور تمام ملک میں عدل وانصاف علم وعمل خیر وبرکت کی جان تازہ ڈالدی۔ ایک مدت سے حضرت علیؑ پر خطبوں میں جو لعن پڑھا جاتا تھا یکلخت موقوف کر دیا۔ شہزادگان بنوامیہ کے ہاتھوں سے جاگیریں چھین لیں۔ جہاں جہاں ظالم عمّال تھے بیک قلم معزول کر دیے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ علوم مذہبی کو وہ رونق دی کہ گھر گھر یہی چرچے پھیل گئے۔ امام زہری کو حکم دیا کہ حدیثوں کو یکجا کریں۔ یہ مجموعہ طیار ہوا

تو ممالک اسلامیہ میں اُس کی نقلیں بھوائیں

غرض حجاج و ولید کے عہد تک تو امام ابو حنیفہ کو تحصیل علم کی طرف متوجہ ہونیکی نہ رغبت ہو سکتی تھی نہ کافی موقع مل سکتا تھا۔ تجارت باپ دادا کی میراث تھی۔ اس لئے خزبافی کا کارخانہ قائم کیا۔ اور حسن تدبیر سے اُس کو بہت کچھ ترقی دی۔ لیکن سلیمان کی عہد خلافت میں جب درس تدریس کے چرچے زیادہ عام ہوئے تو اُنکے دل میں بھی ایک تحریک پیدا ہوئی۔

حسن اتفاق یہ کہ ان ہی دنوں میں ایک اتفاقی واقعہ پیش آیا جس سے اُن کے ارادہ کو اور بھی استحکام ہوا۔

تحصیل علم کی تحریک

ایک دن بازار جارہے تھے۔ امام شعبی جو کوفہ کے مشہور امام تھے ان کا مکان راہ میں تھا۔ سامنے سے نکلے تو اُنہوں نے یہ سمجھکر کہ کوئی نوجوان طالب علم ہے پاس بلا لیا اور پوچھا کہ "کہاں جارہے ہو"۔ اُنہوں ایک سوداگر کا نام لیا۔ امام شعبی نے کہا "میرا مطلب یہ نہ تھا۔ تم پڑھتے کس سے ہو"؟ اُنہوں نے افسوس کے ساتھ جواب دیا کہ "کسی سے بھی نہیں"۔ شعبی نے کہا کہ "مجھ کو تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں تم علما کی صحبت میں بیٹھا کرو"۔ اس نصیحت نے اُن کے دل میں گھر کر لیا اور نہایت اہتمام سے تحصیل علم پر متوجہ ہوئے۔ اُس وقت تک علم جس چیز کا نام تھا وہ ادب۔ انساب۔ ایام العرب۔ فقہ حدیث۔ کلام تھا۔ کلام اگرچہ آج کل کا علم کلام نہ تھا۔ کیونکہ اس عہد تک مسائل اسلام پر فلسفہ کا پرتو نہیں پڑا تھا تاہم ان علوم میں دقت نظر۔ بلندی خیال۔ زور طبع کیلئے اس سے وسیع تر میدان نہ تھا۔ اسلام جب تک عرب کی آبادی میں محدود رہا اُس کے مسائل نہایت سادہ اور صاف رہے۔ لیکن فارس اور مصر و شام پہنچکر ان میں رنگ آمیزیاں شروع ہوگئیں۔ ان ملکوں میں اگرچہ حکمت و فلسفہ کا وہ زور باقی نہ رہا تھا تاہم فلسفہ کے بگڑے بگڑائے مسائل عام لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے اور طبیعتیں عموماً باریک بینی اور احتمال آفرینی کی عادی تھیں۔

۱۔ عقود الجمان باب سادس - ۱۲

قرآن پاک میں خدا کی ذات و صفات ۔ مبدأ و معاد وغیرہ کے متعلق جو کچھ مذکور ہے عرب نے اس کو اجمالی نگاہ سے دیکھا اور خلوص اعتقاد کیلئے وہی کافی تھا ۔ بخلاف اس کے فارس و شام میں نہایت دقیق بحثیں پیدا ہو گئیں ۔ جو وسعت تمدن اور ترقیٔ خیالات کے لحاظ سے ضرور پیدا ہونی چاہئیں تھیں ۔ تنزیہ و تشبیہ صفات کی عینیت و غیریت حدوث و قدم غرض اس قسم کے بہت سے مضامین نکل آئے جن کو بحث و تدقیق کی وسعت نے مستقل فن بنا دیا ۔ رفتہ رفتہ عام اعتقادی مسائل میں بھی موشگافیاں شروع ہو گئیں ۔ اور رایوں کے اختلافات سے مختلف فرقے بنتے گئے ۔ جو قدری ۔ مرجی معتزلی جہمی ۔ خارجی ۔ رافضی کہلائے ۔ یہ فتنہ یہانتک بڑھا کہ اہل حق جو اب تک ان بحثوں سے الگ تھے انکو بھی مخالفت کی ضرورت سے اس طرف متوجہ ہونا پڑا ۔ اس طرح علم کلام پیدا ہو گیا ۔ جس کو تدوین و ترتیب کی وسعت نے اس رتبہ کو پہنچایا کہ بڑے بڑے ائمہ مذہب (مثلاً امام اشعری و ابو المنصور ماتریدی) کا مایۂ ناز ٹھیرا ۔

علم کلام زمانہ مابعد میں اگرچہ مدون و مرتب ہو کر اکتسابی علوم میں داخل ہو گیا لیکن اسوقت تک اس کی تحصیل کے لئے صرف قدرتی ذہانت اور مذہبی معلومات درکار تھیں قدرت نے امام ابو حنیفہ میں یہ تمام باتیں جمع کر دی تھیں ۔ رگوں میں ایرانی خون اور طبیعت میں زور اور جدت تھی ۔ مذہبی روایتیں اور مسائل کوفہ میں ایسے عام تھے کہ ایک معمولی شخص بھی تعلیم پائے لوگوں میں اُٹھ بیٹھکر حاصل کر سکتا تھا ۔ امام ابو حنیفہ نے اس فن میں یہ کمال پیدا کیا کہ بڑے بڑے اساتذۂ فن بحث کرنے میں ان سے جی چُراتے تھے ۔ تجارت کی ضرورت سے اکثر بصرہ جانا ہوتا تھا جو ان تمام فرقوں کا دنگل اور خاصکر خارجیوں کا مرکز تھا ۔ اباضیہ ۔ صفریہ حشویہ وغیرہ سے اکثر بحثیں کیں اور ہمیشہ غالب رہے ۔ اگرچہ آخر ان جھگڑوں کو چھوڑ کر وہ علم فقہ پر مائل ہوئے اور تمام عمر اس کی نذر کر دی ۔ لیکن اخیر تک یہ مذاق طبیعت سے نہ گیا ۔ خارجیوں وغیرہ سے اُنکے مناظرے علم کلام کی جان ہیں اُن کی علمی زندگی کے تذکرہ میں ہم بعض واقعات کی تفصیل بیان کرینگے ۔

شروع شروع میں تو امام صاحب اس فن کے بہت دلدادہ رہے لیکن جسقدر عمر اور تجربہ

بڑھتا جاتا تھا ان کی طبیعت رکتی جاتی تھی۔ خود اُن کا بیان ہے کہ "آغاز عمر میں میں اس علم کو سب سے افضل جانتا تھا کیونکہ مجھکو یقین تھا کہ عقیدہ و مذہب کی بنیاد انہیں باتوں پر ہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ صحابہ کبار ان بحثوں سے ہمیشہ الگ رہے۔ حالانکہ ان باتوں کی حقیقت اُن سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا۔ اُن کی توجہ جسقدر تھی فقہی مسائل پر تھی اور یہی مسائل وہ دوسروں کو تعلیم دیتے تھے۔ ساتھ ہی خیال گزرا کہ جو لوگ علم کلام میں مصروف ہیں ان کا طرزِ عمل کیا ہے۔ اس خیال سے اور بھی بیدلی پیدا ہوئی۔ کیونکہ ان لوگوں میں وہ اخلاقی پاکیزگی اور روحانی اوصاف نہ تھے جو اگلے بزرگوں کا تمغائے امتیاز تھا۔ اسی زمانہ میں ایک دن ایک عورت نے آکر یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو سنت کے طریقے پر طلاق دینی چاہتا ہے۔ کیونکر دے۔ خود تو بتا نہ سکا عورت کو ہدایت کی کہ امام حماد جن کا حلقۂ درس یہاں سے قریب ہے جا کر پوچھے۔ یہ بھی کہدیا کہ حماد جو کچھ بتائیں مجھسے کہتی جانا تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی اور کہا کہ حماد نے یہ جواب دیا۔ مجھ کو سخت عبرت ہوئی اسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا اور حماد کے حلقۂ درس میں جا بیٹھا"[1]

حماد کی شاگردی

امام کی ابتدائی تحصیل کے متعلق ایک اور روایت ہے جس کا سلسلہ سند خطیب نے امام تک پہنچایا ہے۔ یعنی امام صاحب کا بیان ہے کہ "جب میں نے تحصیل علم پر توجہ کی تو بہت سے علوم پیش نظر تھے اور میں متردد تھا کہ کس کو اختیار کروں۔ سب سے پہلے کلام کا خیال آیا۔ ساتھ ہی دل میں گذرا کہ وہ کندن کا پہاڑ کھودن ہے۔ ایک مدت کی محنت اور دردسری کے بعد کمال بھی پیدا کیا تو علانیہ اظہار نہیں کر سکتے کہ لوگ الحاد کی تہمت نہ لگائیں۔ ادب۔ اور قرأت کا بجز اس کے کہ مکتب پڑھائیں اور کچھ فائدہ نہ تھا۔ شعر و شاعری میں ہجو اور جھوٹی مدح کے سوا اور کیا دھرا تھا۔ حدیث کے لیئے اولاً تو ایک مدت درکار تھی۔ اس کے علاوہ کم سنوں سے واسطہ پڑتا اور ہر وقت یہ فکر رہتی کہ لوگ جرح و تعدیل کا نشانہ نہ بنائیں۔ آخر فقہ پر نظر پڑی اور دنیا و دین کی حاجتیں اُس سے وابستہ نظر آئیں"۔ لیکن یہ روایت محض غلط ہے۔ تمام معتبر روائتیں اس کے خلاف ہیں۔ جو رہبارک امام صاحب کی طرف منسوب کیئے

[1] عقود الجمان باب سادس - ۱۲ -

ہیں ایسے جاہلانہ ریمارک ہیں کہ ایک معمولی آدمی کی طرف بھی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ اِس روایت کو صحیح مانیں تو ماننا پڑیگا کہ حدیث و کلام کی طرف امام ابو حنیفہ نے توجہ ہی نہیں کی۔ حالانکہ ان فنون میں امام ابو حنیفہ کا جو پایہ ہے اُس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تحصیل علوم کے بعد امام نے یہ خیال کیا ہو کہ کس فن کو اپنا خاص فن بنائیں اور چونکہ عام خلایق کی ضرورتیں فقہ سے وابستہ دیکھیں اُسی کو ترجیح دی۔ یہی بات طرزِ بیان کی رنگ آمیزیوں سے اس حد تک پہنچ گئی جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ روایت باایںہمہ کہ قیدِ کتابت میں آچکی تھی عقود الجمان کے مصنف نے نقل کی تو بہت سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ ابن جزلہ نے تاریخ بغداد کا جو اختصار کیا ہے ہمارے پیش نظر ہے۔ اُس میں اس روایت کا جہاں ذکر ہے ہر علم کے متعلق جو ریمارک ہیں دوسرُں کی طرف منسوب ہیں امام ابو حنیفہ کی نسبت صرف اُن کا تسلیم کرنا بیان کیا ہے۔

حمّاد کوفہ کے مشہور امام اور اُستادِ وقت تھے حضرت انسؓ سے جو رسول اللہ کے خادم خاص تھے حدیث سُنی تھی۔ اور بڑے بڑے تابعین کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوئے تھے اُس وقت کوفہ میں اُنہیں کا مدرسہ مرجعِ عام سمجھا جاتا تھا مسعر و شعبہ نے جو ائمۂ فن خیال کئے گئے ہیں اُنہیں کے حلقۂ درس میں تعلیم پائی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (صحابی) سے فقہ کا جو سلسلہ چلا آتا تھا اُس کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا۔ ان باتوں کے ساتھ زمانہ نے بھی اُن کا ساتھ دیا تھا یعنی دولتمند اور فارغ البال تھے۔ اور اس وجہ سے نہایت اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔ ان وجوہ سے امام ابو حنیفہ نے علم فقہ پڑھنا چاہا تو اُستادی کے لئے اُنہی کو انتخاب کیا۔ اُس وقت درس کا طریقہ یہ تھا کہ اُستاد کسی خاص مسئلہ پر زبانی گفتگو کرتا تھا جس کو شاگرد یاد کر لیتے۔ اور کبھی لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ پہلے دن بائیں صف میں بیٹھے کیونکہ مبتدیوں کیلئے یہ امتیاز عموماً قایم رکھا جاتا تھا لیکن چند روز کے بعد جب حمّاد کو تجربہ ہو گیا کہ تمام حلقہ میں ایک شخص بھی حافظہ اور ذہانت میں اُن کا ہمسر نہیں ہے تو حکم دیدیا کہ ابو حنیفہ سب سے آگے بیٹھا کریں[1]۔

[1] عقود الجمان باب سادس۔۱۲

امام نے اگرچہ اسی زمانہ میں حدیث پڑھنی شروع کردی تھی جس کا تفصیلی بیان آگے آتا ہے تاہم حماد کے حلقۂ درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے رہے۔ خود اُن کا بیان ہے کہ "میں دس برس تک حماد کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتا رہا پھر خیال ہوا کہ اب خود درس و تعلیم کا سلسلہ قائم کروں لیکن اُستاد کا ادب مانع ہوتا تھا۔ اتفاق سے انہیں دنوں حماد کا ایک رشتہ دار جو بصرہ میں رہا کرتا تھا مرگیا۔ حماد کے سوا اور کوئی اُس کا وارث نہ تھا اس ضرورت سے اُن کو بصرہ جانا پڑا۔ چونکہ مجھکو اپنا جانشین کر گئے تھے تلامذہ اور ارباب حاجت نے میری طرف رجوع کیا۔ بہت سے ایسے مسئلے پیش آئے جن میں اُستاد سے میں نے کوئی روایت نہیں سُنی تھی۔ اِس لئے اپنے اجتہاد سے جواب دیئے۔ اور احتیاط کے لئے ایک یادداشت لکھتا گیا۔ دو مہینے کے بعد حماد بصرہ سے واپس آئے میں نے وہ یادداشت پیش کی۔ کل ساٹھ مسئلے تھے۔ ان میں سے بیس میں غلطیاں نکالیں باقی کی نسبت فرمایا کہ تمہارے جواب صحیح ہیں۔ میں نے عہد کیا کہ حماد جب تک زندہ ہیں اُن کی شاگردی کا تعلق کبھی نہ چھوڑونگا۔

حماد نے سنہ ۱۲۰ھ میں انتقال کیا۔ امام ابو حنیفہ نے اگرچہ حماد کے سوا اور بزرگوں کی خدمت میں بھی فقہ کی تحصیل کی لیکن کچھ شبہہ نہیں کہ اس فن خاص میں وہ حماد ہی کے تربیت یافتہ ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ اُن کی تعظیم کرتے تھے۔

حدیث کی تحصیل

حماد کے زمانہ میں ہی امام نے حدیث کی طرف توجہ کی کیونکہ مسائل فقہ کی مجتہدانہ تحقیق جو امام کو مطلوب تھی حدیث کی تکمیل کے بغیر ممکن نہ تھی۔

اُسوقت تمام ممالک اسلامیہ میں بڑے زور شور سے حدیث کا درس جاری تھا اور ہر جگہ سند اور روایت کے دفتر کھلے ہوئے تھے۔ صحابہ جن کی تعداد کم از کم دس ہزار ہے تمام ممالک میں پہنچ گئے تھے۔ اور ان کی وجہ سے اسناد و روایت کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ لوگ جہاں کسی صحابی کا نام سُن پاتے تھے ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے تھے کہ چلکر رسول اللہ کے حالات سنیں۔ یا مسائل شرعیہ کی تحقیق کریں۔ اسطرح تابعین کا جو صحابہ کے شاگرد کہلاتے تھے بیشمار گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جن کے سلسلے تمام ممالک اسلامیہ

میں پھیل گئے تھے۔ جن شہروں میں صحابہ یا تابعین کا زیادہ مجمع تھا وہ دار العلم کے لقب سے ممتاز تھے۔ ان میں مکہ معظمہ مدینہ منورہ یمن۔ بصرہ۔ کوفہ کو خاص امتیاز تھا۔ کیونکہ اسلامی آثار کے لحاظ سے کوئی شہر ان مقامات کا ہمسر نہ تھا۔

کوفہ

کوفہ جو امام ابو حنیفہ کا مولد و مسکن تھا اسلام کی وسعت و تمدن کا گویا دیباچہ تھا۔ اہل عرب کی روز افزوں ترقی کے لئے عرب کی مختصر آبادی کافی نہ تھی۔ اس ضرورت سے حضرت عمرؓ نے سعد بن ابی وقاص کو جو اُسوقت حکومت کسریٰ کا خاتمہ کر کے مداین میں اقامت گزیں تھے خط لکھا کہ "مسلمانوں کے لئے ایک شہر بساؤ جو اُنکا دار الہجرۃ اور قرار گاہ ہو" سعد نے کوفہ کی زمین پسند کی سنہ ۱۷ھ میں اُس کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا۔ اور معمولی سادہ وضع کی عمارتیں طیار ہوئیں۔ اُسی وقت عرب کے قبائل ہر طرف سے آ آکر آباد ہونے شروع ہوئے۔ یہانتک کہ تھوڑے دنوں میں وہ عرب کا ایک خطہ بن گیا۔ حضرت عمرؓ نے یمن کے بارہ ہزار اور نزار کے آٹھ ہزار آدمیوں کے لئے جو وہاں جا کر آباد ہوئے تھے روزینے مقرر کر دیئے۔ چند روز میں جمعیت کے اعتبار سے کوفہ نے وہ حالت پیدا کی کہ جناب فاروق کوفہ کو "رمح اللہ" "کنز الایمان" "جمجمۃ العرب" یعنی خدا کا علم۔ ایمان کا خزانہ۔ عرب کا سر۔ فرمایا کرتے تھے۔ اور خط لکھتے تو اس عنوان سے لکھتے تھے "الی راس الاسلام" "الی راس العرب" حضرت علیؓ نے اس شہر کو دار الخلافہ قرار دیا۔ صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس شخص جن میں چوبیس وہ بزرگ تھے جو غزوہ بدر میں رسول اللہ کے ہمرکاب رہے تھے وہاں گئے اور بہتوں نے سکونت اختیار کر لی۔ ان بزرگوں کی بدولت ہر جگہ حدیث و روایت کے چرچے پھیل گئے تھے۔ اور کوفہ کا ایک ایک گھر حدیث و روایت کا درس گاہ بن گیا تھا[۱]۔

بصرہ بھی اُسی مقدس خلیفہ کے حکم سے آباد ہوا تھا۔ اور وسعت علم اور اشاعت حدیث کے اعتبار سے کوفہ کا ہمسر تھا۔ یہ دونوں شہر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی طرح علوم اسلامی کے دار العلم خیال کئے جاتے تھے۔ علامہ ذہبی نے اسلام کی دوسرے تیسرے دور میں جن لوگوں کو حاملین حدیث کا لقب دیا ہے اور اُن کے مستقل ترجمے لکھے ہیں اُن میں

[۱] یہ تمام تفصیل فتوح البلدان بلاذری ذکر آبادی کوفہ۔ و معجم البلدان و فتح المغیث صفحہ ۳۸۲ میں مذکور ہے ۱۲

اکثر مثلاً مسروق بن الاجدع۔ عبیدہ بن عمر۔ اسود بن یزید۔ ابو عمر النخعی۔ زر بن حبیش۔ ربیع بن خثیم۔ عبد الرحمن بن ابی لیلی۔ ابو عبد الرحمن السلمی۔ شریح بن الحرث۔ شریح بن ہانی۔ ابو وایل شقیق بن سلمہ۔ قیس بن ابی حازم۔ محمد بن سیرین۔ حسن بصری۔ شعبۃ بن حجاج۔ قتادہ بن عامہ انہیں دونوں شہروں کے رہنے والے یا خوشباش تھے۔ سفیان بن عیینہ جو ائمہ حدیث میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اکثر فرماتے تھے کہ "مناسک کے لئے مکہ۔ قرأت کے لئے مدینہ۔ اور حلال و حرام یعنی فقہ کے لئے کوفہ ہے[۱]"۔

فقہ میں امام نے زیادہ تر حماد کا حلقۂ درس کافی سمجھا تھا۔ لیکن حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی۔ یہاں صرف ذہانت اور اجتہاد سے کام نہیں چل سکتا تھا بلکہ درایت کے ساتھ روایت کی بھی ضرورت تھی۔ حدیثیں اُسوقت تک نہایت پریشان اور غیر مرتب تھیں۔ یہانتک کہ بڑے بڑے اساتذہ دو دو چار چار سو حدیثوں سے زیادہ یاد نہیں رکھتے تھے۔ یہ تعداد ضروری مسائل کے لئے بھی کافی نہ تھی۔ اس کے علاوہ طریق روایت میں اسقدر اختلافات پیدا ہو گئے تھے کہ ایک حدیث جبتک متعدد طریقوں سے نہ معلوم ہو اُسکے مفہوم اور تعبیر کا ٹھیک ٹھیک متعین ہونا دشوار تھا۔ امام ابو حنیفہ کو حماد کی صحبت اور انکی عمر نے ان ضرورتوں سے اچھی طرح واقف کر دیا تھا۔ اس لئے نہایت سعی اور اہتمام سے حدیثوں کے بہم پہنچانے پر توجہ کی۔

تقریباً کوفہ میں کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا جسکے سامنے امام صاحب نے زانوئے شاگردی طے نہ کیا ہو۔ اور حدیثیں نہ سیکھی ہوں۔ ابو المحاسن شافعی نے جہاں اُن کے شیوخ حدیث کے نام گنائے ہیں۔ ترانوے شخصوں کی نسبت لکھا ہے کہ کوفہ کے رہنے والے یا نزیل تھے۔

امام کے شیوخ حدیث

تہذیب التہذیب و تہذیب الاسماء و تذکرۃ الحفاظ وغیرہ میں اگرچہ (جیسا کہ ان کتابوں کا عام طریقہ ہے) امام کے شیوخ کا استقصا نہیں کیا ہے۔ تاہم انہیں کتابوں کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے ایک گروہ کثیر سے روایت کی جن میں ۲۹ شخص خاص کوفہ

[۱] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی ۱۲ [۲] معجم البلدان ذکر کوفہ ۱۲

کے رہنے والے تھے اور اُن میں اکثر تابعی تھے۔ شیوخ کوفہ میں خاصکر امام شعبی۔ سلمہ بن کہیل محارب بن دثار۔ ابو اسحٰق سبیعی۔ عون بن عبداللہ۔ سماک بن حرب۔ عمرو بن مرۃ۔ منصور بن المعمر۔ اعمش۔ ابراہیم بن محمد۔ عدی بن ثابت الانصاری۔ عطا بن السائب۔ موسیٰ بن ابی عائشہ۔ علقمہ بن مرثد۔ بہت بڑے محدث اور سند و روایت کے مرجع عام تھے۔ سفیان ثوری اور امام حنبل وغیرہ کا سلسلۂ سند اکثر انہیں بزرگوں تک پہنچتا ہے۔

امام شعبیؒ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اوّل اوّل امام ابوحنیفہ کو تحصیل علم کی رغبت دلائی تھی بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کی تھیں۔ مشہور ہے کہ پانسو صحابہ کو دیکھا تھا۔ عراق۔ عرب۔ شام میں چار شخص جو اُستاد کامل تسلیم کئے جاتے تھے اِن میں ایک یہ تھے امام زہری کہا کرتے تھے کہ "عالم صرف چار ہیں۔ مدینہ میں ابن المسیب۔ بصرہ میں حسن شام میں مکحول۔ کوفہ میں شعبی"۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے اُنکو ایک بار مغازی کا درس دیتے دیکھا۔ تو فرمایا کہ واللہ یہ شخص اس فن کو مجھ سے اچھا جانتا ہے"۔ ایک مدت تک منصب قضا پر مامور رہے۔ خلفا اور اعیانِ دولت ان کا نہایت احترام کرتے تھے سنہ ۱۰۴ ہجری یا سنہ ۱۰۶ ہجری میں وفات پائی۔

سلمہ بن کہیل مشہور محدث اور تابعی تھے۔ جندب بن عبداللہ بن ابی اوفی۔ ابو الطفیل اور ان کے علاوہ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں۔ ابن سعد نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے۔ سفیان بن عیینہ (امام شافعی کے اُستاد) فرماتے تھے کہ "سلمہ بن کہیل ایک رکن ہیں ارکان میں سے۔ ابن مہدی کا قول تھا کہ کوفہ میں چار شخص سب سے زیادہ صحیح الروایت تھے منصور۔ سلمہ۔ عمرو بن مرۃ۔ ابو حصین۔

ابو اسحٰق سبیعی۔ کبار تابعین سے تھے۔ عبداللہ بن عباس۔ عبداللہ بن عمر۔ ابن زبیر۔ نعمان بن بشیر۔ زید بن ارقم۔ اور بہت سے صحابہ سے جن کے نام علامہ نووی نے تہذیب الاسماء میں بہ تفصیل لکھے ہیں۔ حدیثیں سنی تھیں۔ عجلی نے کہا ہے ۳۸ صحابہ سے اُنکو بالمشافہہ روایت ہے علی بن المدینی جو امام بخاری کے اُستاد تھے اُنکا قول ہے کہ ابو اسحٰق

۱؎ امام کے شیوخ حدیث کا حال ہم نے زیادہ تر تہذیب التہذیب و معارف ابن قتیبہ و مرآۃ الجنان یافعی سے لکھا ہے۔

کے شیوخ حدیث میں نے شمار کئے تو کم و بیش تین سو ٹھہرے۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب میں اُنکا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔

سماک بن حرب بہت بڑے تابعی اور محدث تھے۔ امام سفیان ثوری نے کہا ہے کہ سماک نے کبھی حدیث میں غلطی نہیں کی۔ خود سماک کا بیان ہے کہ میں اسّی صحابہ سے ملا ہوں۔

محارب بن دثار نے عبد اللہ بن عمر اور جابر وغیرہ سے روایت کی۔ امام سفیان ثوری کہا کرتے تھے کہ میں نے کسی زاہد کو نہیں دیکھا جسکو محارب پر ترجیح دوں۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ محارب عموماً حجۃ ہیں۔ امام احمد بن معین۔ ابو ذرعہ۔ دارقطنی۔ ابو حاتم۔ یعقوب۔ بن سفیان۔ نسائی نے انکو ثقہ تسلیم کیا ہے۔ کوفہ میں منصب قضا پر مامور تھے۔ سنہ ۱۱۶ھ میں وفات کی۔

عون بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود حضرت ابو ہریرہ اور عبد اللہ بن عمر سے حدیثیں روایت کیں۔ نہایت ثقہ اور پرہیزگار تھے۔

ہشام بن عروہ معزز و مشہور تابعی تھے۔ بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً سفیان ثوری۔ امام مالک۔ سفیان بن عیینہ ان کے شاگرد تھے۔ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں کوفہ گئے۔ اہل کوفہ نے اسی زمانہ میں اُن سے حدیثیں روایت کیں۔ خلیفہ منصور انکا نہایت احترام کرتا تھا۔ ایک بار لاکھ درہم اُنکو عطا کیے اِن کے جنازہ کی نماز بھی منصور نے ہی پڑھائی تھی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے ابو حاتم نے اُنکو امام حدیث کہا ہے۔

اسلیمان بن مہران معروف باعمش۔ کوفہ کے مشہور امام تھے صحابہ میں سے انس بن مالک سے ملے تھے۔ اور عبد اللہ بن ابی اوفی سے حدیث سنی تھی۔ سفیان ثوری و شعبہ ان کے شاگرد ہیں۔ امام کی تحصیل حدیث کا دوسرا مدرسہ بصرہ تھا جو امام حسن بصری و شعبہ و قتادہ کے فیض تعلیم سے مالامال تھا۔ تعجب ہے کہ حسن بصری باوجودیکہ سنہ ۱۱۰ھ تک زندہ رہے لیکن امام ابو حنیفہ کا اُن کے درس سے مستفید ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ

قتادہ کی شاگردی کا ذکر عام محدثین نے کیا ہے۔ اور عقود الجمان کے مختلف مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نے شعبہ سے حدیث روایت کی اور انہوں نے اپنے سامنے ہی فتویٰ و روایت کی اجازت بھی دیدی تھی۔

قتادہ۔ بہت بڑے محدث اور مشہور تابعی تھے۔ حضرت انس بن مالک و عبداللہ بن سرجس و ابوالطفیل اور دیگر صحابہ سے حدیثیں روایت کیں۔ حضرت انسؓ کے دو شاگرد جو نہایت نامور ہیں اُن میں ایک یہ ہیں۔ اس خصوصیت میں اُنکو نہایت شہرت تھی کہ حدیث کو بعینہٖ ادا کرتے تھے یعنی الفاظ و معنی میں بالکل فرق نہیں ہوتا تھا۔ ان کی قوت حافظہ کی ایک عجیب مثال لکھی ہے۔ عمر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ یہ مدینہ میں سعید بن المسیب سے فقہ و حدیث پڑھتے تھے ایک دن انہوں نے فرمایا کہ "تم ہر روز بہت سی باتیں پوچھتے ہو تم کو ان میں سے کچھ یاد بھی ہیں"۔ اُنہوں نے کہا "ایک ایک حرف محفوظ ہے"۔ چنانچہ جسقدر اُن سے سُنا تھا بقید تاریخ اور دن کے بیان کرنا شروع کیا۔ وہ نہایت متعجب ہوئے۔ اور کہا "خدا نے دنیا میں تم جیسے لوگ بھی پیدا کیے ہیں"۔ اسی بنا پر لوگ اُنکو احفظ الناس کہا کرتے تھے۔ امام حنبل نے اُن کی فقہ و واقفیت اختلافات و تفسیر دانی کی نہایت مدح کی ہے۔ اور کہا ہے کہ "کوئی شخص ان باتوں میں ان کی برابر ہو تو ہو مگر ان سے بڑھکر نہیں ہو سکتا"۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے جس سے اُن کی عظمت و شان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

شعبہ بھی بڑے رتبہ کے محدث تھے۔ دو ہزار حدیثیں یاد تھیں۔ سفیان ثوری نے فن حدیث میں اُنکو امیر المومنین مانا ہے۔ عراق میں یہ پہلے شخص ہیں جس نے جرح و تعدیل کے مراتب مقرر کیے۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا رواج نہ ہوتا۔ ۱۶۰ھ میں انتقال کیا۔ سفیان ثوری کو اُن کے مرنے کی خبر پہنچی تو کہا "آج فن حدیث بھی مرگیا"۔ شعبہ کو امام ابوحنیفہ کے ساتھ ایک خاص ربط تھا۔ غیبت میں اکثر اُنکی ذہانت اور خوبی فہم کی تعریف کرتے۔ ایک بار ان کا ذکر آیا تو کہا کہ "جسطرح میں جانتا ہوں کہ آفتاب روشن ہے اسی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم اور ابوحنیفہ ہم نشین ہیں"۔ یحییٰ ابن

معین سے جو امام بخاری کے اُستاد تھے کسی نے پوچھا کہ آپ ابوحنیفہ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ فرمایا "اسقدر کافی ہے کہ شعبہ نے اُنکو حدیث و روایت کی اجازت دی اور شعبہ آخر شعبہ ہی ہیں"[1] بصرہ کے اور شیوخ جن سے امام ابوحنیفہ نے حدیثیں روایت کیں اُن میں عبدالکریم بن امیۃ اور عاصم بن سلیمان الاحول زیادہ ممتاز ہیں۔

حرمین کا سفر

امام ابوحنیفہ کو اگرچہ ان درسگاہوں سے حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تاہم تکمیل کی سند حاصل کرنے کیلیے حرمین جانا ضرور تھا۔ جو علوم مذہبی کے اصلی مرکز تھے۔ تاریخوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ امام کا پہلا سفر کس سنہ میں واقع ہوا تاہم ظن غالب ہے کہ جب اُنہوں نے حرمین کا سفر کیا تو تحصیل کا آغاز تھا۔ مورخ ابن خلکان نے لکھا ہے[2] کہ وکیع نے خود امام ابوحنیفہ سے روایت کی ہے کہ حج میں ایک حجام نے جس سے میں نے بال منڈوائے تھے کئی باتوں میں مجھ پر گرفت کی۔ میں نے اُجرت پوچھی تو بولا "مناسک چکائے نہیں جاتے"۔ میں چپ ہوکر اصلاح بنوانے لگا۔ اُسنے پھر ٹوکا کہ "حج میں چپ نہیں رہنا چاہیئے۔ تکبیر کہے جاؤ"۔ حجامت سے فارغ ہوکر گھر چلا تو اُسنے کہا "پہلے دو رکعت نماز پڑھ لو پھر کہیں جانا۔ میںنے متعجب ہوکر پوچھا کہ "یہ مسائل تم نے کہاں سیکھے" بولا "عطا بن ابی رباح کا فیض ہے"۔ اِس واقعہ سے زیادہ تر یہی قیاس ہوسکتا ہے کہ ابتدائی زمانہ تھا۔

عطا بن ابی رباح

جس زمانہ میں امام ابوحنیفہ مکہ معظمہ پہنچے درس و تدریس کا نہایت زور تھا۔ متعدد اساتذہ کی جو فن حدیث میں کمال رکھتے تھے اور اکثر صحابہ کی خدمت سے مستفید ہوئے تھے الگ الگ درسگاہ قائم تھے۔ ان میں عطا بن ابی رباح کا حلقہ سب سے زیادہ وسیع اور مستند تھا۔ عطا مشہور تابعی تھے اکثر صحابہ کی خدمت میں رہے تھے اور اُن کی فیض صحبت سے اجتہاد کا رتبہ حاصل کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس۔ ابن عمر۔ ابن زبیر۔ اسامہ بن زید۔ جابر بن عبداللہ۔ زید بن ارقم۔ عبداللہ بن سائب عقیل۔ رافع ابو درداء۔ ابوہریرہ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں سنیں تھیں۔ خود اُنکا بیان ہے کہ میں دوسو بزرگوں سے ملا ہوں جنکو رسول اللہ کی صحبت کا شرف حاصل تھا۔ مجتہدین صحابہ اُنکے علم و فضل کے معترف

[1] عقود الجمان باب دہم ۔۱۲ [2] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عطا بن ابی رباح ۱۲۔

تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ جو حضرت فاروقؓ کے فرزند رشید اور صاحب افتا تھے اکثر فرماتے تھے کہ "عطا بن رباح کے ہوتے لوگ میرے پاس کیوں آتے ہیں"۔ حج کے زمانہ میں ہمیشہ سلطنت کی طرف سے ایک منادی مقرر ہوتا تھا کہ "عطا کے سوا کوئی شخص فتوے دینے کا مجاز نہیں ہے"[1]۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً اوزاعی۔ زہری۔ عمرو بن دینار انہیں کے حلقہ درس سے نکلکر استاد کہلائے۔

امام ابوحنیفہ استفادہ کی غرض سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے احتیاط کے لحاظ سے عقیدہ پوچھا۔ امام نے کہا "میں اسلاف کو برا نہیں کہتا۔ گنہگار کو کافر نہیں سمجھتا قضا و قدر کا قائل ہوں"۔ عطا نے اجازت دی کہ حلقہ درس میں شریک ہوا کریں[2] روز بروز اُن کی ذہانت و طباعی کے جوہر ظاہر ہوتے گئے اور اس کے ساتھ اُستاد کی نظر میں ان کا وقار بھی بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب یہ حلقہ درس میں جاتے تو عطا اوروں کو ہٹاکر ان کو اپنے پہلو میں جگہ دیتے[3]۔ عطا ۱۱۵ھ تک زندہ رہے۔ اس مدت میں امام ابوحنیفہ کو جب مکہ جانیکا اتفاق ہوتا تو اُن کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور مستفید ہوتے۔

عکرمہ

عطا کے سوا مکہ معظمہ کے اور محدثین جن سے امام نے حدیث کی سند لی اُن میں سے عکرمہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ عکرمہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے غلام اور شاگرد تھے۔ اُنہوں نے نہایت توجہ اور کوشش سے انکی تعلیم و تربیت کی تھی یہانتک کہ اپنی زندگی ہی میں اجتہاد و فتوے کا مجاز کر دیا تھا۔ عکرمہ نے اور بہت سے صحابہ مثلاً حضرت علیؓ۔ ابوہریرہؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ۔ عقبہ بن عمرؓ۔ صفوانؓ۔ جابرؓ۔ ابو قتادہؓ سے حدیثیں سیکھی تھیں اور فقہی مسائل تحقیق کیے تھے۔ کم و بیش ستر مشہور تابعین حدیث و تفسیر میں ان کے شاگرد ہیں۔ امام شعبی کہا کرتے تھے کہ قرآن کا جاننے والا عکرمہ سے بڑھکر نہیں رہا۔ سعید بن جبیر کہ تابعین کے سردار تھے اُن سے ایک شخص نے پوچھا کہ دنیا میں آپ سے بڑھکر بھی کوئی عالم ہے۔ فرمایا ہاں عکرمہ۔

---

[1] ابن خلکان اور کتب رجال میں اُنکے حالات پڑھو۔ ۱۲ [2] مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ ۱۲ [3] عقود الجمان۔ باب حاشیہ ۱۲

فقہاے سبعہ

اسی زمانہ میں یعنی ۱۲۰ھ سے پہلے۔ امام ابو حنیفہ نے مدینہ کا قصد کیا کہ حدیث کا مخزن اور نبوت کا اخیر قرار گاہ تھا۔ صحابہ کے بعد تابعین کے گروہ میں سے سات شخص علم فقہ وحدیث کے مرجع بنگئے تھے اور مسایل شرعیہ میں عموماً اُن کی طرف رجوع کیا جاتا تھا ان لوگوں نے بڑے بڑے صحابہ کے دامن فیض میں تعلیم پائی تھی اور یہ مرتبہ حاصل کیا تھا کہ تمام ممالک اسلامی میں واسطہ در واسطہ اُن کے درس کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ ہمعصر تھے اور ایک مشترک مجلس افتا کے ذریعہ سے تمام شرعی مسائل کا فیصلہ کرتے تھے مدینہ کی فقہ جس کی تدوین امام مالک نے کی اُس کی بنیاد زیادہ تر انہیں کے فتووں پر ہے امام ابو حنیفہ جب مدینہ میں پہنچے تو ان بزرگوں میں سے صرف دو شخص زندہ تھے۔ سلیمان وسالم بن عبد اللہ۔ سلیمان حضرت میمونہ کے جو رسول اللہ ؐ کی ازواج مطہرات میں سے تھیں غلام تھے۔ اور فقہائے سبعہ میں فضل وکمال کے لحاظ سے اُن کا دوسرا نمبر تھا۔ سالم حضرت فاروق کے پوتے تھے اور اپنے والد بزرگوار سے تعلیم پائی تھی۔ امام ابو حنیفہ دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے حدیثیں روایت کیں۔

امام ابو حنیفہ کی طالب علمی کی مسافت اگرچہ مدینہ تک محدود ہے تاہم تعلم کا سلسلہ اخیر زندگی تک قایم رہا۔ اکثر حرمین جاتے اور مہینوں قیام کرتے۔ حج کی تقریب میں ممالک اسلامی کے ہر گوشہ سے بڑے بڑے اہل کمال مکہ میں آکر جمع ہوجاتے تھے جن کا مقصد حج کے ساتھ افادہ اور استفادہ بھی ہوتا تھا۔ امام صاحب اکثر اُن لوگوں سے ملتے اور مستفید ہوتے۔ امام اوزاعی اور مکحول شامی کہ شام کے امام المذہب کہلاتے تھے امام ابو حنیفہ نے مکہ ہی میں ان لوگوں سے تعارف حاصل کیا۔ اور حدیث کی سند لی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ امام صاحب کی ذہانت اور اجتہاد کی شہرت دور دور پہنچ گئی تھی۔ یہانتک کہ ظاہر بینوں نے اُنکو قیاس مشہور کر دیا تھا۔

اوزاعی

انہیں دنوں میں عبد اللہ بن مبارک نے جو امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں بیروت کا سفر کیا کہ امام اوزاعی سے فن حدیث کی تکمیل کریں۔ پہلی ہی ملاقات میں اوزاعی نے اُنسے

لہ فتح المغیث صفحہ ۳۹۹۔

پوچھا کہ "کوفہ میں ابوحنیفہ کون شخص پیدا ہوا ہے جو دین میں نئی باتیں نکالتا ہے" اُنھوں نے کچھ جواب نہ دیا اور گھر چلے آئے۔ دو تین دن کے بعد پھر گئے تو کچھ اجزا ساتھ لیتے گئے۔ اوزاعی نے اُن کے ہاتھ سے وہ اجزا لے لئے سرنامہ پر لکھا تھا "قال نعمان بن ثابت"۔ دیر تک غور سے دیکھا کئے پھر عبداللہ سے پوچھا نعمان کون بزرگ ہیں اُنھوں نے کہا عُراق کے ایک شیخ ہیں جن کی صحبت میں میں رہا ہوں"۔ فرمایا بڑے پایہ کا شخص ہے۔ عبداللہ نے عرض کی یہ وہی ابوحنیفہ ہیں جنکو آپ مبتدع بناتے تھے۔ اوزاعی کو اپنی غلطی پر افسوس ہوا حج کی تقریب سے مکہ گئے تو امام ابوحنیفہ سے ملاقات ہوئی انہیں مسائل کا ذکر آیا۔ اتفاق سے عبداللہ بن المبارک بھی موجود تھے اُن کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس خوبی سے تقریر کی کہ اوزاعی حیران رہ گئے۔ امام ابوحنیفہ کے جانے کے بعد مجھ سے کہا کہ "اس شخص کے کمال نے اس کو لوگوں کا محسود بنا دیا ہے۔ بے شبہہ میری بدگمانی غلط تھی جس کا میں افسوس کرتا ہوں۔

تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام ابوحنیفہ نے فن حدیث میں امام اوزاعی کی شاگردی کی ہے۔ غالباً یہی زمانہ ہوگا۔

امام باقر علیہ السلام کی شاگردی

حضرت امام باقر علیہ السلام کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ امام ابوحنیفہ دوسری بار مدینہ گئے تو امام موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ایک ساتھی نے پہچنوایا کہ یہ ابوحنیفہ ہیں۔ اُنھوں نے ابوحنیفہ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ "ہاں تمہیں قیاس کی بنا پر ہمارے دادا کی حدیثوں سے مخالفت کرتے ہو" اُنھوں نے نہایت ادب سے کہا "معاذ اللہ حدیث کی کون مخالفت کرسکتا ہے آپ تشریف رکھیں تو کچھ عرض کروں" پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔ (ابوحنیفہ) مرد ضعیف ہے یا عورت؟۔ (امام باقر) عورت (ابوحنیفہ) وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا؟۔ (امام باقر) مرد کا۔ (ابوحنیفہ) میں قیاس لگاتا تو کہتا کہ عورت کو زیادہ حصہ دیا جائے کیونکہ ضعیف کو ظاہر قیاس کی بنا پر زیادہ ملنا چاہئے۔ پھر پوچھا نماز افضل ہے یا روزہ؟ (امام باقر) نماز (ابوحنیفہ) اس اعتبار

---

[1] مختصر تاریخ بغداد۔

ے حائضہ عورت پر نماز کی قضا لازم ہونی چاہیئے نہ روزہ کی۔ حالانکہ میں روزہ ہی کی قضا کا فتویٰ دیتا ہوں۔ امام باقرؑ اسقدر خوش ہوئے کہ اُٹھکر اُن کی پیشانی چوم لی[۱] ابو حنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ شیعہ و سُنی دونوں نے مانا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی معلومات کا بڑا ذخیرہ حضرت ممدوح کا فیض صحبت تھا۔ امام صاحب نے اُنکے فرزند رشید حضرت جعفر صادق علیہ السلام کی فیض صحبت سے بھی بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جس کا ذکر عموماً تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ ابن تیمیہ نے اِس سے انکار کیا ہے اور اُسکی وجہ یہ خیال کی ہے کہ امام ابو حنیفہ حضرت جعفر صادق کے معاصر اور ہمسر تھے اِس لئے اُن کی شاگردی کیونکر اختیار کرتے۔ لیکن یہ ابن تیمیہ کی گستاخی اور خیرہ چشمی ہے امام ابو حنیفہ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں لیکن فضل و کمال میں اُنکو حضرت جعفر صادقؑ سے کیا نسبت؟ حدیث فقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہلبیت کے گھر سے نکلے۔ وصاحب البیت ادری بما فیہا

یا تو وہ زمانہ تھا کہ امام ابو حنیفہ نے ایک طالب العلم کی حیثیت سے حرمین کا سفر کیا تھا یا اب یہ نوبت پہنچی کہ سفر کا قصد کرتے تو تمام اطراف میں شہرہ ہو جاتا کہ فقیہ عراق عرب کو جا رہا ہے۔ جس شہر یا گاؤں میں گذر ہوتا ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہو جاتا۔ ایک دفعہ مکہ معظمہ گئے تو لوگوں کی یہ کثرت ہوئی کہ مجلس میں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ ارباب حدیث و فقہ دونوں فرقے کے لوگ تھے اور شوق کا یہ عالم تھا کہ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ آخر امام صاحب نے تنگ آکر فرمایا "کاش ہمارے میزبان سے کوئی جا کر کہتا کہ اس ہجوم کا انتظام کرتے"۔ ابو عاصم نبیل حاضر تھے عرض کی کہ میں جاتا ہوں لیکن چند مسئلے دریافت کرنے رہ گئے ہیں۔ امام نے پاس بُلا لیا۔ اور زیادہ توجہ کے ساتھ اُن کی باتیں سنیں۔ اس میں میزبان کا خیال جاتا رہا۔ ابو عاصم سے فارغ ہو کر ایک اور طالب علم کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر وہی سلسلہ قائم ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خیال آیا تو فرمایا کسی شخص نے میزبان کے پاس جانیکا

[۱] عقود الجمان باب شانزدہم ۱۲

اقرار کیا تھا وہ کہاں گیا۔ ابو عاصم بولے میں نے عرض کیا تھا۔ فرمایا پھر تم گئے نہیں؟ ابو عاصم نے مناظرانہ شوخی سے کہا "میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ابھی جاتا ہوں۔ جب فرصت ہوگی جاؤنگا"

امام نے فرمایا "عام بول چال میں ان احتمالات کا موقع نہیں۔ ان لفظوں کے معنے ہمیشہ وہی لئے جائینگے جو عوام کی غرض ہوتی ہے"۔ ایک اعتبار سے یہ بھی ایک فقہی مسئلہ تھا جو امام صاحب نے باتوں باتوں میں حل کر دیا۔

امام صاحب کے اساتذہ اُن کا اسقدر ادب و احترام کرتے تھے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا محمد بن الفضل کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام ابو حنیفہ ایک حدیث کی تحقیق کے لئے خصیب کے پاس گئے۔ میں بھی ساتھ تھا خصیب نے اِن کو آتے دیکھا تو اُٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت تعظیم کے ساتھ لاکر اپنے برابر بٹھایا۔ امام صاحب نے پوچھا کہ "بیضہ نعام کے بارہ میں کیا حدیث آئی ہے"! خصیب نے کہا "اخبرنی ابو عبیدۃ عن عبد اللہ بن مسعود فی بیضۃ النعام یصیبھا المحرم ان فیہ قیمتہ"۔ عمر بن دینار جو مکہ کے مشہور محدث تھے ابو حنیفہ کے ہوتے حلقۂ درس میں اور کسی کی طرف خطاب نہیں کرتے تھے۔

امام صاحب کے اساتذہ اُن کی نہایت عزت کرتے تھے

اس عظمت کے ساتھ امام صاحب کو طلب علم میں کسی سے عار نہ تھی۔ امام مالک عمر میں ان سے تیرہ برس کم تھے اُن کے حلقۂ درس میں بھی اکثر حاضر ہوئے اور حدیثیں سنیں۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ امام مالک کے سامنے ابو حنیفہ اس طرح مودب بیٹھتے تھے جسطرح شاگرد اُستاد کے سامنے بیٹھتا ہے"۔ اسکو بعض کوتاہ بینوں نے امام کی کسر شان پر محمول کیا ہے۔ لیکن ہم اس کو علم کی قدر شناسی اور شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔ امام مالک بھی اُنکا نہایت احترام کرتے تھے۔ عبد اللہ بن المبارک کی زبانی منقول ہے کہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک بزرگ آئے جن کی اُنھوں نے نہایت تعظیم کی اور اپنی برابر بٹھایا۔ اُنکے جانے کے بعد فرمایا "جانتے ہو کون شخص تھا؟" یہ ابو حنیفہ عراقی تھے جو اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں"۔

امام کی عظمت

ؔ الجواہر المضیۃ۔ باب الکنی ترجمہ ابو عاصم النبیل ۱۲ ؔ عقود الجمان باب عاشر ۱۲

ذرا دیر کے بعد ایک اور بزرگ آئے امام مالک نے اُن کی بھی تعظیم کی لیکن نہ اسقدر جتنی ابو حنیفہ کی کی تھی۔ وہ اُٹھ گئے تو لوگوں سے کہا یہ سفیان ثوری تھے۔

تعلیم حدیث کے مختلف طریقے

حجاز و عراق کے ائمہ فن روایت کے متعلق جُدا جُدا اصول رکھتے تھے۔ طرز تعلیم بھی مختلف تھا۔ بعضوں کے نزدیک لکھنے کا زیادہ اعتبار تھا۔ بعض مثلاً ابراہیم و شعبی صرف حافظہ سند سمجھتے تھے۔ اکثروں نے اس بات کو جایز رکھا تھا کہ مطلب میں فرق نہ آئے تو روایت میں حدیث کا ایک ٹکڑا چھوڑ دیا جاسکتا ہے۔ بعض اس کے بالکل خلاف تھے ایک فریق کہتا تھا کہ راوی جب تک سامنے نہ ہو اس سے روایت نہیں کیجا سکتی۔ شعبہ جو امام صاحب کے اُستاد تھے اُن کا یہی مذہب تھا۔ دوسرا گروہ پردہ کی اوٹ سے تحریر کی بنا پر روایت کرنے کو جایز سمجھتا تھا۔ امام زہری کی عادت تھی کہ روایت کے ساتھ الفاظ و مطالب کی تفصیل بھی کرتے جاتے تھے۔ بعض لوگ اسکے سخت مخالف تھے یہانتک کہ ایک شخص نے خود زہری کو ٹوکا کہ "حدیث نبوی میں آپ اپنے الفاظ نہ ملائیں"۔ امام مالک کو یہ طریقہ زیادہ پسند تھا کہ شاگرد پڑھیں اور وہ سنتے جائیں بعض اسکے مخالف تھے۔ یحییٰ بن سلام اتنی بات پر اُن کے حلقۂ درس سے ناراض ہو کر اُٹھ آئے کہ "وہ خود نہیں پڑھتے شاگرد ان سے پڑھواتے ہیں"۔ اسی طرح اور بہت سے اختلافات تھے جن کو فتح المغیث میں تفصیل سے ذکر کیا ہے امام ابوحنیفہ کی کثرت شیوخ اور ریزہ چینیوں کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ان مختلف اصول سے آگاہ ہوں تاکہ سب کے مقابلہ سے خود ایک مستقل اور جنچی ہوئی رائے قائم کر سکیں۔ امام موصوف نے اصول سنے میں جو اصلاحیں کی ہیں اُنکا بیان آگے آئے گا۔

طریقہ تعلیم کی ترقی

امام کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُن کے آغاز تحصیل ہی میں حدیث کا طریقہ مرتب اور باقاعدہ ہو چلا تھا۔ اِس سے پہلے عموماً زبانی روایت کا رواج تھا۔ بعض ائمہ حدیث کتابت کو تقریباً ناجایز سمجھتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تقریباً سنہ ۱۰۰ھ میں اہل مدینہ کو خط لکھا جسکے یہ الفاظ تھے۔ انظروا بما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبوہ فانی خشیت دروس العلم و ذھاب العلماء یعنی "رسول اللہ کی جسقدر حدیثیں ہیں قلمبند کر لی جائیں ورنہ ضائع ہونے کا ڈر ہے"۔ اور شہروں میں بھی اس مضمون کے فرامین

بھیجے چنانچہ مدینہ میں امام زہری نے ایک مجموعہ مرتب کیا جس کی نقلیں سلطنت کی طرف سے تمام ممالک اسلامی میں شائع کی گئیں[1]۔ اُسوقت سے تدوین کا عام رواج ہو گیا اور جہاں جہاں اہل حدیث تھے اِسی طریقہ کو برتنے لگے۔ شعبی (امام ابوحنیفہ کے اُستاد) کو اگرچہ زبانی روایت پر اصرار تھا تاہم کتاب ساتھ رکھتے تھے۔

طرز تعلیم نے بھی نہایت ترقی کی۔ شیخ مجمع عام میں ایک بلند مقام پر بیٹھتا اور حدیث کا مجموعہ ہاتھ میں ہوتا۔ شاگرد دوات قلم لیکر بیٹھتے۔ اور اُستاد جو کچھ روایت کرتا اُسی کے الفاظ میں لکھتے جاتے۔ شائقین کی زیادہ کثرت ہوتی تو ایک مستملی کھڑا ہو کر وہ الفاظ دور کے بیٹھنے والوں تک پہنچاتا۔ مگر یہ التزام تھا کہ مطلب بلکہ جہاں تک ممکن ہو الفاظ میں فرق نہ آئے۔ اس ضرورت سے مستملی ہمیشہ ایسا شخص مقرر ہوتا تھا جسکا حافظہ قوی اور معلومات وسیع ہوں۔ ساتھ ہی خوش لہجہ اور بلند آواز ہو۔ چنانچہ امام شعبہ کی مجلس درس میں آدم بن ابی ایاس۔ اور امام مالک کے حلقہ میں ابن علیہ اس خدمت پر مامور تھے۔

امام کے شیوخ حدیث بہت تھے

امام ابوحنیفہ اس خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں کہ اُنکے شیوخ حدیث بیشمار تھے۔ ابوحفص کبیر نے دعوےٰ کیا ہے کہ امام نے کم از کم چار ہزار شخصوں سے حدیثیں روایت کیں اگرچہ تاریخ اسلام میں یہ کوئی عجیب بات نہیں مسلمانوں نے حدیثوں کے جمع کرنے میں جو محنتیں اور جانفشانیاں کی ہیں دنیا کی اور قومیں اُس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ ہم متعدد شخصوں کے نام بتا سکتے ہیں جن کے شیوخ حدیث چار ہزار سے کم نہ تھے۔ اور ایسے تو بہت گذرے ہیں جنکے اساتذہ ہزار سے زیادہ تھے علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں ان لوگوں کے نام بھی گنائے ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ دعوےٰ محدثانہ اصول پر ثابت نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امام نے ایک گروہ کثیر سے روایت کی ہے۔ اور اس کا خود محدثین کو اعتراف ہے علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں اُنکے شیوخ حدیث کے نام گنائے ہیں اخیر میں لکھدیا ہے "وخلق کثیر" حافظ ابوالمحاسن شافعی نے عقود الجمان میں تین سو انیس شخصوں کے نام بقید نسب لکھے ہیں۔

[1] فتح المغیث صفحہ ۲۳۹ و مقدمہ قسطلانی شرح بخاری مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۱۲۶۔

اور اخیر میں لکھدیا ہے کہ میں نے ایک دوسری کتاب میں جسکا نام تحصیل السبیل الی معرفۃ الثقات والمجاھیل ہے۔ ان لوگوں کے حالات بھی بہ تفصیل لکھے ہیں لیکن چونکہ اُن کی فہرست زیادہ تر فقہاء حنفیہ سے ماخوذ ہے ممکن ہے کہ محدثین کو کلیۃً اُس سے اتفاق نہ ہو۔

افسوس ہے کہ محدثین نے امام کے حالات میں جو کتابیں لکھیں ہیں اور جن میں اُنکے شیوخ کا پورا پورا استقصا کیا ہے ہماری نظر سے نہیں گذریں۔ رجال کی مستند کتابیں جن میں امام کا ذکر ہے ہمارے سامنے ہیں لیکن اُن میں سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کے حالات ہیں اس وجہ سے کسی خاص شخص کے متعلق پوری تفصیل نہیں مل سکتی۔ مختصر تاریخ بغداد تہذیب الکمال۔ تہذیب الاسماء واللغات۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ملخص طبقات الحفاظ۔ تہذیب التہذیب۔ انساب سمعانی۔ موطا امام محمد۔ کتاب الآثار امام محمد کے تتبع سے جسقدر اُن کے شیوخ انتخاب ہو سکتے ہیں اُنکے نام حسب ذیل ہیں۔ ان سے اکثر کے اجمالی حالات ہم اوپر لکھ آئے ہیں

عطا ابن ابی رباح مکی۔ عاصم بن ابی النجود کوفی۔ علقمہ بن مرثد کوفی۔ حکم بن عتیبہ کوفی۔ سلمہ بن کہیل کوفی۔ حضرت امام باقر علیہ السلام مدنی۔ علی بن الاقمر الکوفی۔ زیاد بن علاقہ کوفی۔ سعید بن مسروق کوفی۔ عدی بن ثابت انصاری کوفی۔ عطیہ بن سعید کوفی۔ ابو سفیان سعدی۔ عبد الکریم بن امیہ بصری۔ یحییٰ ابن سعید مدنی۔ ہشام بن عروہ مدنی۔ (از تہذیب التہذیب حافظ بن حجر عسقلانی)

شیوخ حدیث کا شمار

ابو اسحاق السبیعی کوفی۔ نافع بن عمر مدنی۔ عبد الرحمن بن ہرمز الاعرج المدنی۔ قتادہ بصری۔ عمر بن دینار المکی۔ محارب بن دثار کوفی۔ ہشیم بن حبیب الصراف کوفی۔ قیس بن مسلم کوفی۔ محمد المنکدر المدنی۔ یزید الفقیر کوفی۔ سماک بن حرب کوفی۔ عبد العزیز بن رفیع المکی۔ مکحول شامی۔ عمر بن مرۃ الکوفی۔ ابو الزبیر محمد بن مسلم مکی۔ عبد الملک بن عمر کوفی منصور بن زادان۔ منصور المعتمر۔ عطا بن السایب الثقفی۔ عطا بن ابی مسلم الخراسانی۔ عاصم بن سلیمان

سلہ ان کتابوں میں سے تہذیب الکمال میری نظر سے نہیں گذری مولوی عبد الحی صاحب مرحوم نے التعلیق المجد میں امام ابو حنیفہ کے شیوخ تہذیب الکمال کے حوالہ سے لکھے ہیں۔ میں نے اُسی کے حوالہ سے لکھا ہے۔

الاحول بصری ۔ اعمش کوفی ۔ عبداللہ بن عمر بن حفص المدنی ۔ امام اوزاعی (طبقات الحفاظ ذہبی ازمقامات مختلفہ)

ابراہیم بن محمد الکوفی ۔ اسمعیل بن عبدالملک المکی ۔ حارث بن عبدالرحمن المکی ۔ خالد بن علقمہ الوداعی ۔ ربیعۃ الرای ۔ شداد بن عبدالرحمن بصری ۔ شیبان بن عبدالرحمن بصری ۔ طاؤس بن کیسان یمنی ۔ عبداللہ بن دینار المدنی ۔ عکرمہ مولی ابن عباس مکی ۔ عون بن عبداللہ کوفی قابوس بن ابی ظبیان کوفی ۔ محمد بن السائب الکلبی کوفی ۔ محمد بن مسلم بن شہاب الزہری ۔ ابوسعید مولی ابن عباس ۔ (تہذیب الکمال)

موسی بن ابی عائشہ کوفی ۔ صلت بن بہرام ۔ عثمان بن عبداللہ بن حوشب ۔ بلال ہیثم بن ابی الہیثم ۔ حصین بن عبدالرحمن ۔ معن ۔ میمون بن سیاہ ۔ جواب التیمی ۔ سالم الافطس ۔ یحیی بن عمرو بن سلمہ ۔ عمر بن جبیر ۔ عبیداللہ بن عمر ۔ محمد بن مالک الہمدانی ۔ ابو السوار ۔ خارجہ بن عبداللہ ۔ عبداللہ بن ابی زیاد ۔ حکم بن زیاد ۔ کثیر الاصم ۔ حمید الاعرج ابو العطوف ۔ عبداللہ بن الحسن سلیمان الشیبانی ۔ سعید المرزبان ۔ عثمان بن عبداللہ ۔ ابو وجیہ ۔ (کتاب الآثار امام محمد)

ہم نے اسقدر نام سرسری طور سے انتخاب کیے ہیں زیادہ چھان بین کرتے تو شاید عقود الجمان کی فہرست کے برابر اترتے لیکن سچ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے لئے کثرت شیوخ اسقدر فخر کا باعث نہیں جتنا کہ اُن کی احتیاط اور تحقیق ہے وہ اس نکتہ سے خوب واقف تھے کہ روایت میں جسقدر واسطے زیادہ ہوتے ہیں اُسیقدر تغیر و تبدل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے یہی بات ہے کہ اُنکے اساتذہ اکثر تابعین ہیں ۔ جن کو رسول اللہ تک صرف ایک واسطہ ہے یا وہ لوگ ہیں جو مدت تک بڑے بڑے تابعین کی صحبت میں رہے تھے اور علم و فضل دیانت و پرہیزگاری کے نمونے خیال کیے جاتے تھے ۔ ان دو قسموں کے سوا اگر ہیں تو شاذ ہیں اُنکی تعلیم کا طریقہ بھی عام طالب العلموں سے الگ تھا ۔ بحث و اجتہاد کی شروع سے عادت تھی اور اس بات میں وہ اُستادوں کی مخالفت کی بھی کچھ پروا نہ کرتے تھے ایک دفعہ حماد کے ساتھ امام اعمش کی مشایعت کو نکلے ۔ چلتے چلتے مغرب کا وقت آگیا ۔ وضو کے لئے پانی کی تلاش ہوئی مگر کہیں نہ مل سکا ۔ حماد نے تیمم کا فتوےٰ دیا ۔ امام نے مخالفت کی کہ اخیر وقت تک پانی کا

انتظار کرنا چاہیے۔ اتفاق یہ کہ کچھ دور چلکر پانی مل گیا۔ اور سب نے وضو سے نماز ادا کی کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اُستاد سے مخالفت کی۔ اور غالباً یہ زمانہ تحصیل کا آغاز تھا۔

امام شعبی۔ اِن کے اُستاد قائل تھے کہ معصیت میں کفارہ نہیں۔ ایک دفعہ اُستاد و شاگرد کشتی میں سوار جارہے تھے اس مسئلہ کا ذکر آیا اُنھوں نے کہا ضرور معصیت میں کفارہ ہے کیونکہ خدا نے ظہار میں کفارہ مقرر کیا ہے۔ اور اس آیت میں وانھم لیقولون منکرا من القول وزورا تصریح کردی ہے کہ ظہار معصیت ہے۔ امام شعبی کچھ جواب نہ دیسکے خفا ہو کر فرمایا۔ اقیّاس انت۔ عطار ابن ابی رباح سے کسی نے اس آیت کے معنے پوچھے وآتیناہ اھلہ ومثلھم معھم عطانے کہا خدا نے حضرت ایوب کے آل و اولاد جو مرگئی تھی زندہ کردی اور اُنکے ساتھ اور بیٹی پیدا کردی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا جو شخص کسی کی صلب سے نہ پیدا ہوا ہو وہ اُس کی اولاد کیونکر ہو سکتا ہے۔[1]

امام کی علمی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انکو بڑے بڑے اہل کمال کی صحبتیں میسّر آئیں۔ جن شہروں میں اُن کو رہنے کا اتفاق ہوا یعنی کوفہ۔ بصرہ۔ مکہ مدینہ۔ یہ وہ مقامات تھے کہ مذہبی روایتیں وہاں کی ہوا میں سرایت کرگئی تھیں۔ علمار سے ملنے اور علمی جلسوں میں شریک ہونیکا شوق امام کے خمیر میں داخل تھا۔ ساتھ ہی اسکے ان کی شہرت اس حد تک پہنچ گئی تھی جہاں جاتے تھے۔ استفادہ۔ ملاقات۔ مناظرہ۔ کی غرض سے خود اُنکے پاس ہزاروں آدمیوں کا مجمع رہتا تھا

درس و افتا و بقیہ زندگی

اگرچہ حماد کی زندگی ہی میں امام صاحب نے اجتہاد کا رتبہ حاصل کرلیا تھا عمر بھی کچھ کم نہ تھی یعنی حماد کی وفات کے وقت کم و بیش چالیس برس کا سن تھا تاہم شاگردانہ خلوص نے یہ گوارا نہ کیا کہ اُستاد کے ہوتے ہوئے اپنا دربار الگ جمائیں۔ اگلے زمانہ میں اُستاد کے ساتھ جو محبت اور ادب آمیز تعلق ہوتا تھا آج اُسکا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ خود امام سے منقول

اُستاد کا ادب

[1] مختصر تاریخ بغداد۔ ترجمہ امام ابوحنیفہ۔ ۱۲

ہے کہ حماد جب تک زندہ رہے میں نے اُن کے مکان کی طرف کبھی پاؤں نہیں پھیلائے۔ حماد نے ۱۲۰ھ میں قضا کی۔ چونکہ ابراہیم نخعی کے بعد فقہ کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا اُن کی موت نے کوفہ کو بے چراغ کر دیا۔ حماد نے ایک لایق بیٹا چھوڑا تھا۔ لوگوں نے اُنہیں کو مسند درس پر بٹھایا۔ لیکن وہ لغت اور ادب کی طرف زیادہ مائل تھے۔ آخر موسیٰ بن کثیر نے کہ حماد کے شاگردوں میں تجربہ کار اور سن کے لحاظ سے سب سے ممتاز تھے اُن کی جگہ لی۔ وہ اگرچہ فقہ کے پورے ماہر نہ تھے لیکن اکثر بزرگوں کی صحبتیں اُٹھائی تھیں اور اس وجہ سے لوگوں پر اُن کا ایک خاص اثر تھا چند روز تک حلقۂ درس اُن کی وجہ سے قایم رہا۔ وہ حج کو چلے گئے تو تمام بزرگوں نے متفقاً امام ابو حنیفہ سے درخواست کی کہ مسند درس کو مشرف فرمائیں مختلف حالتوں کا اقتضا دیکھو! یا تو وہ زمانہ تھا کہ جوانی ہی میں اُستادی کی مسند پر بیٹھنے کی آرزو تھی یا اب اور لوگ درخواست کرتے ہیں اور اُن کو اُس کی ذمہ واریوں کے لحاظ سے انکار ہے۔ تاہم لوگوں کا اصرار غالب آیا اور چار و ناچار قبول کرنا پڑا۔ پھر بھی دل مطمئن نہ تھا۔

حافظ ابو المحاسن نے لکھا ہے کہ "انہیں دنوں میں خواب دیکھا کہ پیغمبر خدا کی قبر مبارک کھود رہے ہیں۔" ڈر کر چونک پڑے اور سمجھے کہ نا قابلیت کی طرف اشارہ ہے۔ امام بن سیرین علم تعبیر کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ اُنہوں نے تعبیر بتائی کہ اس سے ایک مردہ علم کو زندہ کرنا مقصود ہے۔ امام صاحب کو تسکین ہو گئی۔ اور اطمینان کے ساتھ درس میں مشغول ہوئے خواب کا ذکر تمام مورخوں اور محدثوں نے بھی کیا ہے۔ اِس لحاظ سے گمان غالب ہے کہ اصل واقعہ صحیح ہو۔ لیکن یہ زمانہ اور ابن سیرین کی تعبیر گوئی محض غلط ہے کیونکہ ابن سیرین اس سے بہت پہلے ۱۱۰ھ میں قضا کر چکے تھے۔ بہر حال امام صاحب نے استقلال کے ساتھ تدریس شروع کی۔ اوّل اوّل حماد کے پرانے شاگرد درس میں شریک ہوتے تھے لیکن چند روز میں وہ شہرت ہوئی کہ کوفہ کی اکثر درسگاہیں ٹوٹ کر ان کے حلقہ میں آملیں نوبت یہانتک پہنچی کہ خود اُنکے اساتذہ مثلاً مسعر بن کدام۔ امام اعمش وغیرہ اُن سے استفادہ کرتے تھے اور دوسروں کو ترغیب دلاتے تھے۔ اسپین کے سوا اسلامی دنیا کا کوئی حصہ نہ تھا جو اُن کی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو۔ جن جن مقامات کے رہنے والے اُن کی خدمت میں پہنچے اُن سب کا شمار

سلسلۂ درس کی وسعت

نہیں ہوسکتا۔ لیکن جن اضلاع و ممالک کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ مکہ۔ مدینہ دمشق۔ بصرہ۔ واسط۔ موصل۔ جزیرہ۔ رقہ۔ نصیبین۔ رملہ۔ مصر۔ یمن۔ یمامہ۔ بحرین۔ بغداد اہواز۔ کرمان۔ اصفہان۔ حلوان۔ استراباد۔ ہمدان۔ نہاوند۔ رے۔ قومس۔ دامغان۔ طبرستان۔ جرجان۔ نیشاپور۔ سرخس۔ نسا۔ بخارا۔ سمرقند۔ کس۔ صغانیان۔ ترمذ۔ ہرات۔ ہستان۔ الزام۔ خوارزم۔ سیستان۔ مداین۔ مصیصہ۔ حمص[1]۔ مختصر یہ کہ اُن کے اُستادی کے حدود خلیفۂ وقت کی حدودِ حکومت کے برابر تھے۔

رفتہ رفتہ عراق میں اُنکا ملکی اثر قایم ہوگیا۔ یہانتک کہ ملک میں جو انقلاب ہوتے تھے لوگوں کو اِن کی شرکت کا عموماً گمان ہوتا تھا۔ شاہ عبد العزیز صاحب نے تحفہ میں لکھا ہے کہ "زید بن علی نے بنوامیہ کے عہد میں جو بغاوت کی تھی امام صاحب بھی اُس میں شریک تھے۔ ناسخ و منسوخ کے مولفوں نے بھی ایسا ہی گمان کیا ہے۔ لیکن ہم اسپر یقین نہیں کرسکتے۔ جسقدر تاریخیں اور رجال کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان میں کہیں اسکا ذکر نہیں حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابل ذکر واقعہ تھا۔ زید بن علی نے ۱۲۱ھ میں بغاوت کی تھی اُسوقت ہشام بن عبد الملک تخت خلافت پر متمکن تھا۔ ہشام اگرچہ کفایت شعار اور بعض امور میں نہایت جزرس تھا لیکن اُس کی سلطنت نہایت امن و امان کی سلطنت تھی۔ ملک میں ہر طرف امن و امان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ رعایا عموماً رضامند تھی۔ بیت المال میں ناجایز آمدنیاں نہیں داخل ہوسکتی تھیں اس حالت میں امام ابوحنیفہ کو مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ زید بن علی سادات میں ایک صاحب ادعا شخص تھے۔ بے شبہ اُنکو بغاوت کرنی ضرور تھی۔ کیونکہ (بخیال اُنکے) خلافت اُنکا خاص حق تھا۔ غالباً اس غلط فہمی کا منشا یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا خاندان اہلبیت کے ساتھ ایک خاص ارادت رکھتا تھا۔ امام صاحب نے ایک مدت تک امام باقرؑ کے دامن فیض میں تربیت پائی تھی کوفہ کی ہوا میں ایک مدت تک شیعہ پن کا اثر تھا۔ ان اتفاقی واقعات نے امام ابوحنیفہ کی نسبت یہ گمان پیدا کردیا۔ ورنہ تاریخی شہادتیں بالکل اسکے خلاف ہیں۔

زید بن علی کے خروج میں امام صاحب شریک نہ تھے

ہشام نے ۱۲۵ھ میں وفات کی اُسکے بعد ولید بن یزید یزید الناقص۔ ابراہیم

[1] عقود الجمان باب عاشر ۱۲

بن الولید۔ مروان الحمار یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ عباسی خلافت کی سلسلہ جنبانی جو ایک مدت سے ہو رہی تھی مروان کے عہد میں نہایت قوت پکڑ گئی۔ ابومسلم خراسانی نے تمام ملک میں سازشوں کا جال پھیلا دیا اور مروانی حکومت کی جڑ ہلا دی۔ چونکہ زیادہ تر فساد کا مرکز عراق اور عراق میں بھی خاص کوفہ تھا۔ مروان نے یزید بن عمر بن ہبیرہ کو وہاں کا گورنر مقرر کیا جو نہایت مدبر۔ دلیر۔ فیاض۔ خاندانی اور صاحب اثر شخص تھا۔ یزید نے حکومت مروانی کی ترکیب کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کل میں اور سب کچھ ہے لیکن مذہبی پرزے نہیں ہیں اس بنا پر اُس نے چاہا کہ ایوان حکومت مذہبی ستونوں پر قائم کیا جائے عراق کے تمام فقہا کو جن میں قاضی ابن ابی لیلیٰ ابن شبرمہ۔ داؤد بن ہند بھی شامل تھے۔ بلا کر بڑی بڑی ملکی خدمتیں دیں۔ امام صاحب کو میر منشی اور افسر خزانہ مقرر کرنا چاہا۔ اُنہوں نے صاف انکار کیا۔ یزید نے قسم کھا کر کہا کہ جبراً منظور کرنا ہوگا۔ ان کے ہم صحبت بزرگوں نے بھی سمجھایا مگر یہ اپنے انکار پر قائم رہے۔ اور کہا کہ اگر یزید کہے کہ "مسجد کے دروازے گن دو تو بھی مجھکو گوارا نہیں۔ نہ کہ وہ کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اُس پر مہر کروں"۔ یزید نے غصہ میں آکر حکم دیا کہ ہر روز ان کو دس درّے لگائے جائیں۔ اس ظالمانہ حکم کی تعمیل ہوئی تاہم وہ اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر یزید نے چھوڑ دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اُسی وقت مکہ معظمہ روانہ ہوئے اور سنہ ۱۳۰ھ کی اخیر تک وہیں رہے۔ ابن قتیبہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ "یہ جھگڑا قضا کے قبول کرنے پر تھا۔ ممکن ہے کہ یہ عہدہ بھی اُن کے لئے تجویز ہوا ہو۔ اور اُنہوں نے اس سے بھی انکار کیا ہو۔

قبول خدمت سے انکار

سنہ ۱۳۲ھ میں سلطنت اسلام نے دوسرا پہلو بدلا یعنی بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور آل عباس تاج و تخت کے مالک ہوئے۔ اس خاندان کا پہلا فرمانروا ابو العباس سفاح تھا۔ اُس نے چار برس کی حکومت کے بعد سنہ ۱۳۶ھ میں قضا کی۔ سفاح کے بعد اُس کا بھائی منصور تخت نشین ہوا۔ عباسیوں نے گو اموی خاندان کو بالکل تباہ کر دیا۔ یہاں تک کہ خلفائے بنو امیہ کی قبریں اکھڑوا کر اُنکی ہڈیاں تک جلا دیں۔ تاہم چونکہ نئی نئی سلطنت تھی اور انتظام کا سکہ نہیں بیٹھا تھا جا بجا

۱؎ عقود الجمان باب بست و یکم ۱۲

بغاوتیں اٹھیں۔ ان فتنوں کے فرو کرنے میں سفاح و منصور اعتدال کی حد سے بہت دور نکل گئے۔ اور وہ زیادتیاں کیں کہ مروانی حکومت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ تمام ملک کی آنکھیں ان نئے جانشینوں پر لگی تھیں۔ لیکن ان خونریزیوں نے سب کے دل افسردہ کر دئے چنانچہ ایک موقع پر منصور نے عبدالرحمن سے جو اس کا بچپن کا یار تھا پوچھا کہ "ہماری سلطنت کو مروان کی سلطنت سے کیا نسبت ہے؟"۔ اُسنے کہا میرے نزدیک تو کچھ فرق نہیں"۔ منصور نے کہا "کیا کروں کام کے آدمی نہیں ملتے" عبدالرحمن نے کہا " بازار میں جس جنس کی زیادہ مانگ ہوتی ہے کثرت بھی اُسی کی ہوتی ہے۔

سفاح و منصور کی سفاکیاں

اور بے رحمیاں تو تھیں ہیں منصور نے یہ ستم کیا کہ سادات کی خانہ بربادی شروع کی ان میں شبہہ نہیں کہ سادات ایک مدت سے خلافت کا خیال پکا رہی تھی اور ایک لحاظ سے اُن کا حق بھی تھا۔ تاہم سفاح کی وفات تک اُن کی کوئی سازش ظاہر نہ ہوئی تھی۔ صرف بدگمانی پر منصور نے سادات اور علویین کی بیخ کنی شروع کی۔ جو لوگ اُن میں ممتاز تھے اُنکے ساتھ زیادہ بیرحمیاں کیں۔ محمد بن ابراہیم کہ حسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھے اور اس وجہ سے دیباج کہلاتے تھے اُن کو زندہ دیوار میں چنوا دیا۔ ان بے رحمیوں کی ایک بڑی داستان ہے جس کے بیان کرنے کو بڑا سخت دل چاہئے۔ آخر تنگ آکر ۱۴۵ھ میں انہیں مظلوم سادات میں سے محمد نفس ذکیہ نے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں خروج کیا۔

نفس ذکیہ اور ابراہیم کی بغاوت

اور چند روز میں بڑی جمعیت پیدا کر لی بڑے بڑے پیشوایان مذہب حتیٰ کہ امام مالک نے فتوے دیدیا کہ منصور نے جبراً بیعت لی خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے"۔ نفس ذکیہ اگرچہ نہایت دلیر قوی بازو۔ فن جنگ سے واقف تھے لیکن تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ رمضان ۱۴۵ھ میں نہایت بہادری سے لڑ کر میدان جنگ میں مارے گئے۔ انکے بعد ابراہیم اُنکے بھائی نے علم خلافت بلند کیا اور اس سر و ساماں سے مقابلہ کو اُٹھے کہ منصور کے حواس جاتے رہے کہتے ہیں کہ اس اضطراب میں منصور نے دو مہینے تک کپڑے نہیں بدلے سرہانے سے تکیہ اُٹھا لیتا تھا اور کہتا تھا کہ "میں نہیں جانتا تکیہ میرا ہے یا ابراہیم کا"۔ انہیں دنوں میں وہ کنیزیں حرم میں آئیں اُن سے بات تک نہ کی۔ ایک شخص نے سبب پوچھا تو کہا

"یہ فرصت کے کام ہیں اس وقت تو یہ دُھن ہے کہ ابراہیم کا سر میرے آگے یا میرا سر ابراہیم کے آگے رکھا جائے"!

ابراہیم چونکہ شجاعت اور دلیری کے ساتھ بہت بڑے عالم اور مقتدائے عام تھے۔ اُن کے دعوائے خلافت پر ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ خاص کوفہ میں کم وبیش لاکھ آدمی اُنکے ساتھ جان دینے کو طیار ہو گئے۔ مذہبی گروہ خاصکر علماء وفقہاء نے عموماً اُن کا ساتھ دیا۔ امام ابو حنیفہ شروع سے عباسیوں کی بے اعتدالیاں دیکھتے آتے تھے سفاح ہی کے زمانہ میں اُن کی رائے قائم ہو چکی تھی کہ یہ لوگ منصب خلافت کے شایاں نہیں ابراہیم بن میمون جو ایک نہایت دیندار عالم تھے۔ امام صاحب کے خالص دوستوں میں سے تھے وہ اکثر کہتے کہ ان مظالم پر کیا ہم کو چپ رہنا چاہیے؟۔ امام صاحب فرماتے کہ "امر بالمعروف بے شبہہ فرض ہے۔ مگر اُس کے لئے سامان شرط ہے"۔ لیکن وہ مذہبی جوش میں صبر کی تاب نہ لا سکے۔ ابو مسلم خراسانی کہ ان ظلموں کا بانی تھا اُسکے پاس گئے اور نہایت بیباکی کے ساتھ اِس امر کے متعلق گفتگو کی۔ اُس نے اُن کی گستاخی یا فساد پیدا ہونے کے احتمال سے اُن کو قتل کروایا۔ امام ابو حنیفہ سنکر بہت روئے لیکن کیا کر سکتے تھے۔ یہ ۱۳۱ھ کا واقعہ ہے ۱۴۵ھ میں ابراہیم نے جب علم خلافت بلند کیا تو اور پیشوایان مذہب کے ساتھ امام صاحب نے بھی اُن کی تائید کی۔ خود شریک جنگ ہونا چاہتے تھے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہ ہو سکے۔ جس کا اُن کو ہمیشہ افسوس رہا۔

نامۂ دانشوراں میں امام صاحب کا ایک خط نقل کیا ہے جو اُنہوں نے ابراہیم کو لکھا تھا۔ اُس کے یہ الفاظ ہیں "اما بعد فانی قد جھزت الیک اربعۃ آلاف درھم ولم یکن عندی غیرھا ولولا امانات الناس عندی للحقت بک فاذا لقیت القوم وظفرت بھم فافعل کما فعل ابوک فی اھل صفین اقتل مدبرھم واجھز علی جریحھم ولا تفعل کما فعل ابوک فی اھل الجمل فان القوم لھم فئۃ"

یعنی "میں آپکے پاس چار ہزار درہم بھیجتا ہوں کہ اس وقت اِسیقدر موجود تھے۔ اگر لوگوں کی امانتیں میرے پاس نہ رکھی ہوتیں تو میں ضرور آپسے آملتا۔ جب آپ دشمنوں

پر فتح پائیں تو وہ برتاؤ کریں جو آپ کے باپ (حضرت علیؓ) صفین والوں کے ساتھ کیا تھا زخمی اور بھاگ جانے والے سب قتل کیے جائیں۔ وہ طریقہ نہ اختیار کیجئے گا جو آپ کے والد نے حرب جمل میں جائز رکھا تھا۔ کیونکہ مخالف بڑی جمعیت رکھتا ہے" نامۂ دانشوراں میں اس خط کی نسبت لکھا ہے کہ معتبر کتابوں میں منقول ہے لیکن کسی خاص کتاب کا نام نہیں بتایا۔ اس لئے ہم اُس کی صحت پر یقین نہیں کر سکتے۔

یہ خط صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شبہہ نہیں کہ امام صاحب ابراہیم کے علانیہ طرفدار تھے اور بجز اس کے کہ خود شریک جنگ نہ ہو سکے اور ہر طرح پر اُن کی مدد کی۔ ابراہیم نے اپنی بے تدبیری سے شکست کھائی اور بصرہ میں نہایت دلیری سے لڑ کر مارے گئے۔ اس مہم سے فارغ ہو کر منصور اُن لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جنھوں نے ابراہیم کا ساتھ دیا تھا۔ ان میں امام صاحب بھی تھے۔ اُس وقت تک منصور کا پایۂ تخت ہاشمیہ ایک مقام تھا جو کوفہ سے چند میل پر ہے۔ لیکن چونکہ کوفہ والے سادات کے سوا اور کسی خاندان کو خلافت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے منصور نے ایک دوسری دار الخلافہ کی تجویز کی اور بغداد کو انتخاب کیا۔ ۱۴۶ھ میں بغداد پہنچکر امام ابو حنیفہ کے نام فرمان بھیجا کہ فوراً پائے تخت میں حاضر ہوں۔ وہ بنو امیہ کی تباہی کے بعد مکہ معظمہ سے چلے آئے تھے۔ اور کوفہ میں مقیم تھے منصور نے گو پہلے ہی اُنکے قتل کا ارادہ کر لیا تھا تاہم بہانہ ڈھونڈتا تھا۔ دربار میں حاضر ہوئے تو ربیع نے کہ حجابۃ کا عہدہ رکھتا تھا۔ ان لفظوں سے اُن کو دربار میں پیش کیا " یہ دنیا میں آج سب سے بڑا عالم ہے" منصور نے پوچھا تم نے کس سے علم کی تحصیل کی امام نے اُستادوں کے نام بتائے جن کا سلسلۂ شاگردی بڑے بڑے صحابہ تک پہنچتا تھا منصور نے اُن کے لئے قضا کا عہدہ تجویز کیا۔ امام صاحب نے صاف انکار کیا اور کہا کہ " میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا" منصور نے غصہ میں آکر کہا " تم جھوٹے ہو" امام صاحب نے کہا " اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ دعویٰ ضرور سچا ہے کہ میں عہدۂ قضا کے قابل نہیں۔ کیونکہ جھوٹا شخص قاضی نہیں مقرر ہو سکتا"

امام ابو حنیفہ بغداد میں طلب کئے گئے

یہ تو ایک منطقی لطیفہ تھا۔ لیکن دراصل وہ قضا کی ذمہ داریاں نہیں اُٹھا سکتے تھے اُنہوں نے منصور کے سامنے اپنی ناقابلیت کی جو وجہیں بیان وہ بالکل بجا تھیں یعنی یہ کہ

لے الجواہر المضیۃ ترجمۂ ابراہیم بن میمون ۱۲

مجھکو اپنی طبیعت پر اطمینان نہیں "۔ "میں عربی النسل نہیں ہوں اس لئے اہل عرب کو میری حکومت ناگوار ہوگی "۔ "درباریوں کی تعظیم کرنی پڑیگی ۔ اور یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا" پھر بھی منصور نے نہ مانا اور قسم کھاکر کہا کہ تم کو قبول کرنا ہوگا ۔ امام صاحب نے بھی قسم کھائی کہ ہرگز نہ قبول کرونگا ۔

عہدۂ قضا سے انکار

اس جرأت اور بیباکی پر تمام دربار حیرت زدہ تھا ۔ ربیع نے غصہ میں آکر کہا ابوحنیفہ! تم امیرالمومنین کے مقابلہ میں قسم کھاتے ہو ۔ امام صاحب نے فرمایا "ہاں کیونکہ امیرالمومنین کو قسم کا کفّارہ ادا کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے"۔

خطیب کی ایک اور روایت ہے کہ منصور نے زیادہ جبر کیا تو مجبوراً دارالقضا میں جاکر بیٹھے ۔ ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں قرضہ کا دعوےٰ تھا لیکن ثبوت کے گواہ نہ تھے ۔ مدعاعلیہ کو سرے سے انکار تھا ۔ امام صاحب نے حسب قاعدہ مدعاعلیہ سے کہا تم قسم کھاؤ کہ مدعی کا تم پر کچھ دینا نہیں آتا ۔ وہ طیار ہوگیا "واللہ" کا لفظ کہا تھا کہ امام صاحب نے گھبراکر روک دیا اور آستین سے کچھ روپے نکال کر مدعی کے حوالہ کئے کہ تم اپنا قرض لو ایک مسلمان کو قسم کیوں کھلواتے ہو ۔ عدالت سے آکر منصور سے کہہ دیا کہ مجھ سے کسی طرح یہ کام نہیں چل سکتا ۔ اس پر حکم ہوا کہ قید خانہ بھیجے جائیں جس سے اُس وقت چھوٹے کہ قید حیات سے چھوٹے ۔ اس مدت میں منصور اکثر اُن کو قیدخانہ سے بلالیتا اور علمی بحثیں کیا کرتا ۔

قید

وفات ۔ رجب ۱۵۰ سنہ ہجری

منصور نے امام کو ۱۴۶ھ میں قید کیا ۔ لیکن اس حالت میں بھی اُس کو اُن کی طرف سے اطمینان نہ تھا ۔ بغداد دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کا مرکز بن گیا تھا ۔ طالبان کمال ممالک اسلامی کے ہر گوشہ سے اُٹھ کر بغداد ہی کا رُخ کرتے تھے ۔ امام صاحب کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی ۔ قید کی حالت نے اُنکے اثر اور قبول عام کو بجائے کم کرنے کے اور زیادہ کر دیا تھا ۔ بغداد کی علمی جماعت جس کا شہر میں بہت کچھ اثر تھا اُنکے ساتھ نہایت خلوص رکھتی تھی ۔ ان باتوں کا یہ اثر تھا کہ منصور نے اُنکو نظربند رکھا لیکن کوئی

امر اُن کے ادب اور تعظیم کے خلاف نہ کر سکتا تھا۔ قید خانہ میں اُن کا سلسلۂ تعلیم بھی برابر قائم رہا۔ امام محمد نے کہ فقہ حنفی کے دست و بازو ہیں۔ قید خانہ ہی میں اُن سے تعلیم پائی اِن وجوہ سے منصور کو امام صاحب کی طرف سے جو اندیشہ تھا وہ قید کی حالت میں بھی باقی رہا۔ جس کی آخری تدبیر یہ تھی کہ بے خبری میں اُنکو زہر دلوا دیا۔ جب اُن کو زہر کا اثر محسوس ہوا تو سجدہ کیا اور اُسی حالت میں قضا کی۔

امام صاحب کو زہر دیا گیا

اُن کے مرنے کی خبر نہایت جلد تمام شہر میں پھیل گئی۔ اور سارا بغداد امنڈ آیا حسن بن عمارہ نے کہ قاضی شہر تھے غسل دیا۔ نہلاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "واللہ تم سب سے بڑے فقیہ بڑے عابد بڑے زاہد تھے۔ تم میں تمام خوبیاں جمع تھیں۔ تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہنچ سکیں"۔ غسل سے فارغ ہوتے ہوتے لوگوں کی یہ کثرت ہوئی کہ پہلی بار نماز جنازہ میں کم و بیش پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ اس پر بھی آنے والوں کا سلسلہ قائم تھا۔ یہانتک کہ چھ بار نماز پڑھی گئی۔ اور عصر کے قریب جا کر لاش دفن ہو سکی امام نے وصیت کی تھی کہ خیزران کے مقبرہ میں دفن کئے جائیں۔ کیونکہ یہ جگہ اُنکے خیال میں مغصوب نہ تھی۔ اس وصیت کے موافق خیزران کے مشرقی جانب اُنکا مقبرہ طیار ہوا۔ مؤرخ خطیب نے لکھا ہے کہ "دفن کے بعد بھی بیس دن تک لوگ اُنکے جنازہ کی نماز پڑھا کئے"۔ قبول عام کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی!

اُس وقت اُن ممالک میں بڑے بڑے ائمۂ مذہب موجود تھے جن میں بعض خود امام صاحب کے اُستاد تھے۔ سب نے اُن کے مرنے کا رنج کیا۔ اور نہایت تاسف آمیز کلمات کہے۔ ابن جریج مکہ میں تھے سنکر کہا "انا للہ بہت بڑا علم جاتا رہا"۔ شعبہ بن الحجاج نے کہ امام ابوحنیفہ کے شیخ اور بصرہ کے امام تھے نہایت افسوس کیا اور کہا "کوفہ میں اندھیرا ہوگیا"۔ اس واقعہ کے چند روز کے بعد عبداللہ بن مبارک کو بغداد جانے کا اتفاق ہوا۔ امام کی قبر پر گئے اور رو کر کہا "ابو حنیفہ! خدا تم پر رحم کرے۔ ابراہیم مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے حماد مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ افسوس تم نے تمام دنیا میں کسی کو اپنا جانشین نہ چھوڑا"[1]

[1] عقود الجمان میں یہ تمام تفصیل مذکور ہے ۱۲

امام کا مزار ایک مدت تک بوسہ گاہِ خلائق رہا اور آج بھی ہے۔ سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے کہ بڑی عظمت و شان کا فرمانروا اور نہایت عادل اور فیاض تھا ۴۵۹ھ میں اُن کی قبر پر ایک قبہ اور اُسکے قریب ایک مدرسہ طیار کرایا۔ غالباً بغداد میں یہ پہلا مدرسہ تھا۔ کیونکہ نظامیہ جو تمام اسلامی مدرسوں کا آدم خیال کیا جاتا ہے وہ اسی سنہ میں لیکن اس کے بعد تعمیر ہوا۔ رفعت اور خوبی عمارت کے لحاظ سے بھی لاجواب تھا۔ ابوسعید شرف الملک کہ الپ ارسلاں کا مُستوفی تھا اُس کے اہتمام سے عمارت طیار ہوئی۔ افتتاح کی رسم میں بغداد کے تمام علماء اور عمائد شریک تھے۔ اتفاق سے اُسی وقت ابوجعفر مسعود جو ایک مشہور شاعر تھا آنکلا اور برجستہ یہ اشعار پڑھے۔

الم تران العلم کان مبددا فجمعہ ھذا المغیب فی اللحد
کذلک کانت ھذہ الارض میتۃ فانشرھا فعل الحمید ابی سعد

یعنی تم دیکھتے نہیں علم کس طرح ابتر ہو رہا تھا۔ پھر اُس شخص نے اُسکو ترتیب دی جو اس لحد میں مدفون ہے۔ اسی طرح یہ زمین مردہ پڑی تھی۔ ابوسعد کی کوشش نے اُس کو دوبارہ زندہ کیا"۔ یہ مدرسہ جو مشہد ابوحنیفہ کے نام سے مشہور ہے مدت تک قائم رہا اور بڑے بڑے نامور علماء اُسکے پروفیسر مقرر ہوئے جنکے نام اور اجمالی حالات الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیہ میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ ۴۹۳ھ میں حکیم بن جزلہ نے کہ خلیفہ مقتدر باللہ کے دربار کا ایک مشہور حکیم تھا اپنی تمام کتابیں اس مدرسہ پر وقف کیں[1]۔ اس مدرسہ کے متعلق ایک مسافرخانہ بھی تھا۔ شائقانِ علم جو اطراف ملک سے آکر بغداد میں عارضی قیام کرتے تھے۔ اُنکو وہاں سے کھانا ملتا تھا۔ ایشیا کا مشہور سیاح ابن بطوطہ جسوقت بغداد میں پہنچا ہے عباسی حکومت کا اخیر زمانہ تھا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "اسوقت تمام بغداد میں مشہد ابی حنیفہ کے سوا کوئی زاویہ موجود نہیں ہے جہاں سے مسافروں کو کھانا ملتا ہو"۔ آج بھی اُنکا مقبرہ بغداد کے مشہور اور متبرک مقامات سے ہے۔ یہاں کے شاہ ایران سلطان ناصر الدین قاچار خلد اللہ سلطنۃ نے اپنے حالات سفر میں اُس کا ذکر کیا ہے۔

[1] ابن خلکان ترجمہ یحیی بن عیسیٰ بن جزلۃ الطبیب ۱۲۔

اور لکھا ہے کہ "میں نے امام ابوحنیفہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور نذر چڑھائی" علم کی شان دیکھو! جس کی بدولت کوفہ کے ایک خزاز نے یہ رتبہ حاصل کیا کہ بارہ سو برس کے بعد آج اُسکے مزار پر بڑے بڑے شاہنشاہوں کے سر جھکتے ہیں۔

امام کی اولاد

امام صاحب کی اولاد کا مفصل حال معلوم نہیں مگر اسقدر یقینی ہے کہ وفات کے وقت حماد کے سوا اُنکے کوئی اولاد موجود نہ تھی۔ حماد بڑے رتبہ کے فاضل تھے۔ بچپن میں اُن کی تعلیم نہایت اہتمام سے ہوئی تھی۔ چنانچہ جب الحمد ختم کی تو اُن کے پدر بزرگوار نے اسی تقریب میں معلم کو پانچسو درہم نذر کیے۔ بڑے ہوئے تو خود امام صاحب سے مراتب علمی کی تکمیل کی۔ علم و فضل کے ساتھ بے نیازی اور پرہیزگاری میں بھی باپ کے خلف الرشید تھے امام صاحب نے جب انتقال کیا تو اُنکے گھر میں لوگوں کا بہت سامال و اسباب امانت رکھا تھا اُنہوں نے قاضی شہر کے پاس حاضر کیا کہ جن کی امانتیں ہیں اُن کو پہنچا دی جائیں قاضی صاحب نے کہا کہ ابھی اپنے ہی پاس رہنے دو کہ زیادہ حفاظت سے رہیگا۔ اُنہوں نے کہا آپ انکی جانچ کر لیں کہ میرے باپ کا ذمہ بری ہو جائے۔ غرض تمام مال و اسباب قاضی صاحب کو سپرد کر کے خود روپوش ہو گئے اور اُسوقت ظاہر ہوئے کہ وہ چیزیں کسی اور مہتمم کے اہتمام میں دیدی گئیں۔ تمام عمر کسی کی ملازمت نہیں کی نہ شاہی دربار سے کچھ تعلق پیدا کیا[1] ذی قعدہ ۱۷۶ھ میں قضا کی چار بیٹے چھوڑے۔ عمر۔ اسمٰعیل۔ ابوحیان۔ عثمان۔ اسمٰعیل نے علم و فضل میں نہایت شہرت حاصل کی۔ چنانچہ مامون الرشید نے اُنکو عہدۂ قضا پر مامور کیا جسکو اُنہوں نے اس دیانت داری اور انصاف سے انجام دیا کہ جب بصرہ سے چلے تو سارا شہر اُن کی مشایعت کو نکلا۔ اور سب لوگ اُنکے جان و مال کو دعائیں دیتے تھے[2] مساور نے اُن کی مدح میں کہا ہے۔

اذا ما الناس یوما قایسونا بآبدۃ من الفتیا طریقۃ

---

[1] ابن خلکان ترجمۂ حماد ۱۲ [2] معارف بن قتیبہ ترجمۂ امام ابوحنیفہ ۱۲

اتیناھم بمقیاس صحیح | تلاد من طراز ابی حنیفة
اذا سمع الفقیه بھا وعاھا | واثبتھا بحبر فی صحیفة

امام صاحب کی معنوی اولاد تو آج تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور شاید چھ سات کروڑ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اُن کی جسمانی اولاد بھی جابجا موجود ہے۔ خود ہندوستان میں متعدد خاندان ہیں جن کا سلسلہ نسب امام تک پہنچتا ہے۔ اور خدا کے فضل سے علم و فضل کا جوہر بھی نسلاً بعد نسل اُن کی میراث میں چلا آتا ہے۔

اخلاق و عادات

ہمارے تذکرہ نویسوں نے امام کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی ہے اُس میں خوش اعتقادی اور مبالغہ کا اس قدر رنگ بھرا ہے کہ امام صاحب کی اصلی صورت اچھی طرح پہچانی نہیں جاتی "چالیس برس تک عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی" "تیس برس تک متصل روزے رکھے"۔ "جہاں وفات کی اُس جگہ سات ہزار بار قرآن ختم کیا" "شہر کوفہ میں مشتبہ گوشت کا ٹکڑا پڑ گیا تو اس خیال سے کہ مچھلیوں نے کھایا ہوگا اور مچھلیاں بہت دنوں تک زندہ رہتی ہیں ایک مدت تک مچھلی نہیں کھائی" "اسیطرح ایک شبہہ پر بکری کا گوشت کھانا چھوڑ دیا۔ اُن کا ذاتی صرف صرف دس آنہ ماہوار تھا" یہ اور اس قسم کے بہت سے افسانے اُن کی نسبت مشہور ہیں۔ اور لطف یہ کہ ہمارے مورخین انہیں دوراز کار قصوں کو امام کے کمالات کا جوہر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ واقعات نہ تاریخی اصول سے ثابت ہیں نہ اُن سے کسی کے شرف پر استدلال ہو سکتا ہے۔

مبالغہ آمیز روایتیں

یہ سچ ہے کہ امام صاحب کے جن فضائل یا عام حالات کو ہم صحیح تسلیم کرتے ہیں وہ بھی انہیں کتابوں سے ماخوذ ہیں جن میں یہ فضول قصے مذکور ہیں لیکن ہر واقعہ کی حیثیت الگ ہوتی ہے اور اُسی اعتبار سے شہادت کی حیثیت بھی بدل جاتی ہے معمولی واقعات میں عام شہادتیں کافی ہیں۔ لیکن اس قسم کے واقعات کیلئے ایسی سند درکار ہے جس میں ذرا بھی شبہہ کی گنجائش نہ ہو یعنی حدیث صحیح مرفوع متصل کے لئے جو قیدیں ضروری

ہیں اُن سے بھی کچھ بڑھکر ساتھ ہی درایت کے اصول پر منطبق ہو امام صاحب کی دانشمندی دقیقہ سنجی ۔ نکتہ شناسی پر۔ جب نگاہ پڑتی ہے جنکا ثبوت بمعنی نہیں عیانی موجود ہے۔ تو اُن واقعات پر مشکل سے یقین آسکتا ہے جو رُہبانیۃ اور بے اعتدالی کی حد سے بھی متجاوز ہیں

امام صاحب کی محاسن اخلاق کی صحیح (مگر اجمالی) تصویر دیکھنی ہو تو قاضی ابو یوسف کی تقریر سنو۔ جو انہوں نے ہرون الرشید کے سامنے بیان کی تھی۔ ہرون نے ایک موقع پر قاضی صاحب موصوف سے کہا کہ ابو حنیفہ کے اوصاف بیان کیجئے۔ انہوں نے کہا جہانتک میں جانتا ہوں ابو حنیفہ کے اخلاق و عادات یہ تھے کہ نہایت پرہیزگار تھے۔ منہیات سے بہت بچتے تھے۔ اکثر چپ رہتے تھے اور سوچا کرتے تھے۔ کوئی شخص مسئلہ پوچھتا اور اُنکو معلوم ہوتا تو جواب دیتے ورنہ خاموش رہتے۔ نہایت سخی اور فیاض تھے کسی کے آگے حاجت نہ لیجاتے۔ اہل دنیا سے احتراز تھا۔ دنیوی جاہ و عزت کو حقیر سمجھتے تھے۔ غیبت سے بہت بچتے تھے۔ جب کسی کا ذکر کرتے تو بھلائی کے ساتھ کرتے۔ بہت بڑے عالم تھے اور مال کی طرح علم کے صرف کرنے میں بھی فیاض تھے۔" ہارون الرشید نے یہ سنکر کہا "صالحین کے یہی اخلاق ہوتے ہیں" عام نگاہوں میں یہ باتیں چنداں وقعت نہیں رکھتیں لیکن روحانی اوصاف کے نکتہ شناس سمجھ سکتے ہیں کہ یہ طرز زندگی ظاہر میں جسقدر سادہ اور آسان ہے در اصل اُسیقدر مشکل اور قدر کے قابل ہے۔

امام صاحب کا حلیہ اور گفتگو

امام صاحب کو خدا نے حسن سیرت کے ساتھ جمال صورت بھی دیا تھا میانہ قد خوشرو اور موزون اندام تھے۔ گفتگو نہایت شیریں اور آواز بلند اور صاف تھی کیسا ہی پیچیدہ مضمون ہو نہایت صفائی اور فصاحت سے ادا کر سکتے تھے۔ مزاج میں تکلف تھا۔ اور اکثر خوش لباس رہتے تھے۔

لباس

کبھی کبھی سنجاب و قاقم کے جُبّے بھی استعمال کرتے تھے۔ ابو مطیع بلخی اُن کے شاگرد کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن اُن کو نہایت قیمتی چادر اور قمیص پہنے دیکھا۔ جن کی قیمت کم از کم چارسو درہم ہوگی۔"

ایک دن نصر بن محمد اُن سے ملنے گئے امام صاحب کہیں باہر جانے کی طیاری کر رہے تھے۔ ان سے کہا کہ ذرا دیر کے لئے اپنی چادر مجھے دیدو۔ واپس آئے تو شکایت

کی کہ ناحق تمہاری چادر لیکر مجھکو شرمندہ ہونا پڑا۔ انہوں نے کہا کیوں؟ فرمایا بہت گندہ ہے
نصر کہتے ہیں کہ میں نے وہ چادر پانچ دینار کو خریدی تھی اور مجھکو اُسپر ناز تھا۔ اس لئے
امام صاحب کی شکایت پر تعجب ہوا۔ لیکن دوسرے موقع پر جب میں نے اُنکو ایک
چادر اوڑہے دیکھا جو تیس دینار سے کم قیمت کی نہ تھی تو وہ تعجب جاتا رہا۔ خلیفہ منصور
نے درباریوں کے لئے خاص قسم کی ٹوپیاں ایجاد کی تھیں۔ جو نرکل وغیرہ سے بنتی تھیں
اور اُن پر سیاہ کپڑا منڈھا ہوتا تھا۔ چونکہ نہایت لمبی ہوتی تھیں۔ ابو دُلامہ شاعر
نے ظرافۃً کہا۔

وکنا نرجی من امام زیادۃً فزاد الامام المرتضی فی القلانس

یعنی ہم کو خلیفہ سے اضافہ کی امید تھی۔ سو حضرت نے اضافہ کیا تو ٹوپیوں میں کیا"! امام
صاحب اگرچہ دربار سے کوسوں بھاگتے تھے لیکن اس قسم کی ٹوپی جو اہل دربار اور امرا
کے ساتھ مخصوص تھی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے۔ دنیا دار و دولتمندوں کیلئے تو ایک
معمولی بات ہے لیکن علماء کے دایرہ میں یہ امر تعجب کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ امام صاحب کے
توشہ خانہ میں اکثر سات آٹھ ٹوپیاں موجود رہتی تھیں۔

درباری ٹوپی

اور باتوں میں بھی امام صاحب کا طرز معاشرت ان حیثیتوں میں اور علماء سے بالکل
جُدا تھا۔ اُنکے ہمعصر عموماً شاہی دربار۔ یا وزرا اور امرا کے وظیفہ خوار تھے۔ اور اس کو
عیب نہیں سمجھتے تھے۔ قاضی ابن عبد البر پر کسی نے اعتراض کیا تھا کہ آپ امرا کے
وظیفہ خوار ہیں اُنہوں نے اِس کے جواب میں بعض صحابہ اور بہت سے تابعین اور تبع
تابعین کی نظیریں پیش کیں۔ جو امرا کے روزینے اور انعامات سے زندگی بسر کرتے
تھے۔

اگرچہ ہم اسکو نئے خیال والوں کی طرح کاہلی اور مفت خواری کا اثر نہیں سمجھتے کیونکہ اُس
زمانہ تک تعلیم کا سلسلہ معاوضہ کی بنیاد پر نہیں قایم ہوا تھا۔ علما بطور خود اپنے گھروں پر
یا مسجدوں میں لوگوں کو مفت تعلیم دیتے تھے۔ اور یہ سلسلہ اسقدر وسیع اور مفید تھا کہ
آجتک اُس سے بڑھکر نہ ہوسکا۔ اُمرا کے ہاں سے ان لوگوں کے لئے جو وظیفے مقرر

تھے۔ یا کبھی کبھی صلہ و نذر کے طور پر مل جاتا تھا۔ اُسکو آن آنریری پروفیسروں کی تنخواہ سمجھ لینا چاہئے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ رفتہ رفتہ انہیں مثالوں سے پیرزادگی اور مفت خواری کی بنیاد قائم ہو گئی جس نے قوم کے ایک بڑے حصہ کو بالکل نکما اور اپاہج بنا دیا۔ بے شبہہ امام ابوحنیفہ اس اصول کے سرے سے مخالف تھے۔ اور اس لحاظ سے اُن کی مخالفت بجا بھی تھی۔ اس بے تعلقی سے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ امر حق کے اظہار میں امام صاحب کو کسی سے باک نہیں ہوتا تھا۔ انسان کتنا ہی آزاد مزاج اور صاف گو ہو لیکن احسان وہ چھپا ہوا جادو ہے کہ اُس کے اثر سے بچنا ناممکن نہیں تو قریباً ناممکن ہے امام صاحب تمام عمر کسی کے احسانمند نہوئے۔ اور اس وجہ سے اُن کی آزادی کو کوئی چیز دبا نہ سکتی تھی۔ اکثر موقعوں پر وہ اس خیال کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔ ابن ہبیرہ نے کہ کوفہ کا گورنر۔ اور نہایت نامور شخص تھا۔ ان سے بہ لجاجت کہا کہ "آپ کبھی کبھی قدم رنجہ فرماتے تو مجھ پر احسان ہوتا"۔ فرمایا "میں تم سے مل کر کیا کرونگا۔ مہربانی سے پیش آؤگے تو خوف ہے کہ تمہارے دام میں آجاؤں۔ عتاب کروگے تو میری ذلت ہے۔ تمہارے پاس جو زر و مال ہے مجھکو اُس کی حاجت نہیں۔ میرے پاس جو دولت ہے اُس کو کوئی شخص چھین نہیں سکتا"۔ عیسےٰ بن موسےٰ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ گذرا۔

وظیفہ خواری سے اجتناب

آزادی اور بے نیازی

خلیفہ منصور اور حرہ خاتون (منصور کی بیوی) میں کچھہ شکر رنجی ہو گئی تھی۔ خاتون کو شکایت تھی کہ خلیفہ عدل نہیں کرتا۔ منصور نے کہا کسی کو منصف قرار دو۔ اُس نے امام صاحب کا نام لیا۔ اُسی وقت طلبی کا فرمان گیا۔ خاتون پردہ کے قریب بیٹھی کہ امام صاحب جو فیصلہ کریں خود اپنے کانوں سے سنے۔ منصور نے پوچھا شرع کی رو سے مرد کتنے نکاح کر سکتا ہے۔ امام صاحب نے کہا چار۔ منصور خاتون کی طرف مخاطب ہوا کہ سنتی ہو! پردہ سے آواز آئی کہ ہاں سنا۔ امام صاحب نے منصور کی طرف خطاب کر کے کہا مگر یہ اجازت اُس شخص کے لئے خاص ہے جو عدل پر قادر ہو۔ ورنہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اچھا نہیں۔ خدا خود فرماتا ہے وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة۔ منصور چپ ہو گیا۔ امام صاحب گھر آئے تو ایک خادم پچاس ہزار درہم کے توڑے لئے ہوئے حاضر ہوا کہ خاتون نے نذر بھیجی ہے اور کہا ہے

بلاغرض حق گوئی

کہ" آپ کی کنیز آپ کو سلام کہتی ہے۔ اور آپ کی حق گوئی کی نہایت مشکور ہے۔" امام صاحب نے روپے پھیر دیئے اور خادم سے فرمایا جاکر خاتون سے کہنا کہ" میں نے جو کچھ کہا کسی غرض سے نہیں کہا بلکہ میرا فرض منصبی تھا۔"

تجارت اور دیانت

امام صاحب کی تجارت نہایت وسیع تھی لاکھوں کا لین دین تھا۔ اکثر شہروں میں گماشتے مقرر تھے۔ بڑے بڑے سوداگروں سے معاملہ رہتا تھا۔ ایسے بڑے کارخانہ کے ساتھ دیانت اور احتیاط کا اسقدر خیال رکھتے تھے کہ ناجائز طور پر ایک حبہ بھی اُن کے خزانہ میں نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ اس احتیاط میں کبھی کبھی نقصان اُٹھانا پڑتا تھا مگر اُن کو کچھ پروا نہیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ حفص بن عبدالرحمن کے پاس خز کے تھان بھیجے اور کہلا بھیجا کہ فلاں فلاں تھان میں عیب ہے خریدار کو جتا دینا۔ حفص کو اس ہدایت کا خیال نہ رہا تھان بیچ ڈالے اور خریداروں کو عیب سے اطلاع نہ دی۔ امام صاحب کو معلوم ہوا تو نہایت افسوس کیا تھانوں کی قیمت جو تیس ہزار درہم تھی سب خیرات کر دی۔

ایک دن ایک عورت خز کا تھان لیکر آئی کہ فروخت کرا دیجئے۔ امام صاحب نے دام پوچھے اُسنے سو روپے بتائے۔ فرمایا کم ہیں اُس نے کہا تو دو سو روپے۔ فرمایا یہ تھان پانچسو سے کم قیمت کا نہیں۔ اُس نے متعجب ہو کر کہا آپ شاید ہنسی کرتے ہیں۔ امام صاحب نے پانچسو روپے اپنے پاس سے دیدیئے اور تھان رکھ لیا۔ اس احتیاط اور دیانت نے اُن کے کارخانہ کو بجائے نقصان پہنچانے کے اور بھی چمکا دیا تھا۔

فیاضی

تجارت اور اکتساب دولت سے اُن کا مقصود زیادہ تر عام کو فائدہ پہنچانا تھا جتنے احباب اور ملنے والے تھے سب کے روزینے مقرر کر رکھے تھے۔ شیوخ اور محدثین کے لئے تجارت کا ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا۔ کہ اُس سے جو نفع ہوتا تھا سال کے سال اُن لوگوں کو پہنچا دیا جاتا تھا[1]۔ عام معمول تھا کہ گھر والوں کے لئے کوئی چیز خریدتے تو اُسی قدر محدثین اور علما کے پاس بھجواتے۔ اتفاقیہ کوئی شخص ملنے آتا تو اُس کا حال پوچھتے اور حاجتمند ہوتا تو حاجت روائی کرتے۔ شاگردوں میں جس کو تنگ حال دیکھتے اُس کی ضروریات خانگی

---

[1] علامہ نووی نے تہذیب الاسما میں ان واقعات کو بسند بیان کیا ہے ۱۲

کی کفالت کرتے کہ اطمینان سے علم کی تکمیل کر سکے۔ بہت سے لوگ جو مفلسی کی وجہ سے تحصیل علم کا موقع نہیں مل سکتا تھا امام صاحب ہی کی دستگیری کی بدولت بڑے بڑے رتبوں پر پہنچے۔ انہیں میں قاضی ابو یوسف صاحب بھی ہیں جن کا مفصل تذکرہ آگے آتا ہے۔

شاگردوں کے ساتھ سلوک

ایک دفعہ کچھ لوگ ملنے آئے۔ ان میں ایک شخص ظاہری صورت سے شکستہ حال معلوم ہوتا تھا۔ لوگ رخصت ہو کر چلے تو امام صاحب نے اس سے فرمایا ذرا ٹھہر جاؤ۔ جانماز کی طرف اشارہ کیا کہ اس کو اُٹھانا۔ اُس نے دیکھا تو ہزار درہم کی ایک تھیلی تھی۔ عرض کی کہ میں دولتمند ہوں مجھکو اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا تو صورت ایسی بنائی چاہئے کہ دوسروں کو شبہہ نہ ہو۔

ایک دفعہ کسی بیمار کی عیادت کو جارہے تھے۔ راہ میں ایک شخص ملا جو اُن کا مقروض تھا۔ اُس نے دور سے اُن کو دیکھ لیا اور کترا کر دوسری طرف چلا۔ اُنہوں نے پکارا کہ کہاں جاتے ہو! وہ کھڑا ہو گیا۔ قریب پہنچے تو پوچھا کہ "مجھکو دیکھ کر تم نے راستہ کیوں کاٹا"۔ اُس نے کہا "آپ کے دس ہزار درہم مجھ پر آتے ہیں جو مجھ سے اب تک ادا نہ ہو سکے اِس شرم سے آنکھ برابر نہیں ہوتی"! امام صاحب اُس کی غیرت سے متعجب ہوئے اور فرمایا جاؤ میں نے سب معاف کر دیا۔

ایک بار سفر حج میں عبداللہ سہمی کا ساتھ ہوا کسی منزل میں ایک بدوی نے اُن کو پکڑا اور امام صاحب کے سامنے لایا کہ اس پر میرے روپے آتے ہیں اور یہ ادا نہیں کرتا۔

امام صاحب نے عبداللہ سے اِس کی حقیقت پوچھی۔ اُنہوں نے سرے سے انکار کیا۔ امام صاحب نے بدوی سے پوچھا آخر کتنے درہموں پر یہ جھگڑا ہے اُس نے کہا چالیس درہم متعجب ہو کر فرمایا کہ زمانہ سے حمیت اُٹھ گئی اتنے سے معاملہ پر یہ فضیحتی!! پھر کل درہم اپنے پاس سے ادا کر دیئے۔ ابراہیم بن عتبہ چار ہزار درہم کے مقروض تھے۔ اور اس ندامت کی وجہ سے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا اُنکے ایک دوست نے چندہ کر کے اُن کا قرض ادا کرنا چاہا۔ لوگوں نے بقدر حیثیت اعانت کی۔ امام صاحب کے پاس گئے تو فرمایا کہ کل کسقدر قرضہ ہے اُنہوں نے کہا چار ہزار۔ فرمایا اتنی سی رقم کے لئے لوگوں کو کیوں تکلیف دیتے ہو

یہ کہکر پورے چار ہزار درہم خود دیدیئے تاریخوں میں اس قسم کے اور بہت سے واقعات اُن کی نسبت منقول ہیں ہم نے اختصار کے لحاظ سے قلم انداز کیے۔

حلم وعفو

اس دولتمندی اور عظمت و شان کے ساتھ نہایت متواضع۔ حلیم اور خلیق تھے۔ ایک دفعہ مسجد خیف میں تشریف رکھتے تھے۔ شاگردوں اور ارادتمندوں کا حلقہ تھا۔ ایک اجنبی شخص نے مسئلہ پوچھا۔ امام صاحب نے جواب مناسب دیا اُس نے کہا "مگر حسن بصری نے اس کے خلاف بتایا ہے"۔ امام صاحب نے فرمایا "حسن نے غلطی کی"۔ حاضرین میں سے ایک شخص کہ حسن کا معتقد تھا طیش میں آگیا اور جھلاکر کہا "او ابن الفاحشہ! تو حسن کو خاطی کہتا ہے"! اس گستاخی اور بیہودہ گوئی نے تمام مجلس کو برہم کردیا۔ اور لوگوں نے چاہا کہ اُس کو پکڑ کر سزا دیں۔ امام صاحب نے روکا۔ اُن کے لحاظ سے لوگ مجبور ہو گئے۔ مگر دیر تک مجلس میں سناٹا رہا۔ لوگوں کا جوش کم ہوا تو امام صاحب نے اُس شخص کی طرف خطاب کیا اور فرمایا کہ "ہاں حسن نے غلطی کی عبد اللہ بن مسعود نے اس باب میں جو روایت کی ہے وہ صحیح ہے"۔

یزید بن کمیت کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں امام ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر تھا ایک شخص نے اُن سے گستاخانہ گفتگو شروع کی۔ امام صاحب تحمل سے جواب دیتے تھے وہ اور شوخ ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے امام کو زندیق کہدیا۔ اس پر فرمایا "خدا تم کو بخشے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ میری نسبت تم نے جو لفظ کہا۔ صحیح نہیں"۔ امام صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے کسی پر لعنت نہیں کی۔ کسی سے انتقام نہیں لیا۔ کسی مسلمان یا ذمی کو نہیں ستایا۔ کسی سے فریب اور بدعہدی نہیں کی"۔

امام سفیان ثوری اور امام صاحب میں کچھ شکر رنجی تھی۔ ایک شخص نے امام صاحب سے آکر کہا کہ سفیان آپ کو بُرا کہہ رہے تھے۔ امام نے فرمایا کہ "خدا میری اور سفیان دونوں کی مغفرت کرے۔ سچ یہ ہے کہ ابراہیم نخعی کے موجود ہوتے بھی اگر سفیان دنیا سے اُٹھ جاتے تو مسلمانوں کو سفیان کے مرنے کا ماتم کرنا پڑتا"۔

ایک دن مسجد میں درس دے رہے تھے ایک شخص نے جس کو اُن سے کچھ عداوت تھی عام مجلس میں اُن کی نسبت ناسزا الفاظ کہے۔ اُنہوں نے کچھ التفات نہ کی اور اُسی طرح درس

میں مشغول رہے۔ شاگردوں کو بھی منع کر دیا کہ اُس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ درس سے اُٹھے تو وہ شخص ساتھ ہوا اور جو کچھ منہ میں آتا تھا بکتا جاتا تھا۔ امام صاحب اپنے گھر کے قریب پہنچے تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ بھائی یہ میرا گھر ہے کچھ باقی رہ گیا ہو تو اُٹھا نہ رکھو کہ اب میں اندر جاتا ہوں اور تم کو موقع نہ ملیگا۔

ایک اور دن حلقہ درس قائم تھا۔ ایک نوعمر نے مسئلہ پوچھا۔ امام صاحب نے جواب دیا اُس نے کہا۔ ابوحنیفہ! تم نے جواب میں غلطی کی۔ ابوالخطاب جرجانی بھی حلقہ میں شریک تھے اُن کو نہایت غصہ آیا اور حاضرین کو ملامت کی کہ تم لوگ بڑے بے حمیت ہو۔ امام کی شان میں ایک لونڈا جو جی میں آتا ہے کہہ جاتا ہے۔ تم کو ذرا جوش نہیں آتا۔ امام صاحب نے ابوالخطاب کی طرف خطاب کیا اور فرمایا کہ "ان لوگوں پر کچھ الزام نہیں میں اس جگہ بیٹھا ہوں تو اسی لئے بیٹھا ہوں کہ لوگ آزادانہ میری رائے کی غلطیاں ثابت کریں اور میں تحمل کے ساتھ سنوں"۔

محلہ میں ایک موچی رہتا تھا۔ جو نہایت رنگین طبع اور خوش مزاج تھا۔ اُس کا معمول تھا کہ دن بھر مزدوری کرتا۔ شام کو بازار جا کر گوشت اور شراب مول لاتا۔ کچھ رات گئے دوست احباب جمع ہوتے خود سیخ پر کباب لگاتا۔ اور یاروں کو کھلاتا۔ ساتھ ہی شراب کا دور چلتا اور مزے میں آکر یہ شعر گاتا۔ اضاعونی وای فتی اضاعوا۔ لیوم کریہۃ وسداد ثغر۔ "یعنی لوگوں نے مجھ کو ہاتھ سے کھو دیا اور کیسے بڑے شخص کو کھویا جو لڑائی اور رخنہ بندی کے دن کام آتا ہے"۔ امام صاحب ذکر و شغل میں رات کو سوتے کم تھے اُس کی نغمہ سنجیاں سنتے اور فرط اخلاق کی وجہ سے کچھ تعرض نہ کرتے۔ ایک رات کوتوال شہر اُدھر آنکلا اور اُس غریب کو گرفتار کر کے قیدخانہ میں بھیجدیا۔ صبح کو امام صاحب نے دوستوں سے تذکرہ کیا کہ رات ہمارے ہمسایہ کی آواز نہیں آئی۔ لوگوں نے رات کا ماجرا بیان کیا۔ اسی وقت سواری طلب کی۔ دربار کے کپڑے پہنے اور دارالامارۃ کا قصد کیا۔ یہ عباسیہ کا عہد حکومت تھا۔ اور عیسیٰ بن موسیٰ کہ خلیفہ منصور کا برادرزادہ و تمام خاندان میں عقل و تدبیر دلیری اور شجاعت کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ کوفہ کا گورنر تھا۔ لوگوں نے اطلاع کی کہ امام ابوحنیفہ آپ

ہمدردی اور ہمسایگی کا لحاظ

کے ملنے کو آتے ہیں۔ اُس نے درباریوں کو استقبال کے لئے بھیجا اور حکم دیا کہ دارالامارۃ کے صحن تک امام صاحب کو سواری پر لائیں۔ سواری قریب آئی تو تعظیم کو اٹھا اور نہایت ادب سے لا کر بٹھایا۔ پھر عرض کی کہ "آپ نے کیوں تکلیف فرمائی مجھکو بلا بھیجتے کہ میں خود حاضر ہوتا۔" امام صاحب نے فرمایا کہ ہمارے محلہ میں ایک موچی رہتا ہے کوتوال نے اُس کو گرفتار کر لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ رہا کر دیا جائے۔" عیسیٰ نے اُسیوقت داروغہ جیل کو حکم بھیجا اور وہ رہا کر دیا گیا۔ امام صاحب عیسیٰ سے رخصت ہو کر چلے تو موچی بھی ہمرکاب ہوا۔ امام اُس کی طرف مخاطب ہوئے کہ "کیوں ہم نے تم کو ضائع تو نہیں کیا۔" یہ اُس شعر کی طرف اشارہ تھا جسکو وہ ہمیشہ پڑھا کرتا تھا۔ اضاعونی وای فتی اضاعوا۔ اُس نے عرض کی "نہیں آپنے ہمسائگی کا پورا حق ادا کیا۔" اس کے بعد اُس نے عیش پرستی سے توبہ کی اور امام صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھنے لگا۔ رفتہ رفتہ علم فقہ میں مہارت حاصل کی اور فقیہ کے لقب سے ممتاز ہوا۔

والدہ کی خدمت

امام صاحب کے والد نے امام کے سن رشد سے پہلے قضا کی لیکن والدہ مدت تک زندہ رہیں اور امام کو اُن کی خدمت گذاری کا کافی موقع ہاتھ آیا۔ وہ مزاج کی شکی تھیں اور جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہے واعظوں اور قصہ گویوں کے ساتھ نہایت عقیدت رکھتی تھیں۔ کوفہ میں عمرو بن ذر ایک مشہور واعظ تھے اُن کے ساتھ خاص عقیدت تھی۔ کوئی مسئلہ پیش آتا تو امام صاحب کو حکم دیتیں کہ عمرو بن ذر سے پوچھ آؤ۔ امام تعمیل ارشاد کے لئے اُن کے پاس جا کر مسئلہ پوچھتے وہ عذر کرتے کہ آپ کے سامنے میں کیا زبان کھول سکتا ہوں۔ فرماتے کہ "والدہ کا یہی حکم ہے۔" اکثر ایسا ہوتا کہ عمرو کو مسئلہ کا جواب نہ آتا۔ امام صاحب سے درخواست کرتے کہ آپ مجھ کو بتا دیں میں اُسی کو آپکے سامنے دہرا دوں۔

کبھی کبھی اصرار کرتیں کہ میں خود چلکر پوچھوں گی۔ خچر پر سوار ہوتیں امام صاحب پاپیادہ ساتھ ہوتے۔ خود مسئلہ کی صورت بیان کرتیں اور اپنے کانوں سے جواب سُن لیتیں تب تسکین ہوتی۔ ایک دفعہ امام صاحب سے پوچھا کہ یہ صورت پیش آئی ہے مجھکو کیا کرنا چاہیئے

لہ یہ واقعہ بہت سی کتابوں میں مختلف طریقہ سے مذکور ہے میں نے کتاب الاغانی وابن خلکان وعقود الجمان کی روایت اختیار کی ہے۔

امام صاحب نے جواب بتایا۔ بولیں کہ تمہاری سند نہیں زرعہ واعظ تصدیق کریں تو مجھکو اعتبار آئے۔ امام صاحب ان کو لیکر زرعہ کے پاس گئے اور مسئلہ کی صورت بیان کی زرعہ نے کہا آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں آپ کیوں نہیں بتا دیتے۔ امام صاحب نے فرمایا۔ میں نے یہ فتویٰ دیا تھا۔ زرعہ نے کہا بالکل صحیح ہے۔ یہ سنکر اُن کو تسکین ہوئی اور گھر واپس آئیں۔ ابن ہبیرہ نے جب امام صاحب کو بلاکر میر منشی مقرر کرنا چاہا۔ اور انکار کے جرم پر درّے لگوائے اُس وقت امام کی والدہ زندہ تھیں۔ اُن کو نہایت صدمہ ہوا۔ امام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "مجھکو اپنی تکلیف کا چنداں خیال نہ تھا۔ البتہ یہ رنج ہوتا تھا کہ میری تکلیف کی وجہ سے والدہ کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔"

رقت طبع

امام صاحب اگرچہ نہایت رقیق القلب تھے اور کسی کو تکلیف اور رنج کی حالت میں دیکھتے تو بیتاب ہو جاتے۔ ایک دفعہ مسجد میں بیٹھے تھے کسی نے آکر کہا کہ فلاں شخص کوٹھے سے گر پڑا۔ دفعۃً اس زور سے چیخ اُٹھے کہ مسجد میں تہلکہ پڑ گیا۔ حلقۂ درس چھوڑکر برہنہ پا دوڑے اور اُس شخص کے گھر پر جاکر بہت کچھ غمخواری اور ہمدردی کی جب تک وہ اچھا نہ ہوا روزانہ صبح کو جاتے اور اُس کی تیمارداری کرتے۔ تاہم اپنے اوپر کوئی مصیبت آن پڑتی تو اس استقلال سے برداشت کرتے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا۔ عمال اور اہل دربار کے ہاتھ سے اکثر اُن کو تکلیفیں پہنچیں مگر کبھی اُنکے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی۔ نہایت مضبوط دل رکھتے تھے۔ اور ضبط و استقلال گویا مایۂ خمیر تھا۔

استقلال

ایک دن جامع مسجد میں درس دے رہے تھے مستفیدوں اور ارادتمندوں کا مجمع تھا اتفاقاً چھت سے ایک سانپ گرا۔ اور امام کی گود میں آیا۔ تمام لوگ گھبرا کر بھاگ گئے مگر وہ اُسی اطمینان سے بیٹھے رہے۔ امام مالک کو بھی ایک بار ایسا ہی اتفاق پیش آیا۔ اور وہ اُن کی زندگی کا مشہور اور دلچسپ واقعہ ہے۔

بات نہایت کم کرتے اور غیر ضروری باتوں میں کبھی دخل نہ دیتے۔ درس میں بھی معمول تھا کہ شاگرد باہم نہایت آزادی سے بحثیں کرتے آپ چپ بیٹھے سنا کرتے۔ جب بحث زیادہ بڑھ جاتی اور کسی بات کا تصفیہ نہ ہوتا تو [illegible] تفصیل بیان کر دیتے کہ سب کو

تشفی ہو جاتی۔

حفظ لسان

غیبت سے پرہیز رکھتے۔ اس نعمت کا شکر ادا کرتے کہ خدا نے میری زبان کو اس آلودگی سے پاک رکھا۔ ایک شخص نے کہا حضرت! لوگ آپ کی شان میں کیا کچھ نہیں کہتے۔ مگر آپ سے میں نے کسی کی بُرائی نہیں سنی فرمایا ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء امام سفیان ثوری سے کسی نے کہا "ابو حنیفہ کو کبھی کسی کی غیبت کرتے نہیں سنا"۔ انہوں نے کہا کہ "ابو حنیفہ ایسے بیوقوف نہیں کہ اپنے اعمال صالح کو آپ برباد کریں"۔

قسم کھانی بُرا جانتے تھے اور اُس سے بہت پرہیز کرتے تھے عہد کر لیا تھا کہ اتفاقاً بھی اس خطا کا مرتکب ہونگا تو ایک درہم کفارہ دوں گا۔ اتفاق سے بھول کر کسی موقع پر قسم کھائی اُس کے بعد عہد کیا کہ اب بجائے درہم کے دینار دوں گا۔

ذکر و عبادت

نہایت مرتاض اور زاہد تھے۔ ذکر و عبادت میں اُن کو مزہ آتا تھا اور بڑے ذوق و خلوص سے ادا کرتے تھے۔ اس باب میں اُن کی شہرت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ "اُن کی پرہیزگاری اور عبادت کے واقعات تواتر کی حد کو پہنچ گئے ہیں"۔ اکثر نماز میں یا قرآن پڑھنے کے وقت رقت طاری ہوتی اور گھنٹوں رویا کرتے۔ ابراہیم بصری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نماز فجر میں میں امام ابو حنیفہ کے ساتھ شریک تھا۔ امام نماز نے یہ آیت پڑھی ولا تحسبن اللہ غافلاً عما یعمل الظالمون یعنی خدا کو ظالموں کی کردار سے بیخبر نہ سمجھنا۔ امام ابو حنیفہ پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ سارا بدن کانپنے لگا۔ زائدہ کہتے ہیں کہ مجھ کو ایک ضروری مسئلہ دریافت کرنا تھا۔ امام ابو حنیفہ کے ساتھ نماز عشا میں شریک ہوا اور منتظر رہا کہ نوافل سے فارغ ہوں تو دریافت کروں۔ وہ قرآن پڑھتے پڑھتے اس آیت پر پہنچے ووقانا عذاب السموم بار بار اس آیت کو پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور وہ یہی آیت پڑھتے رہے۔ ایک بار نماز میں یہ آیت پڑھی بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر۔ یعنی قیامت گنہگاروں کا وعدہ گاہ ہے اور قیامت سخت مصیبت کی چیز اور ناگوار چیز ہے"۔ اسی آیت میں رات ختم ہو گئی۔ بار بار پڑھتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

یزید بن کمیت ایک مشہور عابد اور امام صاحب کے ہمعصر تھے اُن کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ نماز عشا میں امام ابو حنیفہ کے ساتھ شریک تھا۔ امام نماز نے اذا زلزلت پڑھی لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے۔ میں ٹھہرا رہا۔ امام ابو حنیفہ کو دیکھا کہ بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں یہ دیکھ کر میں اُٹھ آیا کہ اُنکے اوقات میں خلل نہو۔ صبح کو مسجد میں گیا تو دیکھا کہ غمزدہ بیٹھے ہیں۔ ڈاڑھی ہاتھ میں ہے اور بڑی رقت سے کہہ رہے ہیں" اے وہ جو ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی دونوں کا بدلہ دیگا نعمان اپنے غلام کو آگ سے بچانا"۔

ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے۔ ایک لڑکے کے پاؤں پر پاؤں پڑ گیا۔ وہ چیخ اُٹھا اور کہا کہ تو خدا سے نہیں ڈرتا۔ امام کو غش آگیا۔ مسعر بن کدام ساتھ تھے اُنہوں نے سنبھالا۔ ہوش میں آئے تو پوچھا کہ ایک لڑکے کی بات پر اسقدر بیقرار ہو جانا کیا تھا؟ فرمایا "کیا عجب کہ اُس کی آواز غیبی ہدایت ہو"۔

عبرت پذیری

ایک دفعہ حسب معمول دوکان پر گئے۔ نوکر نے کپڑوں کے تھان نکال کر رکھے اور تفاؤل کے طور پر کہا خدا ہم کو جنت دے۔ امام صاحب پر رقت طاری ہوئی اور اسقدر روئے کہ شانے تر ہوگئے۔ نوکر سے کہا دوکان بند کردو۔ آپ چہرہ پر رومال ڈال کر کسی طرف نکل گئے دوسرے دن دوکان پر گئے تو نوکر سے کہا بھائی ہم اس قابل کہاں کہ جنت کی آرزو کریں یہی بہت ہے کہ عذاب الٰہی میں گرفتار نہ ہوں"۔ حضرت عمر فاروق بھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "قیامت کے دن اگر مجھ سے نہ مواخذہ ہو نہ انعام ملے تو میں بالکل راضی ہوں"۔

ایک دفعہ کسی کو مسئلہ بتا رہے تھے ایک شخص نے کہا۔ ابو حنیفہ خدا سے ڈر کر فتویٰ دیا کرو۔ امام صاحب پر اس کا اسقدر اثر ہوا کہ چہرہ کی رنگت زرد پڑ گئی۔ اُس شخص کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا۔ بھائی! خدا تمکو جزائے خیر دے۔ اگر مجھکو یہ یقین نہ ہوتا کہ خدا مجھ سے مواخذہ کریگا کہ تو نے جانکر علم کو کیوں چھپایا۔ تو میں ہرگز فتویٰ نہ دیتا"۔ کوئی مسئلہ مشکل آجاتا اور جواب نہ معلوم ہوتا تو متردد ہوتے کہ غالباً میں کسی گناہ کا مرتکب ہوا یہ اُسی کی شامت ہے۔ پھر وضو کر کے نماز پڑھتے اور استغفار کرتے۔ فضیل بن عیاض کہ مشہور صوفی گذرے ہیں اُن سے کسی نے یہ حکایت بیان کی بہت روئے اور کہا" ابو حنیفہ کے گناہ کم تھے اس لئے اُن کو یہ خیال

ہوتا تھا۔ جو لوگ گناہوں میں غرق ہیں اُنپر ہزار آفتیں آتی ہیں اور مطلق خبر نہیں ہوتی کہ یہ غیبی تنبیہ ہے۔"

تقسیم اوقات

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں درس دیتے۔ دور دور سے استفتے آئے ہوتے اُن کے جواب لکھتے۔ پھر تدوین فقہ کی مجلس منعقد ہوتی۔ بڑے بڑے نامور شاگردوں کا مجمع ہوتا۔ جو مسایل اتفاق رائے سے طے ہوتے قلمبند کرلئے جاتے۔ نماز ظہر پڑھکر گھر آتے گرمیوں میں ہمیشہ ظہر کے بعد سو رہتے نماز عصر کے بعد کچھ دیر تک درس و تعلیم کا مشغلہ رہتا باقی وقت دوستوں سے ملنے ملانے۔ بیماروں کی عیادت۔ ماتم پرسی۔ غریبوں کی خبر گیری میں صرف ہوتا۔ مغرب کے بعد پھر درس کا سلسلہ شروع ہوتا اور عشا تک رہتا۔ نماز عشا پڑھ کر عبادت میں مشغول ہوتے اور اکثر رات بھر نہ سوتے۔ جاڑوں میں مغرب کے بعد مسجد ہی میں سو رہتے اور قریباً دس بجے اُٹھکر نماز عشا پڑھتے۔ پھر تمام رات تہجد اور ورد و وظایف میں گذرتی۔ کبھی کبھی دوکان پر بیٹھتے اور وہیں یہ تمام مشاغل انجام پاتے۔

ذہانت اور طبّاعی فتوے اور مناظرات نصایح اور دلپذیر باتیں

جو چیز امام صاحب کی قوتِ ایجاد حدّتِ طبع۔ دقتِ نظر۔ وسعتِ معلومات۔ غرض اُن کے تمام کمالات علمی کا آئینہ ہے۔ وہ علم فقہ ہے جس کی ترتیب و تدوین میں اُن کو وہ پایہ حاصل ہے جو ارسطو کو منطق اور اقلیدس کو ہندسہ میں۔ لیکن اُس پر تفصیلی بحث کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ اِسی ضرورت سے ہم نے اپنی کتاب کا دوسرا حصہ اِس بحث کے لئے خاص کر دیا ہے اِس موقع پر صرف وہ واقعات لکھتے ہیں جو امام صاحب کی علمی تاریخ کے عام واقعات ہیں۔ لیکن غور سے دیکھو تو وہ بھی بجائے خود اصول ہیں جن پر سینکڑوں مسائل کی بنیاد قائم ہے۔

اس مقام پر یہ کہدینا ضرور ہے کہ امام ابو حنیفہ کے مناظرات اور نکتہ آفرینیوں کے متعلق بہت بے سروپا افسانے شہرت پکڑ گئے ہیں۔ اور طرہ یہ کہ بعض مشہور مصنفوں نے بغیر تحقیق و تنقید کے اُن کو اپنی تالیفات میں نقل کر دیا جس سے عوام کو اپنے غلط خیالات کے لئے ایک

دستاویز ہاتھ آگئی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی فن میں کمال کے ساتھ شہرت عام حاصل کرتا ہے اُس کی نسبت اچھی یا بُری سینکڑوں روایتیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض حالتوں میں اسقدر عام زبانوں پر قبضہ کر لیتی ہیں کہ خواص تک کو اُن پر تواتر کا دھوکا ہوتا ہے۔ لطف یہ کہ معتقدین جوشِ اعتقاد میں ایسی باتیں بیان کر جاتے ہیں جسکو وہ مدح سمجھتے ہیں اور دراصل ذم ہوتی ہے۔ اسیطرح مخالف عیب و منقبت کی مثالیں پیش کرتا ہے۔ حالانکہ غور سے دیکھئے تو اُن واقعات سے بجائے اس کے کہ اُس شخص کی بُرائی ثابت ہو مدح کا پہلو نکلتا ہے۔ امام ابوحنیفہ بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں ہیں بعض مصنفوں نے اُن کی ذہانت اور طباعی کے ذیل میں بہت سے ایسے قصے لکھدیئے ہیں جن کو خدانخواستہ ہم سچ تسلیم کریں تو عیاذاً باللہ امام صاحب کو حیلہ جو۔ چالاک۔ متفنی۔ سخن ساز ماننا پڑیگا۔ لیکن وہ روایتیں تاریخی اصول کے ثابت نہیں۔ اور اسی وجہ سے اہل تحقیق خصوصاً محدثین نے اُن کے لکھنے سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے ہم بھی اُن کو قلم انداز کرتے ہیں۔ اور انہیں روایتوں پر اکتفا کرتے ہیں جو بظن غالب ثابت اور صحیح ہیں۔

اس میں شبہہ نہیں کہ امام صاحب کو اور ائمہ کی نسبت مناظرہ اور مباحثہ کے موقعے زیادہ پیش آئے۔ اُنھوں علوم شرعیہ کے متعلق بہت سے ایسے نکتے پیدا کئے تھے جو عام طبیعتوں کی دسترس سے باہر تھے۔ اس لئے ظاہر بینوں کا ایک بڑا گروہ جن میں بعض مقدس سادہ دل بھی شامل تھے اُن کا مخالف ہو گیا تھا۔ اور ہمیشہ اُن سے بحث و مناظرہ کے لیے تیار رہتا تھا امام صاحب کو بھی مجبوراً اُن کے شبہات رفع کرنے پڑتے تھے۔ اس اتفاقی سبب نے مناظرہ اور مباحثہ کا ایک وسیع سلسلہ قائم کر دیا تھا۔ لیکن امام صاحب کے مناظرات اسی پر محدود نہیں۔ مناظرہ اُس وقت درس کا ایک خاص طریقہ تھا۔ اور امام صاحب نے اکثر اساتذہ سے اسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی۔ عیون والحدایق کے مصنف نے اُن کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "انھوں نے شعبی۔ طاؤس۔ عطاء سے مناظرات کئے" یہ لوگ امام صاحب کے اساتذہ خاص ہیں۔ اور وہ اُن لوگوں کا نہایت ادب کرتے تھے۔ اس مناظرہ سے مقصود وہی درس کا مخصوص طریقہ ہے جو اس عہد میں عموماً مروج تھا۔[۵]

[۵] امام صاحب کے بعض مناظرات مورخ خطیب نے تاریخ بغداد میں اور امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں علم آدم الاسماء کلھا لکھے ہیں۔ اور عقود الجمان میں زیادہ استقصا کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور کتابوں میں بھی جستہ جستہ مذکور ہیں ۱۲

رفع یدین کے مسئلہ میں امام اوزاعی سے مناظرہ

امام اوزاعی کہ اقلیم شام کے امام اور فقہ میں مذہب مستقل کے بانی تھے۔ مکہ معظمہ میں امام ابو حنیفہ سے ملے اور کہا کہ "عراق والوں سے نہایت تعجب ہے کہ رکوع میں اور رکوع سے سر اُٹھانے کے وقت رفع یدین نہ کرتے تھے" حالانکہ میں نے زہری سے اُنہوں نے سالم بن عبد اللہ سے اُنہوں نے عبد اللہ بن عمر سے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان موقعوں پر رفع یدین کرتے تھے" امام ابو حنیفہ نے اُس کے مقابلہ میں۔ حماد۔ ابراہیم نخعی۔ علقمہ۔ عبد اللہ بن مسعود کے سلسلہ سے حدیث روایت کی کہ آں حضرت صلعم ان موقعوں پر رفع یدین نہیں فرماتے تھے" امام اوزاعی نے کہا سبحان اللہ" میں تو زہری سالم۔ عبد اللہ کے ذریعے سے حدیث بیان کرتا ہوں آپ اُس کے مقابلہ میں حماد نخعی علقمہ کا نام لیتے ہیں" امام ابو حنیفہ نے کہا میرے رُواۃ آپکے رُواۃ سے زیادہ فقیہ ہیں۔ اور عبد اللہ بن مسعود کا رتبہ تو معلوم ہی ہے۔ اِس لئے اُن کی روایت کو ترجیح ہے

امام رازی نے اِس مناظرہ کو مناقب الشافعی میں نقل کیا ہے[1]۔ اور گو واقعہ کی صحت سے انکار نہیں کر سکے تاہم یہ نکتہ چینی کی ہے کہ حسّی واقعات میں تفقہ کو کیا دخل ہے۔

اس اصول پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصّہ میں ہوگی۔ یہاں امام رازی کے حوالہ سے مقصود ہے کہ اصل واقعہ صحیح ہے جس سے شافعیوں کو بھی کو انکار نہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق امام محمدؒ نے کتاب الحجج میں ایک لطیف بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہماری روایت عبد اللہ بن مسعود تک منتہی ہوتی ہے اور فریق مخالف کی عبد اللہ بن عمر تک اس لئے بحث کا تمامتر مدار اس پر آجاتا ہے کہ ان دونوں میں کس کی روائیت ترجیح کے قابل ہے۔ عبد اللہ بن مسعود آں حضرت کے زمانہ میں پوری عمر کو پہنچ چکے تھے اور جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے جماعت کی صف اوّل میں جگہ پاتے تھے بخلاف اس کے عبد اللہ بن عمر کا محض آغاز تھا اور اُن کو دوسری تیسری صف میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اس لئے آں حضرت کے حرکات و سکنات سے واقف ہونے کے جو موقعے عبد اللہ بن مسعود کو مل سکے عبد اللہ بن عمر کو کیونکر حاصل ہو سکتے

[1] علامہ ابن الہمام نے اس مناظرہ کو فتح القدیر میں ذکر کیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف مقامات سے اس کے اشارے پائے جاتے ہیں ۱۲

تھے۔ امام محمد کا یہ طرز استدلال حقیقت میں اصول درایت پر مبنی ہے۔ امام ابو حنیفہ صاحب نے اپنی تقریر میں عبداللہ بن مسعود کی عظمت و شان کا جو ذکر کیا اُس میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

قرأت خلف الامام

ایک دن بہت سے لوگ جمع ہو کر آئے کہ قرأۃ خلف الامام کے مسئلہ میں امام صاحب سے گفتگو کریں۔ امام صاحب نے کہا "اتنے آدمیوں میں تنہا کیونکر بحث کر سکتا ہوں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس مجمع میں سے کسی کو انتخاب کریں جو سب کی طرف سے اس خدمت کا کفیل ہو۔ اور اُس کی تقریر پورے مجمع کی تقریر سمجھی جائے"۔ لوگوں نے منظور کیا۔ امام صاحب نے کہا "آپ نے یہ تسلیم کیا تو بحث کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ آپ نے جس طرح ایک شخص کو سب کی طرف سے بحث کا مختار کر دیا اسی طرح امام نماز بھی تمام مقتدیوں کی طرف سے قرأت کا کفیل ہے"۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ امام نے ایک شرعی مسئلہ کو صرف عقلی طور پر طے کر دیا۔ بلکہ حقیقت میں یہ اُس حدیث کی تشریح ہے جس کو خود امام صاحب نے بسند صحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا ہے۔ کہ من صلی خلف الامام فقرأت الامام قرأۃ له یعنی جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت بھی اُس کی قرأت ہے"۔

یہ امام صاحب کی مخصصات میں ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو ایسے عام فہم طریقہ سے سمجھا دیتے تھے کہ مخاطب کے ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ اور بحث نہایت جلد اور آسانی سے طے ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ ضحاک خارجی جو خارجیوں کا ایک مشہور سردار تھا اور بنو اُمیہ کے زمانہ میں کوفہ پر قابض ہو گیا تھا۔ امام صاحب کے پاس آیا اور تلوار دکھا کر کہا کہ "توبہ کرو"۔ انہوں نے پوچھا کس بات سے۔ ضحاک نے کہا۔ تمہارا عقیدہ ہے کہ علیؓ نے معاویہ کے جھگڑے میں ثالثی مان لی تھی۔ حالانکہ جب وہ حق پر تھے تو ثالث ماننے کے کیا معنے"۔ امام صاحب نے فرمایا کہ "اگر میرا قتل مقصود ہے تو اور بات ہے ورنہ اگر حق منظور ہے تو مجھ کو تقریر کی اجازت دو"۔ ضحاک نے کہا میں بھی مناظرہ ہی چاہتا ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا اگر بحث آپس میں طے نہ ہو تو کیا علاج؟ ضحاک نے کہا ہم دونوں ایک شخص کو منصف قرار دیں چنانچہ ضحاک ہی کے ساتھیوں میں سے ایک شخص انتخاب کیا گیا۔ کہ دونوں فریق کی صحت و غلطی کا تصفیہ کرے۔ امام صاحب نے فرمایا "یہی تو حضرت علی علیہ السلام نے بھی کیا تھا۔ پھر ان پر کیا الزام ہے"۔

ایک خارجی سے گفتگو

ضحاک دم بخود ہو گیا۔ اور چپکا اُٹھ کر چلا آیا۔

اسی ضحاک نے ایک بار کوفہ پہنچکر قتل عام کا حکم دیدیا۔ امام صاحب کو خبر ہوئی دوڑے گئے اور پوچھا کہ "آخر ان لوگوں نے کیا جرم کیا ہے"؟ اُس نے کہا یہ سب مرتد ہو گئے ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا پہلے ان لوگوں کا کچھ اور مذہب تھا جس کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ یا ہمیشہ سے یہی مذہب رکھتے تھے جواب رکھتے ہیں؟ ضحاک نے کہا کیا کہا پھر کہنا! امام صاحب نے زیادہ وضاحت سے بیان کیا ضحاک نے کہا بے شبہہ میری خطا تھی۔ اُسی وقت حکم دیا کہ تلواریں نیام میں کر لی جائیں"۔

قتادہ بصری سے مناظرہ

قتادہ بصری جن کا مختصر حال امام صاحب کے اساتذہ کے ذکر میں ہم لکھ آئے ہیں کوفہ میں آئے اور اشتہار دیدیا کہ مسائل فقہ میں جس کو جو پوچھنا ہو پوچھے میں ہر مسئلہ کا جواب دوں گا۔ چونکہ وہ مشہور محدث اور امام تھے بڑا مجمع ہوا۔ جوق جوق لوگ آتے تھے اور مسئلے دریافت کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ بھی موجود تھے۔ کھڑے ہو کر پوچھا کہ ایک شخص سفر میں گیا۔ برس دو برس کے بعد اُسکے مرنے کی خبر آئی اُس کی بیوی نے دوسرا نکاح کر لیا اور اُس سے اولاد ہوئی۔ چندروز کے بعد وہ شخص واپس آیا اولاد کی نسبت اُس کو انکار ہے کہ میری صلب سے نہیں ہے زوج ثانی دعویٰ کرتا ہے کہ میری ہے تو آیا دونوں اُس عورت پر زنا کا الزام لگاتے ہیں یا صرف وہ شخص جو ولدیت سے انکار کرتا ہے"؟ قتادہ نے کہا "یہ صورت پیش بھی آئی ہے"؟ امام نے کہا نہیں۔ لیکن علما کو پہلے طیار رہنا چاہئے کہ وقت پر تردد نہو قتادہ کو فقہ سے زیادہ تفسیر میں دعوے تھا بولے کہ ان مسائل کو رہنے دو۔ تفسیر کے متعلق جو پوچھنا ہو پوچھو امام ابو حنیفہ نے کہا اس آیت کے کیا معنے ہیں قال الذی عندہ علم من الکتاب انا آتیک بہ قبل ان یرتد الیک طرفک یہ وہ قصہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے درباریوں سے بلقیس کے تخت لانے کی فرمایش کی اور ایک شخص نے جو غالباً آصف بن برخیا حضرت سلیمان کے وزیر تھے۔ دعویٰ کیا کہ میں چشم زدن میں لادوں گا۔ اہل کتاب کی روایت ہے کہ آصف بن برخیا اسم اعظم جانتے تھے جس کی تاثیر سے ایک دم میں شام سے یمن پہنچکر تخت اُٹھا لائے۔ یہی روایت عام سلمانوں میں پھیل گئی تھی اور اُسی کے

مطابق اس آیت کا مطلب لگایا جاتا تھا۔ قتادہ نے بھی یہی معنی بیان کئے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا حضرت سلیمان خود بھی اسم اعظم جانتے تھے یا نہیں؟ قتادہ نے کہا "نہیں"۔ امام صاحب نے کہا "کیا آپ اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ نبی کے زمانہ میں ایسا شخص موجود ہو جو خود نبی نہ ہو اور نبی سے زیادہ علم رکھتا ہو"۔ قتادہ کچھ جواب نہ دیسکے اور کہا کہ عقاید کے متعلق پوچھو۔ امام صاحب نے کہا "آپ مومن ہیں"۔ اکثر محدثین اپنے آپ کو مومن کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اور اس کو احتیاط میں داخل سمجھتے تھے۔ حسن بصری سے ایک شخص نے یہی سوال کیا تھا جس کے جواب میں اُنہوں نے کہا کہ "انشاء اللہ"۔ پوچھنے والے نے کہا۔ کہ "انشاء اللہ کا کیا محل ہے"۔ فرمایا کہ "میں اپنے تئیں مومن تو کہوں مگر ڈرتا ہوں کہ خدا یہ نہ کہدے کہ تو جھوٹ کہتا ہے"۔ قتادہ نے بھی امام ابو حنیفہ کے سوال کا یہی جواب دیا۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک قسم کی وہم پرستی ہے۔ ایمان اعتقاد کا نام ہے جو شخص خدا اور رسول پر ایمان رکھتا ہے وہ قطعاً مومن ہے اور اُس کو سمجھنا چاہئے کہ میں مومن ہوں۔ البتہ اگر اس میں شک ہے تو قطعی کافر ہے۔ اور پھر انشاء اللہ کہنا بھی بیکار ہے۔ امام ابو حنیفہ نے اس عام غلطی کو مٹانا چاہا۔ قتادہ سے پوچھا آپنے یہ قید کیوں لگائی۔ اُنہوں نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا۔ کہ "مجھکو امید ہے کہ خدا قیامت کے دن میرے گناہوں کو معاف کرے"۔ امام ابو حنیفہ نے کہا "خدا نے حضرت ابراہیم سے جب یہ سوال کیا کہ اولم تومن تو اُنہوں نے جواب میں "بلیٰ" کہا تھا۔ یعنی ہاں میں مومن ہوں آپنے حضرت ابراہیم کے اس قول کی کیوں تقلید نہ کی۔ قتادہ ناراض ہو کر اُٹھے۔ اور گھر میں چلے گئے[1]۔

یحییٰ بن سعید سے مناظرہ

یحییٰ بن سعید انصاری کوفہ کے قاضی تھے۔ اور منصور عباسی کے دربار میں بڑا جاہ و اعتبار رکھتے تھے۔ تاہم کوفہ میں اُن کا وہ اثر قائم نہ ہو سکتا تھا جو امام ابو حنیفہ صاحب کا تھا اس پر ان کو تعجب ہوتا تھا۔ اور لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ کوفہ والے بھی عجب سادہ دل ہیں

[1] اس مناظرہ کو خطیب نے تاریخ بغداد۔ اور حافظ ابو المحاسن نے عقود الجمان میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ۱۲

تمام شہر ایک شخص کے اشاروں پر حرکت کرتا ہے"! امام ابو حنیفہ نے ابو یوسف و زفر اور چند ممتاز شاگردوں کو بھیجا کہ قاضی یحیٰی سے مناظرہ کریں۔ امام یوسف نے تقریر شروع کی مسئلہ یہ تھا کہ ایک غلام اگر دو شخصوں میں مشترک ہو اور صرف ایک شخص آزاد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے یا نہیں؟ قاضی یحیٰی نے کہا "نہیں کر سکتا کیونکہ حدیث میں آیا ہے لا ضرر ولا ضرار یعنی وہ کام جس سے کسی شخص کو ضرر پہنچے جائز نہیں صورت زیر بحث میں چونکہ دوسرے شریک کا ضرر ہے اس لیے شریک اوّل ایسے فعل کا مجاز نہیں ہو سکتا"۔ امام ابو یوسف نے کہا اگر دوسرا شریک آزاد کرے؟ قاضی یحیٰی بولے تب جائز ہے اور غلام آزاد ہو جائیگا۔ امام ابو یوسف نے کہا، "آپنے خود اپنے قول کی مخالفت کی۔ کیونکہ آپکے نزدیک ایک شریک کے آزاد کرنے سے غلام آزاد نہیں ہوتا یعنی اُسی طرح غلام کا غلام رہتا ہے صورت مذکور میں جب ایک شریک نے آزاد کیا تو آپ کے نزدیک اُس کا یہ فعل بالکل بے اثر ہے یعنی وہ اُسی طرح غلام باقی رہا جیسا پہلے تھا۔ اب صرف دوسرے شریک کے آزاد کرنے سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہے"۔

قاضی ابن ابی لیلےٰ کے فیصلہ پر نکتہ چینی

محمد بن عبد الرحمٰن جو زیادہ تر ابن ابی لیلیٰ کے لقب سے مشہور ہیں۔ بڑے مشہور فقیہ اور صاحب الرائے تھے۔ ۳۳ برس کوفہ میں منصب قضا پر مامور رہے۔ امام ابو حنیفہ اور اُن میں کسیقدر شکر رنجی تھی وجہ یہ تھی کہ فیصلوں میں وہ غلطی کرتے تھے تو امام صاحب اُس کی اصلاح کرنی چاہتے تھے۔ یہ اُن کو ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ لیکن امام صاحب اظہار حق پر مجبور تھے۔ قاضی صاحب مسجد میں بیٹھکر انفصال مقدمات کیا کرتے تھے۔ ایک دن کام سے فارغ ہو کر مجلس قضا سے اُٹھے۔ راہ میں ایک عورت کو دیکھا کہ کسی سے جھگڑ رہی ہے۔ کھڑے ہو گئے اثنائے گفتگو میں عورت نے اُس شخص کو یا ابن الزانیین کہدیا "یعنی اے زانی اور زانیہ کے بیٹے" قاضی صاحب نے حکم دیا کہ عورت گرفتار کر لی جائے۔ پھر مجلس قضا میں واپس آئے اور حکم دیا کہ عورت کو کھڑی کر کے درے لگائیں اور دو حد ماریں۔ امام ابو حنیفہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ فرمایا کہ قاضی صاحب نے اس فیصلہ میں چند غلطیاں کیں۔ مجلس قضا سے اُٹھکر واپس آئے۔ اور دوبارہ اجلاس کیا۔ یہ آئین عدالت کے خلاف ہے۔ مسجد میں حد مارنے کا حکم دیا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس سے منع کیا ہے۔ عورت کو بٹھا کر حد مارنی چاہیے

قاضی صاحب نے اِس کے خلاف کیا۔ ایک[1] لفظ سے ایک ہی حد لازم آتی ہے اور دو حدیں
لازم بھی آئیں تو ایک ساتھ دونوں کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ ایک حد کے بعد مجرم کو چھوڑ دینا
چاہیے کہ زخم بالکل بھر جائیں پھر دوسرے حد کی تعمیل ہو سکتی ہے۔ جسکو گالی دی گئی اُس نے
جب دعویٰ نہیں کیا تو قاضی صاحب کو مقدمہ کرنے کا کیا اختیار تھا؟ قاضی ابن ابی لیلیٰ
نہایت برہم ہوئے اور گورنر کوفہ سے جاکر شکایت کی کہ ابو حنیفہ نے مجھکو تنگ کر رکھا ہے۔
گورنر نے حکم بھیجدیا کہ ابو حنیفہ فتویٰ نہ دینے پائیں۔ امام صاحب اگرچہ حق کے خلاف کسی
حاکم و امیر کے حکم کی پروا نہیں کرتے تھے تاہم چونکہ فتویٰ دینا فرض کفایہ تھا اور کوفہ میں اور
بہت سے علما موجود تھے۔ اس لئے حاکم وقت کی اطاعت کو مقدم رکھا اور بغیر کسی عذر کے
حکم کی تعمیل کی۔ ایک دن گھر میں بیٹھے تھے اُن کی لڑکی نے مسئلہ پوچھا کہ میں آج روزہ سے
ہوں دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے سے اتر گیا۔ روزہ جاتا رہا یا باقی ہے؟
امام صاحب نے فرمایا کہ جان پدر اپنے بھائی حماد سے پوچھ میں فتویٰ دینے سے منع کر دیا گیا　دیانت
ہوں[1]۔ مورخ ابن خلکان نے اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے۔ کہ "اطاعت حکم اور امانت
کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے"۔ چند روز کے بعد گورنر کوفہ کو اتفاق سے فقہی مسائل
میں مشکلات پیش آئیں اور امام ابو حنیفہ کی طرف رجوع کرنا پڑا جس کی وجہ سے امام صاحب کو
پھر فتویٰ دینے کے عام اجازت حاصل ہو گئی۔

امام صاحب کے مناظرات میں کہیں کہیں ہم اُس ادّعا اور جوش مقابلہ کا اثر
پاتے ہیں جو بظاہر اُن کی تواضع اور بےنفسی کے خلاف ہے۔ لیکن یہ انسانی جذبات
ہیں جن سے کوئی شخص بری نہیں ہو سکتا۔ ہم نے امام شافعی۔ امام مالک۔ امام بخاری۔ امام
مسلم اور بڑے بڑے ائمہ کے مناظرات کتابوں میں پڑھے ہیں۔ اُن میں اس سے زیادہ
ادّعا اور حوصلہ مندی کا زور پایا جاتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر اس قسم کی باتیں بزرگوں کے حالات
میں مذکور نہ ہوتیں تو ہم کو شبہہ ہوتا کہ تذکرہ نویسوں نے اُن بزرگوں کی اصلی تصویر نہیں
دکھائی ہے بلکہ اپنی خوش اعتقادیوں کا خاکہ کھینچا ہے۔ ایک حکیم نے نہایت سچ کہا ہے کہ

---

[1] ابن خلکان ترجمہ محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ ۱۲

ہر کسی نامور یا مقتدا کے حالات لکھو تو اُس کے وہ خصائل بھی ضرور دکھاؤ جن میں انسانی فطرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس سے لوگوں کو اچھے کاموں میں اُن کی تقلید کی خواہش پیدا ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر بالکل فرشتہ بنا کر پیش کرو گے تو لوگ شاید اُن کی پرستش کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ لیکن اُن کی ریس کرنے کا خیال ہرگز نہ پیدا ہوگا۔ وہ سمجھیں گے کہ یہ شخص انسانی دائرہ سے باہر تھا۔ ہم انسان ہو کر کیونکر اُس کی تقلید کر سکتے ہیں"۔

استفتا۔

ایک دن حُسنِ اتفاق سے۔ امام سفیان ثوری۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ۔ شریک۔ امام ابوحنیفہ ایک مجلس میں جمع تھے۔ شائقین علم کو اس سے عمدہ کیا موقع مل سکتا تھا۔ ایک شخص نے آکر مسئلہ پوچھا کہ چند آدمی ایک جگہ مجتمع تھے۔ دفعۃً ایک سانپ نکلا اور ایک شخص کے بدن پر چڑھنے لگا اُس نے گھبرا کر پھینکدیا وہ دوسرے شخص پر جا گرا۔ اُس نے بھی اضطراب میں ایسا ہی کیا یوں ہی ایک دوسرے پر پھینکتے رہے یہاں تک کہ اخیر شخص کو اُس نے کاٹا اور وہ مرگیا۔ دیت کس پر لازم آئیگی"۔ یہ فقہ کا ایک دقیق مسئلہ تھا سب کو تامل ہوا کسی نے کہا سب کو دیت دینی ہوگی بعضوں نے کہا صرف پہلا شخص ذمہ دار ہوگا سب کے سب مختلف الرائے تھے اور باوجود بحث کے کچھ تصفیہ نہیں ہوتا تھا امام ابوحنیفہ چُپ تھے اور مسکراتے جاتے تھے۔ آخر سب نے اُن کی طرف خطاب کیا کہ آپ بھی تو اپنا خیال ظاہر کیجیے۔ امام صاحب نے فرمایا جب پہلے شخص نے دوسرے پر پھینکا اور وہ محفوظ رہا تو پہلا شخص بری الذمہ ہو چکا اسی طرح دوسرا اور تیسرا بھی۔ بحث اگر ہے تو صرف اخیر شخص کی نسبت ہے اُس کی دو حالتیں ہیں اگر اُس کے پھینکنے کے ساتھ ہی سانپ نے اُس شخص کو کاٹا تو اُس پر دیت لازم آئیگی۔ اور اگر کچھ وقفہ ہوا تو یہ شخص بھی بری الذمہ ہو چکا۔ اب اگر سانپ نے اُس کو کاٹا تو اُس کی خود غفلت ہے کہ اُس نے اپنی حفاظت میں جلدی اور تیز دستی کیوں نہ کی"۔ اس رائے سے سب نے اتفاق کیا اور امام کی جودت طبع کی تحسین کی۔

رائے وتدبیرو ذہانت وطباعی

رائے و تدبیر۔ عقل و فراست۔ ذہانت و طباعی امام صاحب کے وہ مشہور اوصاف ہیں جن کو موافق و مخالف سب نے تسلیم کیا ہے محمد انصاری کہا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کی ایک ایک حرکت یہاں تک کہ بات چیت۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ چلنے پھرنے میں دانشمندی کا

اثر پایا جاتا تھا۔ علی بن عاصم کا قول تھا کہ اگر آدھی دنیا کی عقل ایک پلہ میں اور ابوحنیفہ کی عقل دوسرے پلہ میں رکھی جاتی تو ابوحنیفہ کا پلہ بھاری رہتا۔ خارجہ بن مصعب کہا کرتے تھے کہ "میں کم و بیش ایک ہزار عالموں سے ملا ہوں جن میں عاقل صرف تین شخص دیکھے۔ ایک اُن میں ابوحنیفہ تھے"۔

ہمارے تذکروں اور رجال کی کتابوں میں علما کے وہ اوصاف جن کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تیزی ذہن۔ قوت حافظہ۔ بے نیازی۔ تواضع۔ قناعت زہد اتقا۔ غرض اس قسم کے اوصاف ہوتے ہیں لیکن عقل و رائے۔ فراست و تدبیر کا ذکر تک نہیں آتا گویا یہ باتیں دنیا داروں کے ساتھ مخصوص ہیں اسی بات کو علامہ ابن خلدون نے اس پیرایہ میں لکھا ہے کہ "علما کا گروہ انتظام اور ریاست سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا۔ اور یہ بالکل سچ ہے حالانکہ اگر سچ پوچھئے تو علما میں ان اوصاف کی زیادہ ضرورت ہے اسلام بخلاف اور مذہبوں کے دین کے ساتھ دنیوی انتظامات کا بھی متضمن ہے۔ خلفائے اولین کے حالات پڑھو۔ سیاست اور انتظام ملکی کے لحاظ سے تمام دنیا کے سلاطین اور فرمانرواؤں میں کون شخص اُن کا ہمسر کہا جا سکتا ہے؟"۔

بے شبہہ اس خصوصیت کے اعتبار سے امام ابوحنیفہ تمام فرقہ علما میں ممتاز ہیں کہ وہ مذہبی امور کے ساتھ دنیوی ضرورتوں کے بھی اندازہ داں تھے۔ یہی بات ہے کہ اُن کا مذہب سلطنت و حکومت کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام میں سلطنت و حکومت کے جو بڑے بڑے سلسلے قائم ہوئے۔ مذہبًا اکثر حنفی ہی تھے۔

امام ابوحنیفہ اگرچہ شاہی تعلقات سے آزاد رہے لیکن قوم اور ملک کے ساتھ اُن کے جو تعلقات تھے وہ خود ایک ملکی حیثیت رکھتے تھے۔ جس کے فرائض کو اُنھوں نے اس دانائی اور ہوشمندی کے ساتھ انجام دیا جو ایک مدبر سلطنت کے شایاں تھا۔ وہ اپنے معصروں کی طرح اپنے تلامذہ کو یہ نہیں سکھاتے تھے کہ زندگی کی ضروریات میں امیروں اور رئیسوں کی فیاضیوں کا منہ تکتے رہیں۔ وہ خود کسی کے دست نگر نہیں ہوئے اور شاگردوں کو بھی اسی کی تعلیم کی۔ ہم نے اُنکے شاگردوں کی مفصل فہرست دیکھی ہے۔ اُن میں اکثر ایسے

لوگ ہیں جو حلقۂ درس سے اُٹھکر ملکی عہدوں پر پہنچے اور نہایت قابلیت اور دیانت سے اپنی خدمتوں کو انجام دیا۔ قاضی ابو یوسف صاحب جو ہارون الرشید کے عہد میں صیغۂ قضا کے وزیر تھے اور جن کی حسن تدبیر و انتظام نے اس صیغہ کو اس قدر وسیع با قاعدہ مرتب کر دیا کہ اُس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور زمانہ مابعد میں بھی اُس سے بڑھکر نہوسکا یہ امام ابو حنیفہ ہی کی صحبت کا فیض تھا۔

یہ ضرور ہے کہ ملکی تعلقات کے ساتھ مذہب و اخلاق کے فرایض کو سنبھالنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن امام صاحب اس سے بیخبر نہ تھے وہ شاگردوں کو ہمیشہ ایسی ہدایتیں کرتے تھے جن کی پابندی سے دنیا و دین دونوں حاصل ہوں جو اس آیت کی تفسیر ہے اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ قاضی ابو یوسف کو امام صاحب کی زندگی میں اگرچہ دربار سے کوئی تعلق نہیں پیدا ہوا تھا۔ تاہم اُن کی قابلیت اور امام صاحب کی تعلیم نے جو لیاقت اُن میں پیدا کر دی تھی اُس کے جوہر صاف نظر آتے تھے اسی لحاظ سے امام صاحب نے اُن کو کچھ ہدایتیں لکھ کر دیں جو تمام مہمات دینی اور دنیوی کے لئے دستور العمل تھیں۔ یہ تحریر[1] کتابوں میں منقول ہے۔ افسوس ہے کہ تطویل کے لحاظ سے ہم اُس کو بتمامہا نہیں نقل کر سکتے تاہم موقع اور مقام کی رعایت سے اُس کا انتخاب دکھانا ضرور ہے

قاضی ابو یوسف کیلئے جو ہدایت نامہ لکھا تھا اُسکے بعض مقامات

اُس تحریر میں پہلے سلطان وقت کے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "بادشاہ کے پاس بہت کم آمد و رفت رکھنا۔ اُس سے ہر وقت اسطرح پر خطر رہنا جیسا انسان آگ سے احتیاط رکھتا ہے جب تک کوئی خاص ضرورت نہو دربار میں نہ جانا کہ اپنا اعزاز اور وقار قایم رہے۔ اگر اتفاق سے دربار میں ایسے لوگ موجود ہوں جن سے تم کو واقفیت نہ ہو تو اور بھی پرہیز کرنا کیونکہ جب اُنکا رتبہ معلوم نہیں تو ممکن ہے کہ مخاطبت اور گفتگو میں اُن سے جو برتاؤ کیا جائے اُن کی شان کے مناسب نہ ہو۔ وہ اگر تم سے زیادہ بلند رتبہ ہیں اور تم نے اس کا لحاظ نہیں کیا تو بے تمیزی سمجھی جائیگی۔ اگر معمولی آدمی ہیں اور تم نے زیادہ تعظیم و تکریم کی تو بادشاہ کی آنکھ میں تمہاری ذلت ہوگی۔ بادشاہ اگر تم کو عہدۂ قضا

[1] الاشباہ والنظائر کے اخیر میں یہ وصیت بتمامہا مذکور ہے اور میں نے اُسی سے التقاط کیا ہے ۱۲

پر مقرر کرنا چاہے تو پہلے دریافت کر لینا کہ وہ تمہارے طریقہ اجتہاد سے موافق ہے یا نہیں ایسا نہ ہو کہ سلطنت کے دباؤ سے تم کو اپنی رائے کے خلاف عمل کرنا پڑے جس عہدہ اور خدمت کی تم میں قابلیت نہو اُس کو ہرگز نہ قبول کرنا"

ان ہدایتوں میں اگرچہ پادشاہ کی حرمت و توقیر کی بہت تاکید کی ہے لیکن اظہار حق کے موقع پر پوری آزادی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اخیر میں لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص شریعت میں کسی بدعت کا موجد ہو تو علانیہ اُس کی غلطی کا اظہار کرنا۔ کہ اور لوگوں کو اُس کی تقلید کی جرأت نہو۔ اس بات کی کچھ پروا نہ کرنا کہ وہ شخص جاہ و حکومت رکھتا ہے۔ کیونکہ اظہار حق میں خدا تمہارا مددگار ہوگا۔ اور وہ اپنے دین کا آپ محافظ و حامی ہے۔ خود پادشاہ سے اگر نامناسب حرکت صادر ہو تو صاف کہدینا کہ گو میں عہدہ و خدمت کے لحاظ سے آپ کا مطیع ہوں تاہم آپ کو آپ کی غلطی پر مطلع کر دینا میرا فرض ہے پھر بھی نہ مانے تو تنہائی میں سمجھانا کہ آپ کا یہ فعل قرآن مجید اور احادیث نبوی کے خلاف ہے۔ اگر سمجھ گیا تو خیر ورنہ خدا سے دعا کرنا کہ اُسکی شر سے تم کو محفوظ رکھے"

زندگی کے معمولی کاروبار کے متعلق بھی نہایت عمدہ ہدایتیں کیں ہیں چنانچہ تحریر فرماتے ہیں کہ "تحصیل علم کو سب پر مقدم رکھنا اس سے فراغت ہو چکے تو جائز ذریعوں سے دولت حاصل کرنا۔ کیونکہ ایک وقت علم و دولت دونوں کی تحصیل نہیں ہو سکتی۔ پھر نکاح کرنا۔ لیکن اُس وقت جب یہ یقین ہو کہ اہل عیال کی تمام ذمہ واریاں اُٹھا سکوگے۔ ایسی عورت سے شادی نکرنا جو دوسرے شوہر سے اولاد رکھتی ہو۔ عام آدمیوں اور خصوصاً دولتمندوں سے کم میل جول رکھنا۔ ورنہ اُن کو گمان ہوگا کہ تم اُن سے کچھ توقع رکھتے ہو۔ اور اس خیال سے وہ رشوت دینے پر آمادہ ہوں گے۔ بازار میں جانا۔ دوکانوں پر بیٹھنا۔ راستہ یا مسجد میں کوئی چیز کھا لینے۔ سقایات یا سقاؤں کے ہاتھ سے پانی پی لینا۔ ان باتوں سے نہایت احتراز ہے۔ کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو صرف سُوال کا جواب دو۔ اپنی طرف سے کچھ نہ بڑھاؤ عقائد کے متعلق عوام سے گفتگو نہیں کرنی چاہئے۔ شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص اور محبت سے پیش آؤ کہ کوئی غیر دیکھے تو سمجھے کہ تمہاری اولاد ہیں۔ عام اور معمولی رتبہ کے

لوگ مناظرہ کرنا چاہیں تو احتراز کرو۔ کسی شہر میں جانا ہو تو وہاں کے علما و فضلاء سے اس طرح ملو کہ اُن کو رقابت کا خیال نہ ہو۔ علمی تذکرہ آئے تو جو بات کہو خوب سوچ سمجھ کر کہو اور وہی کہو جس کا کافی ثبوت دے سکتے ہو۔ مناظرہ کے وقت نہایت جرأت و استقلال سے کام لو ورنہ دل میں ذرا بھی خوف ہوگا تو خیالات مجتمع نہ رہ سکینگے اور زبان میں لغزش ہوگی۔ جو لوگ دأب مناظرہ سے واقف نہیں یا مکابرہ کرنا چاہتے ہیں اُن سے ہرگز گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ مناظرہ کے وقت غصہ نہ کرنا چاہیے۔ ہنسا کم چاہیے۔ زیادہ ہنسی سے دل افسردہ ہوتا ہے۔ جو کام کرو اطمینان اور وقار کے ساتھ کرو۔ کوئی شخص جب تک سامنے سے نہ پکارے کبھی جواب نہ دو۔ کیونکہ پیچھے سے پکارنا جانوروں کے لیے مخصوص ہے رستہ چلو تو دائیں بائیں نہ دیکھو۔ حمام میں جاؤ تو عام آدمیوں کی بہ نسبت زیادہ اجرت دو۔ صبح اور دوپہر کے وقت حمام میں نہ جاؤ۔ گفتگو میں سختی نہ ہو اور آواز بلند نہ ہونے پائے کوئی چیز خریدنی ہو تو خود بازار نہ جاؤ۔ بلکہ نوکر بھیجکر منگوا لو۔ خانگی کاروبار دیانتدار نوکروں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیے۔ کہ تم کو اپنے مشاغل کے لئے کافی وقت اور فرصت ہاتھ آئے بادشاہ کے قریب سکونت نہ اختیار کرو۔ ہر بات سے بے پروائی اور بے نیازی ظاہر ہو اور فقر کی حالت میں بھی وہی استغنا قائم رہے۔ عام آدمیوں میں بیٹھکر وعظ نہ کہو۔ کیونکہ ایسے موقع پر واعظ اکثر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے۔ شاگردوں میں کسی کو فقہ کے درس کی اجازت دو تو خود بھی اُس کی درسگاہ میں شریک ہو کہ اُسکے متعلق رائے قایم کرسکو۔ وہ اگر کبھی غلطی کر جائے تو بتا دو ورنہ تمہارے چپ رہنے سے لوگوں کو گمان ہوگا کہ اُس نے جو کہا صحیح کہا۔ فقہ کے سوا اور علوم کی مجلس ہو تو خود نہ جاؤ۔ بلکہ اپنے معتمد دوستوں یا شاگردوں کو بھیجدو کہ وہ آکر تم سے پورے حالات بیان کریں "

"ہر بات میں تقویٰ اور امانت کو پیش نظر رکھو۔ خدا کے ساتھ دل سے وہی معاملہ رکھو جو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو جسوقت اذان کی آواز آئے فوراً نماز کیلئے طیار ہو جاؤ ہر مہینہ میں دو چار دن روزہ کے لئے مقرر کرلو۔ نماز کے بعد ہر روز کسیقدر وظیفہ پڑھا کرو۔ قرآن کی تلاوت قضا نہ ہونے پائے۔ دنیا پر بہت نہ مایل ہو۔ اکثر قبرستان میں نکل جایا کرو

لہو لعب سے پرہیز رکھو۔ ہمسایہ کی کوئی بُرائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو۔

اہل بدعت سے بچے رہو۔ نماز میں جب تک تم کو لوگ خود امام نہ بنائیں امام نہ بنو۔ جو لوگ تم سے ملنے آئیں اُن کے سامنے علمی تذکرہ کرو۔ اگر وہ اہل علم ہوں گے تو فائدہ اٹھائیں گے ورنہ کم از کم اُن کو تم سے محبت ہوگی۔"

عبد العزیز بن رواد کو خلیفہ نے دربار میں بلایا۔ وہ امام صاحب کے شاگرد تھے مشورہ کے لئے اِن کے پاس آئے اور کہا کہ "خلیفہ نے طلب کیا ہے میں چاہتا ہوں کہ اُس کے سامنے وعظ کہوں مگر کیا کہوں اور کس طریقہ سے کہوں۔ اس میں آپ کی ہدایت چاہتا ہوں۔

امام صاحب نے فرمایا یہ کہنا کہ "اے امیر المومنین دُنیا کے طلب کرنے کی تین غرضیں ہوسکتی ہیں۔ عزت۔ ملک۔ مال یہ سب آپ کو حاصل ہیں اب تقویٰ اور عمل صالح بھی اختیار کیجئے کہ دنیا و آخرت دونوں دولتیں حاصل ہوں۔

اس موقع پر امام صاحب کے حکیمانہ مقولے بھی سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ "جس شخص کو علم نے بھی معاصی اور فواحش سے نہ باز رکھا اُس سے زیادہ زیاں کار کون ہوگا۔" "جو شخص علم دین میں گفتگو کرے اور اُس کو یہ خیال نہ ہو کہ ان باتوں کی باز پرس ہوگی وہ مذہب اور خود اپنے نفس کی قدر نہیں جانتا۔" اگر علما خدا کے دوست نہیں ہیں تو عالم میں خدا کا کوئی دوست نہیں۔" جو شخص قبل از وقت ریاست کی تمنا کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے۔" جو شخص علم کو دنیا کے لئے سیکھتا ہے علم اُس کے دل میں جگہ نہیں پکڑتا۔" سب سے بڑی عبادت ایمان اور سب سے بڑا گناہ کفر ہے پس جو شخص افضل ترین عبادت کا پابند اور بدترین معاصی سے محترز ہے اُس کی مغفرت کی بہرحال امید کیجا سکتی ہے۔" جو شخص حدیث سیکھتا ہے اور اُس سے استنباط مسائل نہیں کرتا وہ ایک عطار ہے جس کے پاس دوائیں ہیں لیکن یہ نہیں جانتا کہ کون کس مرض کے لئے ہے۔" جو شخص علم کا مذاق نہیں رکھتا اُس کے آگے علمی گفتگو کرنی اُس کو اذیت دینی ہے۔" اپنے دوست (النفس) کے لئے گناہ جمع کرنے اور دشمن (ورثا) کے لئے مال فراہم کرنا کیسی غلطی ہے۔"

ایک شخص نے پوچھا فقہ کے حاصل ہونے میں کیا چیز مُعین ہو سکتی ہے امام صاحب نے فرمایا "دلجمعی"۔ اُس نے عرض کی کہ دلجمعی کیونکر حاصل ہو ارشاد ہوا کہ تعلقات کم کئے جائیں پوچھا کہ تعلقات کیونکر کم ہوں۔ جواب دیا کہ "انسان ضروری چیزیں لیلے اور غیر ضروری چھوڑ دے"۔ ایک بار کسی نے سوال کیا کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی لڑائیوں کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ فرمایا کہ "قیامت میں جن باتوں کی پرسش ہوگی مجھکو اُن کا ڈر لگا رہتا ہے۔ ان واقعات کو خدا مجھ سے نہ پوچھے گا۔ اِس لئے اُس پر توجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں"۔

اِس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ وہ اس بحث کے متعلق اپنی رائے نہیں رکھتے تھے۔ خود اُن کا قول ہے کہ حضرت علی کی نظیر اگر ہمارے سامنے موجود نہوتی تو ہم نہ بتا سکتے کہ باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے البتہ ان باتوں کو اسلام کا ایک ضروری مسئلہ قرار دینا اور اُس پر بحثوں کا دفتر طیار کرنا ایک فضول کام ہے۔ اور اسی کیطرف امام صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص تحصیل علم کی غرض سے امام صاحب کے پاس حاضر ہوا اور سفارشی خط پیش کیا۔ امام صاحب نے فرمایا "علم میں سعی سفارش کا کام نہیں علما کا خود فرض ہے کہ اُن کو جو کچھ آتا ہو دوسروں کو بھی بتائیں علم کے دربار میں خاص و عام کی کوئی تفریق نہیں"۔ ایک دن گورنر کوفہ نے کہا آپ ہم سے کیوں الگ رہتے ہیں۔ فرمایا "روٹی کا ایک ٹکڑا اور معمولی کپڑا امن و عافیت سے ملا جائے تو اُس عیش سے بہتر ہے جس کے بعد ندامت اُٹھانی پڑے"۔

اسی مضمون کو ایک شاعر نے نہایت خوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

دو قرص ناں اگر از گندم ست یا از جو — سہ تائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بچار گوشۂ دیوار خود بخاطر جمع — کہ کس نگوید ازیں جا بخیز و آنجا رو
ہزار بار فزوں تر بنزد ابن یمین — ز فرّ مملکتِ کیقباد و کیخسرو

امام صاحب کے بعض اشعار

امام صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن تشبیب و غزل کی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ وعظ و پند کے طور پر۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ومن المروۃ للفتی ، ما عاش دارا فاخرۃ ، فاشکر اذا اوتیتھا ، واعمل لدار الآخرۃ ،
یعنی انسان جب تک زندہ ہے عزت و آبرو کے لئے اُس کو اچھا مکان چاہیے۔ ایسا مکان نصیب ہو تو شکر کرنا چاہیے اور عاقبت کے مکان کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔"

ذہانت و طباعی

امام صاحب کی ذہانت اور طباعی عموماً ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ اُن کا اجمالی ذکر بھی کہیں آجاتا ہے تو ساتھ ہی یہ صفت بھی ضرور بیان کی جاتی ہے۔ علامہ ذہبی نے عبرا فی اخبار من غبر میں اُن کا ترجمہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے تاہم اس فقرہ کو نہ چھوڑ سکے کہ کان من اذکیاء بنی آدم۔ یعنی" اولاد آدم میں جو نہایت ذکی گذرے ہیں امام ابوحنیفہ اُن میں شمار کئے جاتے ہیں"۔ مشکل سے مشکل مسئلوں میں اُن کا ذہن اس تیزی سے لڑتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اکثر موقعوں پر اُن کے معصر جو معلومات کے لحاظ سے اُن کے ہمسر تھے موجود ہوتے تھے۔ اُن کو اصل مسئلہ بھی معلوم ہوتا تھا لیکن جو واقعہ درپیش ہوتا تھا اُس سے مطابق کر کے فوراً جواب بتا دینا امام صاحب ہی کا کام تھا

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہوا اور قسم کھا کر کہا کہ" جب تک تو مجھ سے نہ بولے گی میں تجھ سے کبھی نہ بولوں گا"۔ عورت تند مزاج تھی اُس نے بھی قسم کھالی اور وہی الفاظ دہرائے۔ جو شوہر نے کہے تھے۔ اُس وقت غصہ میں کچھ نہ سوجھا مگر پھر خیال آیا تو دونوں کو نہایت افسوس ہوا۔ شوہر امام سفیان ثوری کے پاس گیا اور صورت واقعہ بیان کی سفیان نے کہا" قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ اِس سے چارہ نہیں"۔ وہ مایوس ہو کر اُٹھا اور امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ للہ آپ کوئی تدبیر بتائیے۔ امام صاحب نے فرمایا جاؤ شوق سے باتیں کرو کسی پر کفارہ نہیں ہے۔ امام سفیان ثوری کو معلوم ہوا تو نہایت برہم ہوئے اور امام ابوحنیفہ سے جا کر کہا کہ آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتا دیا کرتے ہیں۔ امام صاحب نے اُس شخص کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم دوبارہ واقعہ کی صورت بیان کر جاؤ۔ اُس نے اعادہ کیا۔ امام صاحب سفیان کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ میں نے پہلے جو کہا تھا اب بھی کہتا ہوں سفیان نے کہا کیوں؟ فرمایا کہ جب عورت نے شوہر کو مخاطب کر کے وہ الفاظ کہے تو عورت کی طرف سے بولنے کی ابتدا ہو چکی۔ پھر قسم کہاں باقی رہی[1]"۔ سفیان نے کہا حقیقت میں

[1] اس واقعہ کو امام رازی نے تفسیر کبیر میں نقل کیا ہے۔ ۱۲

آپ کو جو بات وقت پر سوجھ جاتی ہے ہم لوگوں کا وہاں تک خیال بھی نہیں پہنچتا۔

کوفہ میں ایک شخص نے بڑی دھوم دھام سے ایک ساتھ اپنے دو بیٹوں کی شادی کی ولیمہ کی دعوت میں شہر کے تمام اعیان و اکابر کو مدعو کیا مسعر بن کدام حسن بن صالح سفیان ثوری۔ امام ابوحنیفہ شریک دعوت تھے لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ دفعتاً صاحب خانہ بدحواس گھر سے نکلا۔ اور کہا غضب ہو گیا! لوگوں نے کہا خیر ہے؟ بولا زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بیبیاں بدل گئیں۔ جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اُسکا شوہر نہ تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ سفیان نے کہا امیر معاویہ کے زمانہ میں بھی ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔ اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا۔ البتہ دونوں کو مہر لازم ہو گا۔ مسعر بن کدام امام ابوحنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ امام صاحب نے کہا شوہر خود میرے سامنے آئیں تو جواب دوں۔ لوگ جا کر بلا لائے امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ رات جو عورت تمہارے ساتھ رہی وہی تمہارے نکاح میں رہے تو تم کو پسند ہے۔ دونوں نے کہا "ہاں"۔ امام صاحب نے کہا تو اپنی بیبیوں کو جن سے تمہارا نکاح بندھا تھا طلاق دیدو اور ہر شخص اُس عورت سے نکاح پڑھا لے جو اُس کے ساتھ ہم بستر رہ چکی ہے۔

سفیان نے جو جواب دیا اگرچہ فقہ کی رو سے وہ بھی صحیح تھا کیونکہ یہ صورت وطی بالشبہہ کی ہے جس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ لیکن امام صاحب نے مصلحت کو پیش نظر رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں نکاح قائم رہنا غیرت و حمیت کے خلاف ہو گا۔ کسی مجبوری سے زوجین نے تسلیم بھی کر لیا تو دونوں میں وہ خلوص و اتحاد نہ پیدا ہو گا جو تزویج کا مقصود اصلی ہے۔ اس کے ساتھ مہر کی بھی تخفیف ہے۔ کیونکہ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے تو صرف آدھا مہر لازم آتا ہے۔

لیث بن سعد جو مصر کے مشہور امام تھے اُن کا بیان ہے کہ میں ابوحنیفہ کا ذکر اکثر سنا کرتا تھا اور اُن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق تھا حج کی تقریب سے مکہ معظمہ جانا ہوا۔ اتفاق سے ایک مجلس میں پہنچا۔ دیکھا تو بڑا ہجوم ہے ایک شخص صدر کی جانب بیٹھا ہے اور لوگ اُس سے

مسئلے پوچھ رہے ہیں۔ ایک شخص نے بڑھکر کہا "یا ابا حنیفہ"! (یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اُن کو پہچانا۔) امام ابوحنیفہ اُس کی طرف متوجہ ہوئے اُس نے کہا "میرا ایک بدمزاج بیٹا ہے اُس کی شادی کر دیتا ہوں تو بیوی کو طلاق دے دیتا ہے۔ لونڈی خرید تا ہوں تو آزاد کر دیتا ہے۔ فرمایئے کیا تدبیر کروں؟" امام ابوحنیفہ نے برجستہ کہا کہ "تم اس کو ساتھ لیکر بازار میں جہاں لونڈیاں بکتی ہیں جاؤ۔ اور جو لونڈی اُس کو پسند آئے خرید کر اُس کا نکاح پڑھا دو۔ اب اگر وہ آزاد کریگا تو نہیں کر سکتا۔ کیونکہ لونڈی اُس کی ملک نہیں طلاق دیگا تو تمہارا کچھ نقصان نہیں۔ تمہاری لونڈی کہیں نہیں گئی۔" سعد کہتے ہیں کہ مجھ کو جواب پر تو کم لیکن حاضر جوابی پر بہت تعجب ہوا۔

ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا۔ امام ابوحنیفہ سے عداوت رکھتا تھا۔ ایک دن امام صاحب حسب الطلب دربار میں گئے۔ ربیع بھی حاضر تھا منصور سے کہا کہ "حضور! یہ شخص امیرالمومنین کے جد بزرگوار (عبداللہ بن عباس) کی مخالفت کرتا ہے۔ انکا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور دو ایک روز کے بعد انشاء اللہ کہہ لے تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائیگا اور قسم کا پورا کرنا کچھ ضرور نہ ہوگا۔ ابوحنیفہ اِس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انشاء اللہ کا لفظ قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزء قسم سمجھا جائیگا۔ ورنہ لغو اور بے اثر ہے"۔ امام صاحب نے کہا امیرالمومنین! ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کا کچھ اثر نہیں منصور نے کہا یہ کیونکر؟ امام صاحب نے کہا ان کا گمان ہے کہ جو لوگ دربار میں آپکے ہاتھ پر بیعت خلافت کرتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں گھر پر جا کر انشاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں جس سے قسم بے اثر ہو جاتی ہے۔ اور اُن پر شرعاً کچھ مواخذہ نہیں رہتا منصور ہنس پڑا اور ربیع سے کہا کہ تم ابوحنیفہ کو نہ چھیڑو ان پر تمہارا داؤں نہیں چل سکتا۔ امام صاحب دربار سے نکلے تو ربیع نے کہا آج تو آپ میری جان ہی لے چکے تھے۔ فرمایا "یہ تو تمہارا ارادہ تھا میں نے صرف مدافعت کی"۔

ایک دفعہ بہت سے خارجی امام صاحب کے گھر پر چڑھ آئے۔ اور کہا کہ کفر سے توبہ کرو۔ امام صاحب نے کہا "ہاں میں تمہارے کفر سے توبہ کرتا ہوں"۔ خارجیوں کا اعتقاد ہے کہ گناہ کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے یعنی گناہ اور کفر ایک چیز ہے۔ امام صاحب کا مطلب یہ تھا کہ جس چیز

کو تم کفر سمجھتے ہو میں اُس سے توبہ کرتا ہوں۔ کسی نے اُن (خارجیوں) سے جا لگایا کہ ابوحنیفہ نے تم لوگوں کو دھوکا دیا۔ اُن کا مطلب اور تھا۔ خارجیوں نے امام صاحب کو پکڑا کہ تم نے تاویل کیوں کی امام نے کہا تم کو یقین ہے یا محض گمان کی بنا پر میری نسبت ایسا خیال کرتے ہو بولے کہ نہیں گمان ہی گمان ہے"۔ امام نے کہا تم کو خود توبہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے۔ ان بعض الظن اثم۔

ایک دن مسجد میں تشریف رکھتے تھے شاگردوں کا مجمع تھا دفعۃً خارجیوں کا ایک گروہ مسجد میں گھس آیا لوگ بھاگ چلے امام صاحب نے روکا اور تسلی دی کہ دوڑو نہیں اطمینان سے بیٹھ جاؤ ایک خارجی جو سب کا سردار تھا امام صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ تم کون لوگ ہو۔ امام صاحب نے فرمایا مستجیر ہیں اور خدا نے فرمایا ہے کہ وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ یعنی "مشرکین میں سے کوئی شخص اگر پناہ چاہے تو اُسے پناہ دو تاکہ وہ خدا کا کلام سنے پھر اُس کو اُس کے مامن تک پہنچا دو"۔ خارجی اپنے سوا مسلمانوں کے تمام فرقوں کو مشرک اور کافر سمجھتے ہیں اور واجب القتل جانتے ہیں۔ اس موقع پر وہ اسی نیت سے آئے تھے کہ امام ابوحنیفہ اپنا عقیدہ بیان کریں تو کفر کا الزام لگا کر اُنکو قتل کر دیں لیکن امام صاحب کے الزامی جواب نے اُن کو بالکل مجبور کر دیا۔ چنانچہ اُن کے سردار نے ساتھیوں سے کہا کہ ان کو قرآن پڑھ کر سنا دو اور ان کو انکے گھر پہنچا آؤ"۔

ابوالعباس جو منصور کے دربار میں ایک معزز درجہ رکھتا تھا۔ امام صاحب کا دشمن تھا اور ہمیشہ اُن کو ضرر پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا۔ ایک دن امام صاحب کسی ضرورت سے دربار میں گئے اتفاق سے ابوالعباس بھی حاضر تھا۔ لوگوں سے کہا آج ابوحنیفہ میرے ہاتھ سے بچکر نہیں جا سکتے۔ امام صاحب کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ ابوحنیفہ! امیر المومنین کبھی کبھی ہم لوگوں کو بلا کر حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی گردن مارو۔ ہم کو مطلق معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شخص واقعی مجرم ہے یا نہیں۔ ایسی حالت میں ہم کو اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے یا انکار کرنا چاہیئے"۔ امام صاحب نے کہا "تمہارے نزدیک خلیفہ کے احکام حق ہوتے ہیں یا باطل"۔ منصور کے سامنے کس کی تاب تھی کہ احکام خلافت کی نسبت ناجائز ہونے کا احتمال ظاہر کر سکتا۔ ابوالعباس کو مجبوراً کہنا پڑا

کہ حق ہوتے ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا پھر حق کی تعمیل میں پوچھنا کیا؟

ایک شخص نے قسم کھائی کہ آج اگر میں غسل جنابت کروں تو میری بیوی کو تین طلاق ہے تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ آج کی کوئی نماز قضا ہو تو میری زوجہ مطلقہ ہے۔ پھر کہا کہ اگر آج میں اپنی بیوی کے ساتھ صحبت نہ کروں تو اُس کو طلاق ہے۔ لوگوں نے امام صاحب سے اگر مسئلہ پوچھا فرمایا کہ نماز عصر پڑھکر بیوی سے ہم صحبت ہو۔ اور غروب کے بعد غسل کر کے فوراً مغرب کی نماز پڑھ لے اس صورت میں سب شرطیں پوری ہو گئیں بیوی سے ہم صحبت بھی ہوا۔ نماز بھی قضا نہیں کی غسل جنابت کیا تو اُس وقت کیا کہ دن گذر چکا تھا۔

ایک دفعہ ایک شخص امام صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ "میں نے کچھ روپے ایک جگہ احتیاط سے رکھدیئے تھے اب یاد نہیں آتا کہ کہاں رکھے تھے۔ مجھ کو سخت ضرورت درپیش ہے کوئی تدبیر بتائیے۔ امام نے فرمایا "بھائی یہ مسئلہ تو فقہ میں کہیں مذکور نہیں مجھ سے کیا پوچھنے آئے ہو؟" اُس نے زیادہ لجاجت کی تو کہا کہ آج ساری رات نماز پڑھو۔ اُس نے جاکر نماز پڑھنی شروع کی۔ اتفاق یہ کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اُس کو یاد آگیا کہ روپے فلاں جگہ رکھے تھے دوڑا ہوا امام صاحب کے پاس آیا اور عرض کی کہ آپ کی تدبیر راست آئی۔ فرمایا کہ ہاں شیطان کب گوارا کرتا کہ تم رات بھر نماز پڑھتے رہو۔ اس لیے اُس نے جلد یاد دلادیا۔ تاہم تم کو مناسب تھا کہ اس کے شکریہ میں شب بیداری کرتے اور نمازیں پڑھتے۔

ایک اور دن ایک شخص نے آکر کہا کہ میں نے کچھ اسباب گھر کے کسی کونے میں گاڑ دیا تھا۔ اب یاد نہیں آتا کہ کہاں گاڑا تھا۔ کیا کروں۔" امام صاحب نے کہا "تم کو یاد نہیں تو مجھکو اور بھی نہ یاد ہونا چاہیئے۔" وہ رونے لگا۔ امام صاحب کو رحم آیا۔ چند شاگرد ساتھ لیے اور اُس کے گھر پر گئے شاگردوں سے کہا کہ "اگر یہ تمہارا گھر ہوتا اور تم حفاظت کیلئے کوئی چیز چھپا کر رکھتے تو کہاں رکھتے"۔ سب نے اپنے اپنے قیاس سے مختلف موقعے بتائے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ انہیں تین چار جگہوں میں سے کہیں نہ کہیں گاڑا ہوگا۔ اُن کے کھدوانے کا حکم دیا۔ خدا کی شان تیسری جگہ کھودی تو اسباب بجنسہٖ مدفون ملا۔

ظرافت

امام صاحب اگرچہ نہایت ثقہ، متین، باوقار تھے۔ تاہم ذہانت کی شوخیاں کبھی کبھی

ظرافت کا رنگ دکھاتی تھیں۔ ایک دن اصلاح بنوا رہے تھے حجام سے کہا کہ "سفید بالوں کو چن لینا"۔ اُس نے عرض کی کہ جو بال چنے جاتے ہیں اور زیادہ نکلتے ہیں۔ امام صاحب نے کہا یہ قاعدہ ہے تو سیاہ بالوں کو چن لو کہ اور زیادہ نکلیں"۔ قاضی شریک نے یہ حکایت سنی تو کہا کہ "ابو حنیفہ نے حجام کے ساتھ بھی قیاس کو نہ چھوڑا"۔

امام صاحب کے محلہ میں ایک پسنہار رہتا تھا۔ جو نہایت متعصب شیعہ تھا۔ اُس کے پاس دو خچر تھے۔ تعصب سے ایک کا ابو بکر اور دوسرے کا عمر نام رکھا تھا۔ اتفاق سے ایک خچر نے لات ماری کہ اُس کا سر پھٹ گیا اور اُسی صدمہ سے مر گیا۔ محلہ میں اُسکا چرچا ہوا۔ امام صاحب نے سنا تو کہا دیکھنا اُسی خچر نے مارا ہو گا جس کا نام اُس نے عمر رکھا تھا۔ لوگوں نے دریافت کیا تو واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔

کوفہ میں ایک غالی تھا جو حضرت عثمان کی نسبت کہا کرتا تھا کہ یہودی تھے"۔ امام صاحب ایک دن اُس کے پاس گئے اور کہا کہ تم اپنی بیٹی کی نسبت ڈھونڈتے تھے ایک شخص موجود ہے جو شریف بھی ہے دولتمند بھی ہے۔ اس کے ساتھ پرہیزگار قایم اللیل حافظ قرآن ہے"۔ شیعی نے کہا تو اس سے بڑھکر کون ملے گا آپ ضرور شادی ٹھہرا دیجیے۔ امام صاحب نے کہا "صرف اتنی بات ہے کہ مذہبًا یہودی ہے"۔ وہ نہایت برہم ہوا اور کہا "سبحان اللہ آپ یہودی سے رشتہ داری کرنے کی رائے دیتے ہیں"۔ امام صاحب نے فرمایا "کیا ہوا خود پیغمبر صاحب نے جب یہودی کو (تمہارے اعتقاد کے موافق) داماد بنایا تو تم کو کیا عذر ہے"۔ خدا کی قدرت اتنی بات سے اُس کو تنبیہ ہو گئی اور اپنے عقیدہ سے توبہ کی ؂

تمت

فہرست مضامین سیرۃ النعمان حصہ (۲) دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حصہ دوم

امام صاحب کی تصنیفات

فقہ اکبر

امام صاحب کی طرف جو کتابیں منسوب ہیں۔ اُن کے یہ نام ہیں۔ فقہ اکبر۔ العالم والمتعلم۔ مسند۔ فقہ اکبر عقایدؔ کا ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ مسائل اور ترتیب قریب قریب وہی ہے۔ جو عقاید نسفی وغیرہ کی ہے۔ یہ رسالہ چھپ گیا ہے اور ہر جگہ مل سکتا ہے۔ لوگوں نے اُس پر شرحیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً محی الدین محمد بن بہاء الدین المتوفی ۹۵۳ھ۔ مولی الیاس بن ابراہیم السینوبی۔ مولی احمد بن محمد المغنیساوی۔ حکیم اسحق۔ شیخ اکمل الدین۔ ملا علی القاری۔ ملا علی قاری کی شرح متداول ہے بعض اور شرحوں کے نسخے بھی جابجا قلمی پائے جاتے ہیں۔ حکیم اسحق کی شرح کو ابو البقاء احمدی نے ۹۱۸ھ میں نظم کیا۔ اور اصل کتاب کو ابراہیم بن حسام نے جو شریفی کے نام سے مشہور ہیں۔

العالم والمتعلم

العالم والمتعلم۔ سوال وجواب کے طور پر ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ مسند کے متعدد نسخے ہیں جن کو ابو المؤید محمد بن محمود الخوارزمی المتوفی ۶۶۵ھ نے

یکجا جمع کر دیا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ بلادِ شام میں بعض جاہلوں کو میں نے یہ کہتے سُنا کہ امام ابوحنیفہ کو فنِ حدیث میں چنداں دخل نہ تھا اور اسی وجہ سے حدیث میں اُن کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس پر مجھ کو حمیّت مذہبی کا جوش ہوا اور میں نے چاہا کہ اُن تمام مسندوں کو یکجا کر دوں جو علماء نے امام ابوحنیفہ کی حدیثوں سے مرتب کئے ہیں اور جن کی تفصیل حسب ذیل ہے (۱) مسند حافظ ابومحمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی البخاری المعروف بعبداللہ الاوستاد (۲) مسند امام ابوالقاسم طلحہ بن محمد بن جعفر الشاہد (۳) مسند حافظ ابوالحسن محمد بن المظفر بن موسیٰ بن عیسیٰ۔ (۴) مسند حافظ ابونعیم الاصفہانی (۵) مسند شیخ ابوبکر محمد بن عبدالباقی محمد الانصاری (۶) مسند امام ابواحمد عبداللہ بن عدی الجرجانی (۷) مسند امام حافظ عمر بن حسن الاشنانی۔ (۸) مسند ابوبکر احمد بن محمد بن خالد الکلاعی (۹) مسند امام ابویوسف قاضی (۱۰) مسند امام محمد (۱۱) مسند حماد بن امام ابوحنیفہ (۱۲) آثار امام محمد (۱۳) مسند امام ابوالقاسم عبداللہ بن العوام العدی۔

ابوالمؤید الخوارزمی نے جن مسندوں کے نام لئے ہیں اُن کے سوا اور بھی مسانید ہیں مثلاً مسند حافظ ابوعبداللہ حسین بن محمد خسرو البلخی المتوفی ۵۲۳ھ مسند حصفکی جس کی شرح مُلا علی قاری نے لکھی۔ مسند ماوردی۔ مسند ابن البزازی المتوفی ۸۲۷ھ۔ ان مسندوں کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔

جو لوگ امام صاحب کے سلسلۂ کمالات میں تصنیف و تالیف کا وجود بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ انہیں مفصلہ بالا کتابوں کو شہادت میں پیش کرتے ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ان تصنیفات کو امام صاحب کی طرف منسوب کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امام صاحب کی زندگی میں ایک مجموعۂ فقہ مرتب ہو گیا تھا جس کے حوالے عقود الجمان وغیرہ میں جا بجا ملتے ہیں۔ لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ وہ نسخہ معدوم ہو گیا اُس زمانہ کی ہزاروں تصنیفات کے نام تراجم کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن دو تین کے سوا ایک کا بھی دُنیا کے کسی کتب خانہ میں پتہ نہیں چلتا۔ خود امام صاحب کے ہمعصروں میں سے سفیان ثوری۔ امام اوزاعی۔ حماد بن سلمہ۔ ہیشم۔ معمر۔ جریر بن عبدالحمید۔ عبداللہ بن المبارک نے حدیث و فقہ میں بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔ لیکن آج ان کا نام ہی نام رہ گیا ہے اور ایک کا بھی وجود نہیں۔ امام رازی نے مناقب الشافعی میں تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔

مسند خوارزمی

مسند خوارزمی ،- کو امام صاحب کا مسند کہنا مجازی اطلاق ہے - خوارزمی خود ساتویں صدی میں تھے - جن مسندوں کو جمع کیا ہے - وہ بھی اکثر تیسری چوتھی صدی یا اس سے بھی بعد کی ہیں - حماد - قاضی ابو یوسف - البتہ امام صاحب کے ہمعصر ہیں اور اُن کا مسند بے شبہہ امام ابو حنیفہ کا مسند کہا جا سکتا تھا لیکن خوارزمی کے سوا اور کسی نے اُن مسندوں کا نام نہیں لیا ہے - حالانکہ حدیث کی کتاب جب تک مشہور اور مستند روائتوں سے ثابت ہو اُس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا - ہمارے نزدیک اِس بحث میں شاہ ولی اللہ صاحب کا فیصلہ کافی ہے - وہ حجۃ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ "طبقہ رابعہ کی وہ کتابیں ہیں جن کے مصنفوں نے ایک مدت دراز کے بعد اُن روائتوں کو جمع کرنا چاہا جو وہ پہلے طبقوں میں موجود نہ تھیں - اور گمنام مسندوں اور مجموعوں میں پائی جاتی تھیں - اِن لوگوں نے اُن کو بلند نام کرنا چاہا - حالانکہ وہ حدیثیں اُن لوگوں کی زبانوں پر تھیں - جنکا محدثین اعتبار نہیں کرتے مثلاً زیادہ گو واعظین اور اہل بدعت اور ضعیف الروایۃ - یا وہ صحابہ اور تابعین کے آثار - یا بنی اسرائیل کے قصے تھے - یا حکما اور واعظین کے مقولے تھے جن کو راویوں نے رسول اللہ صلعم کے کلام سے مخلوط کر دیا تھا - یا قرآن اور حدیث کے محتمل مضامین تھے جن کو اُن نیک آدمیوں نے بالمعنی روائیت کیا جو فن روائیت کی باریکیوں سے ناواقف تھے - اِن لوگوں نے اُن باتوں کو رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کر دیا - یا ایسے مضامین تھے جو قرآن اور حدیث سے مستنبط ہوتے تھے - اُن کو قصداً حدیث نبوی بنا دیا - یا مختلف حدیثوں کے ٹکڑے تھے جو ایک عبارت میں مُرتب کر دئے گئے - اِس قسم کی حدیثیں کتاب الضعفاء ابن حبان کامل ابن عدی تصنیفات خطیب - و ابو نعیم و جوزقانی - و ابن عساکر - و ابن نجار و دیلمی میں مل سکتی ہیں - مسند خوارزمی بھی قریباً اِسی طبقہ میں داخل ہے"

شاہ ولی اللہ صاحب نے ذرا سختی کی - بات اِتنی ہے کہ جن مسندوں کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ امام صاحب کے شاگردوں نے لکھے اُن کا نہ تاریخوں سے ثبوت ملتا ہے نہ وہ خود کہیں پائے جاتے ہیں - جو مسند امام صاحب کے زمانہ سے بہت پیچھے لکھے گئے وہ البتہ موجود ہیں لیکن اُن کی حدیثوں کا امام صاحب تک بسند صحیح متصل پہنچنا نہایت مشتبہ ہے اس سے بڑھکر یہ کہ بعض بعض مسانید میں بے اعتباری کی اندرونی شہادتیں موجود ہیں - مسند حصکفی میں کئی روائیتیں

امام صاحب کی طرف منسوب ہیں جن کو اُنہوں نے خود صحابہ سے سُنا اور روائیت کیا ہے۔ حالانکہ امام صاحب کا صحابہ سے روائیت کرنا محدثانہ تحقیقات کی روسے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا خوارزمی نے آثار امام محمد کو بھی امام کی مسانید میں داخل کیا ہے۔ بے شُبہہ اس کتاب میں اکثر روائیتیں امام صاحب ہی سے ہیں۔ اسلئے ناظرین کو اختیار ہے کہ اُس کو امام ابو حنیفہ کا مسند۔ کہیں یا آثار امام محمد کے نام سے پکاریں لیکن یاد رہے کہ امام محمد نے اس کتاب میں بہت سے آثار اور حدیثیں دوسرے شیوخ سے بھی روائیت کی ہیں۔ اِس لحاظ سے اِس مجموعہ کا انتساب۔ امام محمد کی طرف زیادہ موزون ہے۔

فقہ اکبر

فقہ اکبر کو اگرچہ فخر الاسلام بزدوی۔ عبد العلی بحر العلوم۔ و شارحین فقہ اکبر نے امام صاحب کی طرف منسوب کیا ہے لیکن ہم مشکل سے اُس پر یقین کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب جس زمانہ کی تصنیف بیان کی جاتی ہے۔ اُسوقت یہ طرز تحریر پیدا نہیں ہُوا تھا۔ وہ بطور ایک متن کے ہے اور اُس اختصار و ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے جو متاخرین کا خاص انداز ہے ایک جگہ اُس میں جوہر و عرض کا لفظ آیا ہے۔ حالانکہ یہ فلسفیانہ الفاظ۔ اُسوقت تک زبان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ بے شُبہہ منصور عباسی کے زمانہ میں فلسفہ کی کتابیں یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کی گئیں تھیں۔ لیکن یہ زمانہ امام صاحب کی آخر زندگی کا زمانہ ہے۔ کسی طرح قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ ترجمہ ہوتے ہی یہ الفاظ اسقدر جلد شائع ہو جائیں کہ عام تصنیفات میں اُن کا رواج ہو جائے فلسفہ کے الفاظ نے مذہبی دائرہ میں اُسوقت بار پایا ہے جب کثرت استعمال کی وجہ سے وہ زبان کا جزو بن گئے اور عام بول چال میں بھی اُن کے استعمال کے بغیر چارہ نہ رہا۔ لیکن یہ دور امام صاحب کے زمانہ کے بعد شروع ہُوا ہے۔

یہ بحث تو درائیت کی حیثیت سے تھی۔ اصول روائیت کے لحاظ سے بھی یہ امر ثابت نہیں ہوتا دوسری تیسری بلکہ چوتھی صدی کی تصنیفات میں اس کتاب کا پتہ نہیں چلتا۔ قدیم سے قدیم تصنیف جس میں اس رسالہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ (جہانتک ہم کو معلوم ہے) فخر اسلام بزدوی کی کتاب الاصول ہے جو پانچویں صدی کی تصنیف ہے۔ امام ابو حنیفہ کے ہزاروں شاگرد تھے۔ جن میں سے اکثر بجائے خود اُستاد تھے۔ اور بواسطہ و بلا واسطہ اُن کے ہزاروں لاکھوں شاگرد ہوئے۔ نہایت خلافِ قیاس ہے کہ امام صاحب کی کوئی تصنیف موجود ہوتی اور اتنے بڑے

گروہ میں اُسکا نام تک نہ لیا جاتا۔ علمِ عقائد۔ اور اُسکے متعلقات پر جو بڑی بڑی کتابیں مثلاً صحائف۔ شرح مقاصد۔ شرح مواقف۔ ملل نحل۔ وغیرہ تصنیف ہوئیں اُن میں کہیں اسکا ذکر تک نہیں ہے۔ اس کتاب کی جسقدر شرحیں ہوئیں سب آٹھویں صدی میں یا اُس کے بعد ہوئیں۔ اسکے علاوہ ابو مطیع بلخی۔ جو اس کتاب کے راوی ہیں۔ حدیث و روایت میں چنداں مستند نہیں ہیں۔ کتب رجال میں انکی نسبت محدثین نے نہایت سخت ریمارک کیے ہیں۔ اگرچہ میں اُنکو کلیۃً تسلیم نہیں کرتا۔ تاہم ایک ایسی مشتبہہ کتاب جسکا ثبوت صرف ابو مطیع بلخی کی روایت پر منحصر ہو۔ محدثانہ اصول پر قابل تسلیم نہیں ہو سکتی۔

میرا خیال ہے کہ ابو مطیع بلخی نے ایک رسالہ میں بطور خود عقائد کے مسائل قلمبند کیے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ امام صاحب کیطرف منسوب ہو گیا۔ اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ علامہ ذہبی نے عبر فی اخبار من غبر میں ابو مطیع کا جہاں ذکر کیا ہے ان لفظوں سے کیا ہے کہ صاحب الفقہ اکبر" جسکے متبادر معنی یہی ہیں کہ خود ابو مطیع اُس کے مصنف ہیں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ فقہ اکبر کی موجودہ ترتیب و عبارت۔ ابو مطیع کے زمانہ سے بھی بہت بعد کی ہے۔ اور یہ کچھ نئی بات نہیں۔ جامع صغیر۔ جو امام محمد کی تالیف ہے۔ اُس کی موجودہ ترتیب۔ امام ابو طاہر دباس نے کی ہے۔ جو چوتھی صدی میں تھے۔ فرق یہ ہے کہ جامع صغیر۔ کی عبارت وہی اصلی ہے۔ صرف ترتیب بدل دی گئی ہے۔ برخلاف اس کے فقہ اکبر۔ کا انداز عبارت بھی زمانہ مابعد کا معلوم ہوتا ہے۔

ہم نے اس بحث میں اپنی رائے اور قیاسات کو بہت دخل دیا ہے۔ لیکن تمام واقعات بھی لکھ دئے ہیں۔ ناظرین کو ہم اپنی رائے کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اصلی واقعات اور ہماری رائیں۔ دونوں اُن کے سامنے ہیں۔ وہ جو چاہیں خود فیصلہ کریں۔ بے شبہہ ہماری ذاتی رائے یہی ہے کہ آج۔ امام صاحب کی کوئی تصنیف موجود نہیں ہے۔

عقائد و کلام

امام صاحب ابتدائی تحصیل میں علم کلام۔ کی طرف زیادہ مائل تھے۔ صحابہ کے اخیر زمانہ میں نئے نئے فرقے پیدا ہو چلے تھے۔ معبد جہنی نے۔ جو صحابہ کا صحبت یافتہ تھا مسئلہ قدر کو چھیڑا۔ واصل بن عطاء نے جو علوم عربیہ و علم کلام کا بہت بڑا عالم اور امام حسن بصری کا شاگرد تھا۔

اعتزال کی بنیاد قائم کی جہم بن صفوان۔ فرقہ جہمیہ کا بانی ہُوا۔ خوارج کے متعدد فرقے اس سے پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں ان مسایل کے جا بجا چرچے تھے اور ہر جگہ بحث و مناظرہ کا بازار گرم تھا۔ امام صاحب کو بھی اُن کی ردّ و قدح کی طرف التفات ہُوا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی بے نظیر ذہانت سے ان مسائل میں نہایت دقیق بحثیں پیدا ہو گئی۔ لیکن چونکہ یہ شغل تھوڑے زمانہ تک رہا اور بالآخر وہ فقہ کے مہمات میں مصروف ہوئے اس لئے اُن مباحث کا آج پتہ نہیں چلتا۔ تاہم چند مسائل جو تبواتر اُن کی طرف منسوب ہیں۔ اُن کی دقّتِ نظر، جدّتِ ذہن، وسعتِ خیال کے شاہد عادل ہیں۔ اُن میں سے ہم بعض مسائل کا ذکر کرتے ہیں جو محدّثین کے نزدیک بڑے معرکۃ الآراء مسئلے ہیں۔

اعمال جزو ایمان نہیں ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ امام صاحب۔ فرائض اور اعمال کو جزو ایمان نہیں سمجھتے۔ آج تو اس کی نسبت بحث کرنی گویا تحصیل حاصل ہے ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ ایمان اعتقاد کا نام ہے جو دل سے متعلق ہے۔ فرائض اور اعمال جوارح کے کام ہیں۔

اس لئے نہ اُن دونوں سے کوئی حقیقت مرکب ہو سکتی ہے۔ نہ ان میں سے ایک دوسرے کا جزو ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں یہ ایک بڑا ابحث طلب مسئلہ تھا اور اکثر اربابِ ظاہر بلکہ بعض مجتہدین بھی اِس کے خلاف تھے۔

صحابہ کے زمانہ تک اسلامی عقائد کی سطح۔ نہایت ہموار اور غیر متحرک رہی۔ اہل عرب کو ان موشگافیوں اور باریک بینیوں سے سروکار نہ تھا۔ بنو اُمیہ کے وسط زمانہ میں جب فوجی قوت کو زوال ہُوا تو تمدن و معاشرت کی وسعت نے اور قسم کے اشغال پیدا کر دئے۔ جبر و قدر، تشبیہ و تنزیہ عدل و جور کی بحثیں چھڑ گئیں۔ ان بحثوں کی ابتدا اُن لوگوں نے کی جو عجم کی خاک سے تھے۔ یا اُن پر عجم کا پرتو پڑا تھا۔ چونکہ یہ نامانوس صدائیں تھیں۔ اِن باتوں پر مذہبی گروہ میں۔ جو زیادہ تر عرب سے تعلق رکھتا تھا سخت برہمی پیدا ہو گئی اور محدثین و فقہاء نہایت سختی سے بدعتیوں کے مقابلہ کو اُٹھے۔ اِس مقابلہ کی بنا پر ان بزرگوں کو خود بھی اُن مسائل میں نفی یا اثبات کا پہلو اختیار کرنا پڑا۔ لیکن جوشِ مخالفت نے اکثروں کو اعتدال کی حد پر نہ رہنے دیا۔ معتزلہ کا مذہب تھا کہ قرآن مجید خدا کا ایک جدید کلام ہے۔ جو رسول اللہؐ کی نبوّت کے ساتھ وجود میں آیا۔ لوگوں نے اِس کی

یہاں تک مخالفت کی کہ بعض محدثین نے تلفظ بالقرآن کو بھی قدیم ٹھہرایا۔ امام ذہلی۔ جو امام بخاری کے اساتذہ میں سے تھے۔ اور صحیح بخاری میں اُن کی سند سے اکثر روایتیں ہیں۔ اسی بات پر امام بخاری سے ایسے ناراض ہوئے کہ اُن کو حلقۂ درس سے نکلوا دیا اور عام حکم دیدیا کہ جو شخص بخاری کے پاس آمد و رفت رکھے وہ ہمارے حلقہ میں نہ آنے پائے[۱]۔ امام بخاری خود قرآن کے قدم کے قائل تھے لیکن قرأت قرآن کو حادث کہتے تھے۔ ذہلی کو اصرار تھا کہ یہ بھی قدیم ہیں۔

اور مسائل میں بھی اس قسم کی بے اعتدالیاں ہوئیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں امام ابوحنیفہ نے اِن تمام بحثوں میں وہی پہلو اختیار کیا جو مغز سخن تھا اور جو عقل کے ساتھ نقل کے بھی مطابق تھا۔ انہیں مسائل میں ایمان و عمل کا مسئلہ بھی تھا۔ مرجئیہ کا مذہب ہے کہ "ایمان اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور ایمان اور تصدیق کامل ہو تو عمل کا نہ ہونا کچھ ضرر نہیں کرتا۔ ایک شخص اگر دل سے توحید و نبوت کا معترف ہے اور فرائض نہیں ادا کرتا۔ تو وہ مواخذہ سے بری ہے[۲]۔" اس رائے کا پہلا حصہ گو صحیح تھا۔ مگر محدثین نے کچھ تفریق نہ کی اور کلیۃً اس مذہب کے مخالف ہو گئے۔ چونکہ قرآن کی بعض آیتیں بھی بظاہر اس کے مؤید تھیں اُن کی رائے کو اور بھی قوت و شدت ہو گئی۔ یہ ایک اجتہادی رائے تھا اور یہیں تک رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ ان بزرگوں نے یہاں تک شدت کی کہ جو شخص اُن کی رائے کے ساتھ متفق نہ ہوتا تھا اُس کو فاسق یا کافر سمجھتے تھے۔ قاضی ابویوسف ایکبار شریک کی عدالت میں گواہ ہو کر گئے تو اُنہوں نے کہا "میں اُس شخص کی شہادت نہیں قبول کرتا جس کا یہ قول ہو کہ نماز جزو ایمان نہیں"۔

ایمان اور عمل جداگانہ چیزیں ہیں۔

امام ابوحنیفہ کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ یہ مسئلہ فلاں شخص یا فلاں فرقہ کا ہے وہ اصل حقیقت کو

---

[۱] ان واقعات کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے ۱۲

[۲] ایمان اور تصدیق کامل کیسے ہو سکتی ہے جب تک عمل نہ ہو عمل ہی ایمان اور تصدیق کامل کا پتہ دیتا ہے، تصدیق کامل کی شرط نے مجبوراً مجھ سے یہ لفظ لکھوائے ہیں۔ ہاں جو فرائض نہیں ادا کرتا وہ مواخذہ سے امام صاحب کے نزدیک بھی تو بری نہیں ہو سکتا۔ ۱۲ محشی

دیکھتے تھے اور مغز سخن کو پہنچتے تھے۔ جب یہ بحث اُن کے سامنے پیش کی گئی تو اُنہوں نے علانیہ کہا کہ "ایمان اور عمل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے اس پر بہت سے لوگوں نے اُنہیں بھی مرجیہ کہا۔ لیکن وہ ایسا مرجیہ ہونا خود پسند کرتے تھے محدثین اور فقہاء میں سے جو لوگ۔ امام صاحب کے ہمزبان تھے اُن کو بھی یہی خطاب عنایت ہوا محدث ابن قتیبہ نے اپنی مشہور اور مستند کتاب المعارف میں مرجیہ کے عنوان سے بہت سے فقہا اور محدثین کے نام گنائے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں ابراہیم تیمی۔ عمرو بن مرۃ۔ طلق الحبیب۔ حماد بن سلیمان۔ عبد العزیز بن ابی داؤد۔ خارجہ بن مصعب۔ عمرو بن قیس الاصر۔ ابو معاویۃ الضریر یحیی بن زکریا۔ مسعر بن کدام۔ حالانکہ ان میں سے اکثر حدیث و روایت کے امام ہیں۔ اور صحیح بخاری و مسلم میں ان لوگوں کی سیکڑوں روایتیں موجود ہیں۔ ہمارے زمانہ کے بعض کوتاہ بین جو اس پر غش ہیں کہ امام صاحب کو بعض محدثین نے مرجیہ کہا ہے ابن قتیبہ کی فہرست دیکھتے تو شاید اُن کو ندامت ہوتی۔ محدث ذہبی نے میزان الاعتدال میں مسعر بن کدام کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "ارجاء (مرجیہ ہونا) بہت سے علمائے کبار کا مذہب ہے اور اس مذہب کے قائل پر مواخذہ نہ کرنا چاہئے"

جو لوگ مرجیہ کہلائے

یہ اُسی ارجاء کی طرف اشارہ ہے جو امام ابو حنیفہ کا مذہب تھا۔

یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر چنداں مُہتم بالشان نہ تھا۔ لیکن اُس کے نتائج بہت بڑا اثر رکھتے تھے اسی لحاظ سے امام صاحب نے نہایت آزادی سے اُس کا اظہار کیا۔ عمل کو جزو ایمان قرار دینا۔ اس بات کو مستلزم ہے کہ جو شخص اعمال کا پابند نہ ہو وہ مومن بھی نہ ہو جیسا کہ خارجیوں کا مذہب ہے جو مرتکب کبائر کو کافر سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اکثر محدثین۔ ایسے شخص کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا اس وجہ سے تھا کہ وہ لزوم سے ناواقف تھے۔ حالانکہ لزوم قطعی اور یقینی ہے۔ جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

امام رازی۔ نے جو امام شافعی کے بہت بڑے حامی ہیں۔ کتاب مناقب الشافعی میں لکھا ہے کہ "لوگوں نے امام شافعی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ متناقض باتوں کے قائل ہیں کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ "ایمان تصدیق و عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ ساتھ ہی اس بات

کے بھی قائل ہیں۔ کہ "ترک عمل سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا"۔ حالانکہ مرکب چیز کا جب ایک جزو نہ رہا تو مرکب بھی من حیث المرکب نہ رہا۔ اسی لئے معتزلہ جو اس بات کے قائل ہیں کہ عمل جزو ایمان ہے اس بات کے بھی قائل ہیں کہ عمل نہ ہو تو ایمان بھی نہیں۔ لیکن امام شافعی کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل ایمان اقرار اور اعتقاد کا نام ہے۔ باقی اعمال۔ تو وہ ایمان کے ثمرات اور توابع ہیں۔ لیکن چونکہ توابع پر بھی کبھی مجازاً اصل شئے کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے مجازاً اعمال پر بھی ایمان کا اطلاق ہوا اور یہ مسلّم ہے کہ توابع کے فوت ہونے سے اصل شئے فوت نہیں ہوتی"۔

لیکن یہ جواب توجیہ القول بمالا یرضٰے بہ قائلہ ہے اور خود امام رازی۔ کو اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ جواب کے بعد فرماتے ہیں کہ فیہ ترک لھذا المذھب یعنی اس جواب سے یہ مذہب باطل ہوا جاتا ہے۔ امام رازی گو شافعی المذہب اور اپنے امام کے نہایت طرفدار ہیں لیکن چونکہ صاحب نظر اور نکتہ شناس ہیں اُن کو تسلیم کرنا پڑا کہ۔ یا عمل کو ایمان کے توابع سے شمار کرنا چاہئے۔ یا مان لینا چاہئے کہ جو شخص پابند عمل نہیں۔ مومن بھی نہیں۔

اس بحث کے متعلق امام ابو حنیفہ کی ایک تحریر موجود ہے جس کی طرز استدلال و استنباط نتائج سے۔ امام صاحب کی دقت نظر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اصل مسئلہ کی حقیقت کھلتی ہے اس لئے اس موقع پر ہم اُس کا حوالہ دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ تحریر عثمان تبی کے ایک خط کا جواب ہے جو اُنہوں نے امام صاحب کو لکھا تھا۔ عثمان اُس زمانہ کے ایک مشہور محدث تھے عام لوگوں میں جب امام ابو حنیفہ کے۔ ان خیالات کے چرچے ہوئے تو اُنہوں نے امام صاحب کو ایک دوستانہ خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "لوگ آپ کو مرجیہ کہتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ آپ مومن کا ضال و گمراہ ہونا جائز قرار دیتے ہیں۔ مجھ کو ان باتوں کے سننے سے نہایت رنج ہوتا ہے۔ کیا یہ باتیں صحیح ہیں"۔ اس خط کے جواب میں امام صاحب نے ایک طولانی خط لکھا ہے جس کے فقرے کہیں کہیں سے ہم انتخاب کرتے ہیں۔ حمد و نعت کے بعد۔ عثمان تبی کی دوستانہ نصیحت اور خیر خواہی کا شکریہ ادا کر کے اصل مضمون اس طرح شروع کیا ہے "میں آپ کو بتاتا ہوں کہ رسول اللہؐ کے مبعوث ہونے سے پہلے تمام لوگ مشرک تھے رسول اللہؐ جب مبعوث ہوئے تو لوگوں کو اس بات کی طرف دعوت کی کہ خدا کو ایک مانیں اور رسول اللہؐ جو کچھ لائے اُس کو

امام صاحب کی تحریر

تسلیم کریں۔ پس جو شخص اسلام میں داخل ہوتا تھا اور شرک چھوڑ دیتا تھا اُس کی جان اور مال حرام ہو جاتا تھا۔ پھر خاص اُن لوگوں کے لیئے جو ایمان لا چکے تھے فرائیض کے احکام آئے پس اُسکا پابند ہونا عمل ٹھہرا اور خدا نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الذین امنوا وعملوا الصلحت ومن یومن باللہ ویعمل صالحا۔

اِس قسم کی اور اور آئتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عمل کے نہ ہونے سے ایمان جاتا نہیں رہتا۔ البتہ اگر تصدیق و اعتقاد نہ ہو تو مؤمن کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ عمل و تصدیق کا دو جداگانہ چیز ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ تصدیق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں۔ لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ دین و مذہب سب کا ایک ہی ہے خدا نے خود کہا ہے شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ یعنے "تمہارے لئے اُسی دین۔ کو مشروع کیا جس کی وصیت نوح کو کی تھی۔ اور جو تجھ پر وحی بھیجی اور جس کی وصیت۔ ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ کو کی۔ وہ یہ ہے کہ دین کو قائم رکھو اور اُس میں متفرق نہ ہو"

آپ کو جاننا چاہیئے کہ تصدیق میں ہدائیت اور اعمال میں ہدائیت یہ دونوں دو چیزیں ہیں آپ ایک شخص کو جو فرائیض سے ناواقف ہو مؤمن کہہ سکتے ہیں پس ایسا شخص فرائیض کے لحاظ سے جاہل اور تصدیق کے لحاظ سے مؤمن ہے۔ خود خدا نے قرآن میں یہ اطلاقات کئے ہیں۔ کیا آپ اُس شخص کو جو خدا اور رسولِ خدا کے پہچاننے میں گمراہ ہو اُس شخص کے برابر قرار دینگے جو مؤمن ہو لیکن اعمال سے ناواقف ہو خدا نے جہاں فرائیض بتائے ہیں اُس موقع پر ارشاد فرمایا ہے کہ یبین اللہ لکم ان تضلوا (یعنی خدا نے اس لئے بیان کیا کہ تم گمراہ نہ ہو) دوسری آئیت میں ہے ان تضل احدھما فتذکر احدھما الاخریٰ (یعنی ایک گمراہ ہو تو دوسرا یاد دلادے) حضرت موسیٰ کی زبان سے فرمایا۔ فعلتہا اذاً وانا من الضّالین (یعنی جب میں نے وہ کام کیا تب میں گمراہ تھا) اِن آئیتوں کے علاوہ اور بہت سی آئتیں ہیں جو اس دعویٰ کے ثبوت کے لئے دلائل قاطعہ ہیں اور حدیثیں تو اور بھی واضح اور صاف ہیں۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ امیر المومنین کے لقب سے پکارے جاتے تھے تو کیا اس کے یہ معنے تھے کہ وہ صرف اُن لوگوں کے امیر تھے

ھ۵ سیپارۂ پچیسواں سورہ شوریٰ رکوع ۲ محشی ۱۲

جو فرائض اور اعمال کے پابند تھے حضرت علیؓ نے شام والوں کو جو اُن سے لڑتے تھے مومن کہا کیا قتل سے بڑھکر کوئی گناہ ہے۔ پھر جو لوگ قتل کے مرتکب ہوئے۔ کیا آپ قاتلین اور مقتولین دونوں کو برسرِ حق قرار دیتے ہیں۔ اگر آپ صرف ایک کو (یعنی حضرت علیؓ اور طرفداران علیؓ) برسرِ حق تسلیم کرینگے تو دوسرے فریق کو کیا کہینگے اس کو خوب سمجھ لیجئے اور غور کیجئے۔"

"میرا یہ قول ہے کہ اہل قبلہ سب مومن ہیں اور فرائض کے ترک سے کافر نہیں ہو سکتے جو شخص ایمان کے ساتھ تمام فرائض بجالاتا ہے وہ مومن اور جنتی ہے۔ جو ایمان اور اعمال دونوں کا تارک ہے وہ کافر اور دوزخی ہے۔ جو شخص ایمان رکھتا ہے اور فرائض اُس سے ترک ہو جاتے ہیں۔ وہ مسلمان ضرور ہے۔ لیکن گنہگار مسلمان ہے۔ خدا کو اختیار ہے اُس پر عذاب کرے یا معاف کر دے۔"

امام صاحب نے جس خوبی سے اس دعویٰ کو ثابت کیا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ اُس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ فرائض اور ایمان کے باہمی امتیاز کی اس سے عمدہ تر کیا دلیل ہوگی۔ کہ آغاز اسلام میں ایمان۔ کی دعوت ہوتی تھی اور فرائض کا وجود نہ تھا۔ امام صاحب نے قرآن کی جو آئیتیں۔ استدلال میں پیش کی ہیں۔ اُن سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ دونوں دو چیزیں ہیں۔ کیونکہ ان تمام آئیتوں میں عمل کو ایمان پر معطوف کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جزو کل۔ پر معطوف نہیں ہو سکتا۔ من یومن باللہ فیعمل صالحا۔ میں حرف تعقیب آیا ہے۔ جس سے اس بحث کا قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ان دلائل قاطعہ کے مقابلہ میں دوسری طرف۔ بعض آئیتیں اور حدیثیں ہیں لیکن اُن میں سے کوئی اثبات مدعا کے لئے کافی نہیں۔ بڑا استدلال اس حدیث پر ہے کہ "مؤمن۔ مؤمن ہو کر زنا اور چوری نہیں کرتا" حالانکہ یہ کلام کے زور دینے کا ایک پیرایہ ہے۔ ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں۔ کہ بھلا آدمی ہو کر تو ایسا کام نہیں کر سکتا۔ جس کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ کام شانِ شرافت کے خلاف ہے۔ بے شبہ زنا اور سرقہ بھی ایمان کی شان کے خلاف ہیں۔ اور حدیث کا مقصد اسی قدر ہے۔ ورنہ ابوذر کی حدیث میں صراحتہً یہ الفاظ موجود ہیں۔ کہ "جو شخص لاالہ الااللہ کا قائل ہے وہ جنت میں جائیگا گو زانی اور چور ہو۔"

ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ الایمان لایزید ولا ینقص یعنی ایمان کم و بیش نہیں ہو سکتا

بے شبہہ یہ امام صاحب کا قول ہے لیکن اس کی تعبیر میں لوگوں نے غلطی کی ہے۔ نہ صرف محدثین اور شافعیہ نے بلکہ خود احناف نے بھی۔ ایمان کی کمی و زیادتی دو لحاظ سے ہوسکتی ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ وہ مقولۂ کیف سے ہے جس میں "شدت و ضعف ممکن ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ایمان یقین کا نام ہے۔ اور یقین کے مراتب متفاوت ہوتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا سے کہا کہ اے خدا تو مُردوں کو کیونکر جلاتا ہے تو ارشاد ہوا کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ یعنے کیا اب تک تجھ کو یقین نہیں آیا۔ عرض کی۔ کہ یقین ضرور ہے لیکن لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ یعنے اور زیادہ اطمینان خاطر چاہتا ہوں" خدا نے متعدد آیتوں میں صاف تصریح کر دی ہے کہ ایمان میں ترقی ہوتی ہے زادتھم ایمانا اس مسئلہ میں نصّ صریح ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ کو بلحاظ اس معنی کے نہ انکار ہے نہ یہ امر اس وقت زیر بحث تھا۔ امام صاحب کے دعوے کا اور منشاء ہے اور وہ بالکل صحیح ہے۔ جن لوگوں نے عمل کو جزو ایمان قرار دیا۔ اُن کا مذہب ہے کہ ایمان بلحاظ مقدار کے زیادہ و کم ہوتا ہے۔ جو شخص اعمال کا زیادہ پابند ہے۔ وہ زیادہ مؤمن ہے۔ جو گنہگار ہے وہ کم مؤمن ہے۔ محدثین۔ صراحتہً اس کے مدعی ہیں اور اُس پر دلیلیں لاتے ہیں۔ علامۂ قسطلانی۔ صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں۔ فاعلم ان الایمان یزید بالطاعات وینقص بالمعصیۃ یعنے "ایمان۔ ثواب کے کام کرنے سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور گناہ کرنے سے گھٹ جاتا ہے" اور محدثین نے بھی جا بجا اس کی تصریح کی ہے۔ امام ابو حنیفہ۔ اس اعتبار سے۔ ایمان کی زیادت و نقصان کے منکر تھے۔ اُنکے نزدیک۔ جب اعمال جزو ایمان نہیں۔ تو اعمال کی کمی بیشی سے۔ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ اور یہ بالکل صحیح ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ "ابو بکر کو تم لوگوں پر جو ترجیح ہے وہ کثرت صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اُس چیز کی وجہ سے ہے جو اُس کے دل میں ہے" غرض امام صاحب کا یہ دعویٰ نہیں کہ ایمان بلحاظ کیفیت یعنی شدت و ضعف کے زیادہ و کم نہیں ہوسکتا بلکہ اُنکا یہ دعوے ہے کہ ایمان مقدار کے اعتبار سے کم و بیش نہیں ہوتا۔ یہ دعویٰ اس بات کی فرع ہے کہ اعمال جزو ایمان نہیں۔ اور اس کو ہم ابھی ثابت کر چکے ہیں۔

متعلق ایمان میں سب برابر ہیں

امام صاحب اس بات کے بھی قایل تھے کہ متعلق ایمان میں کچھ تفاوت نہیں ہے۔

یعنی معتقدات کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں۔ ایمان کے لئے جن مسائل پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے وہ سب کے لئے یکساں ہیں۔ صحابہ اور عام مسلمان اِس لحاظ سے برابر ہیں کہ دونوں ایک ہی چیز یعنے توحید و نبوّت کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ فرق ہے تو اعتقاد کے شدت و ضعف میں ہے۔ اِسی مطلب کو امام صاحب نے عثمان تبی کے جواب میں اِن الفاظ سے بیان کیا ہے کہ دین اھل السماء والارض واحدٌ یعنے آسمان اور زمین والوں کا ایک ہی دین ہے پھر اِس دعوے پر آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے شرع لکم من الدین ما وصینا به نوحًا یعنے ہم نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جس کی وصیت نوح کو کی تھی۔" مخالفین نے بڑے زور شور سے امام صاحب پر یہ الزام لگایا ہے۔ کہ وہ اِس بات کے قایل تھے کہ "میرا ایمان اور ابوبکر صدیق رضؓ کا ایمان برابر ہے۔" اگرچہ امام صاحب کی طرف اِس قول کی اسناد ثابت نہیں لیکن اگر ثابت ہو تو کیا نقصان ہے۔ جس اعتبار سے وہ مساوات کے مدعی ہیں اُس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ ایسا صاف مسئلہ معترضوں کی سمجھ میں نہ آیا خطیب بغدادی نے صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے اور یہ نہ سمجھے کہ امام صاحب کا دعویٰ کیا ہے۔ اُنکو یہ الفاظ نہایت گراں گذرتے ہیں۔ کہ "ہمارا اور صحابہ کا ایمان برابر ہے" وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بہت سی چیزوں میں ہم اور صحابہ برابر ہیں۔ تاہم ہم میں اور صحابہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اگرچہ اِس قسم کے تمام مسائل میں امام صاحب اپنی خاص رائیں رکھتے تھے۔ لیکن وہ مخالف رائیوں پر کفر و فسق کا الزام نہیں لگاتے تھے۔ یہ فیاض دلی امام صاحب کا خاصہ ہے اور قرن اوّل کے بعد اسلام میں اس کی بہت کم نظیریں ملتی ہیں۔ اسلام کو کسی چیز نے اُن مشاجرات سے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا جو اختلاف آراء کی بنا پر قایم ہوگئی۔ اِن اختلافات کی بنیاد اگرچہ خود صحابہ کے زمانہ میں شروع ہو چکی تھی۔ عبد اللہ بن عباس اور بہت سے صحابہ کا اعتقاد تھا کہ رسول اللہؐ نے معراج میں خدا کو آنکھوں سے دیکھا حضرت عائیشہ رضؓ نہایت اصرار سے اِس کے مخالف تھیں امیر معاویہ کو معراج جسمانی سے انکار تھا۔ حضرت عائیشہ رضؓ سماع موتی کی قایل نہ تھیں لیکن اُس زمانہ تک اِن اختلافات پر ہدایت و گمراہی کا مدار نہ تھا۔ جو لوگ مختلف رائیں رکھتے تھے اُن میں سے کبھی کسی نے کسی کی تکفیر یا تفسیق نہیں کی۔ حضرت

عبداللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ "کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں جو قرآن کی غلط تاویل کرتے ہیں اور ہم کو کافر قرار دیتے ہیں۔ وہ خود کافر ہیں یا نہیں" حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ اُسوقت تک کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا جب تک خدا کو دو نہ کہے[۱]" صحابہ کے بعد یہ اختلاف زور پکڑتے گئے اور رفتہ رفتہ مستقل فرقے قائم ہو گئے۔ اعتقادی اور فقہی مسائل اکثر ایسے ہیں جن میں نص قاطع موجود نہیں۔ اور ہیں تو متعارض ہیں۔ اس لئے استنباط اور رفع تعارض کی ضرورت نے اجتہاد کو بہت وسعت دی۔ اور سیکڑوں رائیں قائم ہو گئیں بے شبہہ ان میں بہت سی رائیں صحیح نہیں لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ سب کُفر ہوں۔

افسوس ہے کہ سرگرم طبیعتیں۔ جو مذہبی جوش اور تقدس کے نشہ میں سرشار تھیں اختلاف رائے کے صدمہ کی تاب نہ لا سکیں۔ اور نہایت بے صبری سے مخالفت پر آمادہ ہو گئیں بات بات پر کُفر کے فتوے ہونے لگے۔ جو لوگ جس قدر زیادہ مذہبی حرارت رکھتے تھے۔ اُسی قدر کُفر کے اطلاق میں کم احتیاط کرتے تھے رفتہ رفتہ یہانتک نوبت پہنچی کہ ہر فریق نے دوسرے کی ضلالت و گمراہی ثابت کرنے کے لئے۔ موضوع روایتوں سے اعانت لی۔ اور اس قسم کی حدیثیں ایجاد ہونے لگیں کہ میری اُمّت میں ۷۳ فرقے پیدا ہونگے جن میں صرف ایک جنتی ہوگا باقی سب دوزخی۔ اس فرضی تعداد کو پورا کرنا بھی ضرور تھا۔ اس لئے کھینچ تان کر ۷۳ فرقے قرار دئے ہیں۔ اور سب کے الگ الگ نام رکھے۔ اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو ہر ہر فرقے کے لئے جُدا جُدا روایتیں گھڑیں مثلاً القدریۃ مجوسُ ھذا الامۃ وغیرہ وغیرہ

اِن تعصبات اور جھگڑوں نے جماعت اسلامی کے تمام اجزا پراگندہ کر دیئے۔ اور مذہب اخلاق۔ حکومت۔ تمدن۔ معاشرت۔ سب کا نقشہ بگڑ گیا۔ اس عالمگیر آشوب میں صرف ایک امام ابوحنیفہ تھے۔ جن کی صدا سب سے الگ تھی۔ اور جو پکار کر کہتے تھے لا نکفر احدا من اھل القبلۃ یعنے اہل قبلہ میں سے ہم کسی کو کافر نہیں سمجھتے۔" اُسوقت تو اس صدا پر چنداں توجہ نہیں ہوئی۔ لیکن زمانہ جسقدر ترقی کرتا گیا اس جملہ کی قدر بڑھتی گئی یہانتک کہ وہ علم کلام کا ایک بیش بہا اصول بن گیا۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اُس پر عمل کم کیا گیا اور تکفیر کے غلغلے اب بھی پست نہ ہوئے۔

امام صاحب اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے تھے

[۱] آثار امام محمد صفحہ ۱۲۶۵

امام صاحب کی یہ رائے نہایت غور و تحقیق و تجربہ کے بعد قائم ہوئی تھی۔ بڑے بڑے مشہور بانیان مذہب اُنہیں کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے اور امام صاحب کو اِن سے ملنے کا موقع حاصل ہُوا تھا۔ خارجیوں۔ کا صدر مقام بصرہ تھا جو امام۔ صاحب کے شہر سے نہائیت قریب تھا۔ واصل بن عطاء و عمرو بن عبید جو مذہب اعتزال کے بانی اور مروّج تھے بصرہ ہی کے رہنے والے اور امام صاحب کے ہمعصر تھے۔ جہم بن صفوان جس کے نام سے فرقہ جہمیہ۔ مشہور ہے اِسی زمانہ میں تھا۔ امام صاحب ان میں سے اکثروں سے ملے اور اُن کے خیالات سے مطلع ہوئے تھے۔ اِن فرقوں کی نسبت جو اقوال مشہور تھے کچھ تو سرے سے غلط اور افترا تھے۔ بعض کی تعبیر غلط طور پر کی گئی تھی۔ بعض در اصل لغو و باطل تھے۔ لیکن کُفر کی حد تک نہ پہنچتے تھے اسلئے

اہل قبلہ سب مومن ہیں

امام ابو حنیفہ نے یہ عام حکم دیا کہ "اہل قبلہ سب مومن ہیں"۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جن مسائل پر قیامتیں برپا ہیں۔ جو کُفر و اسلام کی معیار قرار دی گئی ہیں وہ صرف لفظی بحثیں اور فرضی اصطلاحیں ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ قدیم قرآن کا تھا جس کو لوگوں نے قریباً کلمۂ توحید کے برابر قرار دیا تھا۔ بڑے بڑے علما کا قول ہے کہ "اسلام کو دو شخصوں نے نہائیت نازک وقتوں میں محفوظ رکھا حضرت ابوبکر صدیقؓ جنہوں نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد۔ مرتدین عرب کا استیصال کیا۔ اور امام احمد حنبل جو مامون الرشید کے زمانہ میں حدوث قرآن کے منکر رہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے امام حنبل کو ترجیح ہے۔ کیونکہ صحابہ حضرت ابوبکرؓ کے معاون اور انصار تھے لیکن امام حنبل کا کوئی مددگار نہ تھا"۔

رجال کی کتابوں میں جب کسی شخص کو ثقہ او رستند ثابت کیا جاتا ہے تو سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ حدوث قرآن کو کفر سمجھتا تھا۔ حالانکہ یہ صرف ایک لفظی بحث ہے جو لوگ قرآن کو حادث کہتے تھے اُن کی غرض۔ اُن الفاظ اور اصوات سے تھی۔ جس کا ظہور رسول اللہؐ کی زبان سے ہُوا۔ یا جس پر عام طور سے قرآن کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جو قدیم مانتے تھے وہ کلام سے کلام نفسی کو مراد لیتے تھے جو خدا کی صفات میں سے ہے۔ امام ابو حنیفہ سے اِس بارہ میں مختلف اقوال ہیں اور وہ اِسی تفصیل کی بنا پر ہیں۔ ایک شخص نے اُن سے پوچھا کہ قرآن حادث ہے۔ یا قدیم۔ فرمایا کہ "حادث۔ کیونکہ قرآن خدا نہیں اور جو خدا نہیں وہ حادث ہے"[1]۔

[1] کتاب الاوائل ابو ہلال عسکری ۱۲

غرض اس قسم کے مسائل نفیاً یا اثباتاً۔ نصی نہیں ہیں اور اسوجہ سے وہ کفر و اسلام کے معیار نہیں ہوسکتے۔ امام ابوحنیفہ کی نکتہ شناسی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اُنہوں نے اسلام کے دائرہ کو جو من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ کی وسعت رکھتا تھا اصلی وسعت پر قایم رکھا۔ افسوس ہے کہ اُن کی اس رائے پر بہت کم لحاظ کیا گیا ورنہ امام غزالی محی الدین عربی حضرت غوث الاعظم۔ ابن تیمیہ۔ ابوطالب مکی کو ہم فقہا کی زبان سے کافرنہ سُنتے۔

حدیث۔ اور اصول حدیث

یہ خیال اگرچہ غلط اور بالکل غلط ہے۔ کہ امام ابوحنیفہ۔ علم حدیث میں کم مایہ تھے تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ کہ عام طور پر وہ محدث کے لقب سے مشہور نہیں۔ بزرگان سلف میں سینکڑوں ایسے گذرے ہیں جو اجتہاد و روایت دونوں کے جامع تھے لیکن شہرت اُسی صفت کے ساتھ ہوئی جو اُن کا کمال غالب تھا۔ امام ابوحنیفہ کی تو حدیث میں کوئی تصنیف نہیں تعجب ہے کہ امام مالک و امام شافعی بھی اس لقب کے ساتھ مشہور نہ ہوئے نہ اُن کی تصنیفوں کو وہ قبول عام حاصل ہوا جو صحاح ستہ کو ہوا امام احمد بن حنبل۔ ان لوگوں کی نسبت علم حدیث میں زیادہ نام آور ہیں۔ اُن کی مسند کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ صحیح حدیثوں کا اتنا بڑا مجموعہ اور کوئی نہیں مل سکتا لیکن جس قدر حدیث و روایت میں اُن کا زیادہ اعتبار ہے اُسی قدر استنباط اور اجتہاد میں اُن کی نام آوری کم ہے۔ علامہ طبری نے جو خود بھی محدث اور مجتہد تھے مجتہدین میں اُن کا شمار نہیں کیا۔[1] قاضی ابن عبد البر نے کتاب الانتہاء فی الثلثۃ الفقہاء میں جو مجتہدین کے حالات میں ہے۔ امام ابوحنیفہ و امام مالک و امام شافعی پر اکتفا کی امام رازی۔ مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں کہ "امام شافعی کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہوا اگرچہ امام احمد حنبل کی نسبت گروہ کثیر علما کی یہی رائے تھی کہ وہ اجتہاد کامل کا منصب رکھتے تھے۔ تاہم اُن کے اجتہاد پر اتفاق عام نہ ہوا۔

مجتہد و محدث کی

حقیقت یہ ہے کہ مجتہد و محدث کی حیثیتیں الگ الگ ہیں۔ محدث۔ مواعظ۔ قصص

[1] طبقات المفسرین حافظ جلال الدین سیوطی ترجمہ علامہ طبری ۱۲

جیثیتیں الگ الگ ہیں

فضائل سِیَر۔ ہر ایک قسم کی روائیتوں کا استقصاء کرتا ہے۔ بخلاف اس کے مجتہد کو زیادہ تر صرف اُن احادیث سے۔ غرض ہوتی ہے جن سے کوئی حکم شرعی مستنبط ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ محدثین کی بہ نسبت مجتہدین ہمیشہ قلیل الروائیۃ ہوئے۔ موطاء میں جو امام مالک کی تمام روائیتوں کا مجموعہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہزار حدیثیں ہیں جن میں صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی شامل ہیں۔ امام شافعی نے امام احمد حنبل کے سامنے اکثر اعتراف کیا ہے کہ تم لوگ بہ نسبت ہمارے احادیث سے زیادہ واقف ہو۔ قاضی یحییٰ بن اکثم جو ترمذی کے شیخ ہیں حسرت سے کہا کرتے تھے کہ "اگر امام شافعی نے علم حدیث کی طرف پوری توجہ کی ہوتی تو ہم لوگوں کو سب سے بے نیاز کر دیا ہوتا۔" حافظ ابن حجر نے توالی التاسیس میں جو امام شافعی کے حالات میں ایک مختصر اور مفید رسالہ ہے جہاں امام شافعی کے شیوخ حدیث سے بحث کی ہے خاتمہ پر لکھا ہے کہ ولم یکثر من الشیوخ کعادۃ اہل الحدیث[۱] لاقباله علی الاشتغال بالفقہ یعنے وہ بہت سے شیوخ سے نہیں ملے جیسا کہ اہل حدیث کی عادت ہے۔ کیونکہ اُن کو فقہ کا شغل رہتا تھا۔ حافظ ابن حجر نے امام شافعی کی نسبت قلت شیوخ کا جو سبب بیان کیا۔ امام ابوحنیفہ کی قلتِ روائیت کا بھی وہی سبب ہے لیکن افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے اس دائرہ کو زیادہ وسیع کیا۔ اور عموماً اُن کی قلت روائیت کے قائل ہوئے یہ خیال کچھ نیا نہیں ہے۔ اگلے زمانہ میں بھی بعض بعض لوگوں کی یہ رائے تھی اور وہی غلط فہمی آجتک چلی آتی ہے۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ کہ امام ابوحنیفہ کے وہ واقعات جو منظرِ عام پر نمایاں ہیں اُن سے ایک ظاہر بین شخص ایسی ہی رائے قائم کرسکتا ہے۔ حدیث میں اُن کی کوئی تصنیف موجود نہیں۔ صحاح میں بجز ایک دو روائیت کے اُن کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ اُن کی شہرت اہل الرائے کے لقب سے ہے جس سے تبادر ہوتا ہے کہ حدیث سے اُن کو کم تعلق تھا۔

اِس قدر ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مغازی قصص سِیَر وغیرہ میں اُن کی نظر چنداں وسیع نہ تھی امام مالک و امام شافعی۔ کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن احکام و عقائد کے متعلق امام ابوحنیفہ کو جو واقعیت اور تحقیق حاصل تھی اِس سے انکار کرنا۔ صرف کم نظری اور ظاہر بینی کا نتیجہ ہے اُنکی

[۱] توالی التاسیس لحافظ ابن حجر صفحہ ۵۰۱-۱۲

خلفائے اربعہ کی قلت روائت

تصنیف یا روائتوں کا مدوّن نہ ہونا قلّت نظر کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رض سے زیادہ کسی صحابی کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جلوت وخلوت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال سے جسقدر وہ واقف تھے اور کون ہو سکتا تھا لیکن حدیث کی تمام کتابوں میں اُن کی روائیت سے جسقدر صحیح حدیثیں ہیں اُن کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں۔[۱] کون شخص کہہ سکتا ہے کہ اُن کو صرف اسی قدر حدیثیں معلوم تھیں۔ حضرت ابوبکر رض کے بعد عمر فاروق رض کا درجہ ہے۔ اُن سے بھی صرف پچاس حدیثیں مروی ہیں جن میں سے بعض کا کافی ثبوت نہیں۔ حضرت عثمان رض۔ اور جناب امیر رض۔ کا بھی یہی حال ہے۔ بخلاف انکے حضرت ابوہریرہ سے ۵۳۶۴۔ انس سے ۲۲۸۶۔ عبداللہ بن عباس سے ۲۶۶۰۔ جابر سے ۲۵۴۰۔ عبداللہ بن عمر سے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نوجوان تھے ۲۶۳۰ حدیثیں مروی ہیں۔ اگر روائیتوں کا موجود ہونا ہی معیار رہے۔ تو خلفائے اربعہ کی نسبت تسلیم کرنا پڑے گا کہ یا اُنکا حافظہ ضعیف اور نہایت ضعیف تھا۔ یا دانستہ اُن کو رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال کی طرف التفات اور توجہ نہ تھی۔ وحاشاھم عن ذلک

بخاری ومسلم نے امام شافعی کے واسطے سے کوئی حدیث روائیت نہیں کی

یہ سچ ہے کہ صحاح ستہ کے مصنفین نے امام صاحب سے روائیت نہیں کی (دو ایک روائیتیں مستثنے ہیں) لیکن اس الزام میں اوروں بھی اُن کے شریک ہیں۔ امام شافعی جن کو بڑے بڑے محدثین۔ مثلاً امام احمد حنبل۔ اسحاق بن راہویہ۔ ابوثور۔ حمیدی۔ ابوزرعۃ الرازی۔ ابوحاتم نے حدیث وروائیت کا مخزن تسلیم کیا ہے۔ اُن کی سند سے صحیحین میں ایک بھی روائیت موجود نہیں۔ بلکہ بخاری ومسلم نے کسی اور تصنیف میں بھی امام شافعی کی سند سے کوئی روائیت نہیں کی۔ امام رازی نے بخاری ومسلم کی اِس بے اعتنائی کی بہت سی تاویلیں کی ہیں۔ مگر کوئی معقول بات نہیں بتا سکے۔ صحیحین۔ پر موقوف نہیں ترمذی ابوداؤد ابن ماجہ۔ نسائی۔ میں بھی بہت کم ایسی حدیثیں ہیں جن کے سلسلہ رواۃ میں امام شافعی کا

[۱] مناقب الشافعی للامام الرازی خلفائے اربعہ کی نسبت یہ تعداد میں نے امام شافعی کے قول کے موافق لکھی ہے اور محدثین کے نزدیک اِس سے زیادہ حدیثیں اُن لوگوں سے مروی ہیں۔ تاہم اس قدر تعداد نہیں پہنچتی جس پر کثرت روائیت کا اطلاق کیا جائے ؛

نام آیا ہو حقیقت یہ ہے کہ بعض محدثین نے۔ اعتماد اور استناد کا جو معیار قرار دیا تھا اُس میں اہل نظر۔ بلکہ اکثر لوگوں کے لئے کم گنجائش تھی۔ علامہ قسطلانی نے شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے۔ کہ امام بخاری فرمایا کرتے تھے۔ کہ میں نے کسی ایسے شخص سے حدیث نہیں لکھی جس کا یہ قول نہ تھا کہ الایمان قول وعمل[1] اگر یہ صحیح ہے تو امام ابوحنیفہ کو اُن کے دربار میں پہنچنے کی کیونکر اُمید ہو سکتی تھی[2]۔

جو شخص عمل کو ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں سمجھتا تھا امام بخاری اُس سے روایت نہیں کرتے تھے۔

امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام شافعی کا ذکر کیا ہے لیکن جس بے پروائی سے کیا ہے اُس کے لحاظ سے امام رازی نے یہی غنیمت سمجھا کہ تضعیف نہیں کی۔ چنانچہ امام شافعی کے فضائل میں فرماتے ہیں واما الامام محمد بن اسمعیل البخاری فقد ذکر الشافعیؒ فی تاریخہ الکبیر فقال فی باب محمد بن ادریس بن عبداللہ محمد الشافعی القرشی مات سنۃ اربع ومائتین ثم انہ ما ذکرہ فی باب الضعفاء مع علمہ بانہ کان قد روی شیئا کثیرا من الحدیث ولو کان من الضعفاء فی ہذہ الباب لذکرہ یعنی امام بخاری نے شافعی کا ذکر تاریخ کبیر میں کیا ہے چنانچہ فلاں باب میں لکھا ہے کہ محمد بن ادریس بن عبد اللہ محمد الشافعی القرشی نے ۲۰۴ھ میں وفات پائی لیکن اُن کو ضعفاء کے باب میں ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ امام بخاری جانتے تھے کہ شافعی نے بہت سی حدیثیں روائیت کی ہیں اور اگر وہ اس باب میں ضعیف ہوتے تو امام بخاری ضرور اُن کو ضعیف لکھتے“

امام اوزاعی۔ جو محدث اور مجتہد مستقل تھے اور بلاد شام میں اُن کا وہی اعزاز و اعتبار تھا۔ جو عرب و عراق میں۔ امام مالکؒ و شافعیؒ کا۔ ان کی نسبت کسی نے امام احمد حنبل سے رائے پوچھی۔ فرمایا کہ ”حدیث ضعیف و رائے ضعیف[3]“

لطف یہ ہے کہ مجتہدین جس چیز پر فخر کر سکتے ہیں وہ دقتِ نظر۔ قوت استنباط۔ استخراج

---

[1] حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں امام بخاری کا یہ قول نقل کیا ہے ۱۲

[2] امام صاحب کا اختلاف لفظی بحث رہ جاتا ہے۔ کیونکہ آپ بھی تو بلا عمل کو گنہگار بتاتے ہیں۔ دیکھو اقتباس خط حسن تبی ۱۲ محشی۔

[3] مناقب الشافعی امام الرازی۔ باب رابع ۱۲

مسائل۔ تفریع احکام ہے لیکن محدثین کے ایک گروہ کے نزدیک یہی باتیں عیب و نقص میں داخل ہیں علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری۔ قاضی ابو یوسف کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "اہل حدیث میں سے ایک گروہ نے اُن کی روائیت سے اس بنا پر احتراز کیا ہے کہ اُن پر رائے غالب تھی اور فروع احکام کی تفریع کرتے تھے۔ اِن باتوں کے ساتھ بادشاہ کی صحبت میں رہتے تھے اور منصب قضا پر مامور تھے" اگر فروع اور احکام کا استنباط بھی جرم ہے تو بے شبہ امام ابو حنیفہ قاضی ابو یوسف سے زیادہ مجرم ہیں۔

البتہ یہ بات غور کے قابل ہے کہ امام ابو حنیفہ۔ اور اُن کے اتباع کو کیوں اہل الرائے کہا جاتا تھا اِس باب میں اکثر لوگوں نے غلطی کی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے شہرت عام کے مقابلہ میں تحقیق کی پروا نہ کی۔

اہل الرائے کی تحقیق

ربیعۃ الرائے

اِس بحث کے تصفیہ کے لئے سب سے پہلے یہ پتہ لگانا چاہئے کہ یہ لقب کب ایجاد ہُوا اور کن لوگوں پر اطلاق کیا گیا۔ جہانتک ہم کو معلوم ہے اس لقب کے ساتھ اول جس کو یہ امتیاز حاصل ہے وہ ربیعۃ الرائے ہیں جو امام مالک کے اُستاد اور شیخ الحدیث تھے۔ رائے کا لفظ اُن کے نام کا جزو بن گیا ہے اور تاریخ و اسماء الرجال میں ہمیشہ اُن کا نام ربیعۃ الرائے لکھا جاتا ہے یہ مشہور محدث اور فقیہ تھے۔ اور بہت سے صحابہ سے ملے تھے۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اُن کا ذکر ان لفظوں سے کیا ہے "تمام اصحاب کتب (یعنی صحاح ستہ) نے اُن سے احتجاج کیا ہے۔ عبد العزیز ماجشون کا قول ہے کہ واللہ میں نے ربیعہ سے زیادہ کسی کو حافظ الحدیث نہیں دیکھا"

جو لوگ اہل الرائے کے لقب سے مشہور تھے

اسی زمانہ میں اور اُس کے بعد اور لوگ بھی اِس لقب سے پکارے گئے محدث بن قتیبہ نے کتاب المعارف میں اہل الرائے کی سُرخی سے ایک باب باندھا ہے۔ اور عنوان کے نیچے یہ نام لکھے ہیں۔ ابن ابی لیلی۔ ابو حنیفہ۔ ربیعۃ الرائے۔ زفر۔ اوزاعی۔ سفیان ثوری۔ مالک بن انس۔ ابو یوسف قاضی۔ محمد بن حسن" ابن قتیبہ نے ۲۷۶ھ میں وفات پائی۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم تیسری صدی تک مذکورہ بالا لوگ اہل الرائے کے لقب سے مشہور تھے۔ اگرچہ یہ سب لوگ درحقیقت (زفر کے سوا) محدث ہیں۔ لیکن امام مالک

سلہ تاریخ ابن خلکان ترجمہ قاضی ابو یوسف ج ۲

سفیان ثوری، امام اوزاعی کی شہرت تو محتاج بیان نہیں۔

محدثین میں دو گروہ تھے

اصل یہ ہے کہ جو لوگ علم حدیث کی درس تدریس میں مشغول تھے اُن میں دو نو فرقے قایم ہو گئے تھے۔ ایک وہ جن کا کام صرف حدیثوں اور روائیتوں کا جمع کرنا تھا۔ وہ حدیث سے صرف من حیث الروایۃ بحث کرتے تھے۔ یہانتک کہ اُن کو ناسخ و منسوخ سے بھی کچھ سروکار نہ تھا۔ دوسرا فرقہ حدیثوں کو استنباطِ احکام اور استخراج مسایل کے لحاظ سے دیکھتا تھا اور اگر کوئی نص صریح نہیں ملتی تھی تو قیاس سے کام لیتا تھا۔ اگرچہ یہ دونو حیثیتیں دونوں فریق میں کسی قدر مشترک تھیں لیکن وصفِ غالب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز تھا۔ پہلا فرقہ اہل الروایۃ۔ اور اہل الحدیث۔ اور دوسرا فرقہ مجتہد اور اہل الرائے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ امام مالک۔ سفیان ثوری۔ اوزاعی۔ اس لئے اہل الرائے کہلائے کہ وہ محدث ہونے کے ساتھ مجتہد مستقل اور بانی مذہب تھے۔ لیکن چونکہ ان لوگوں میں بھی معلوماتِ حدیث اور قوت اجتہاد کے لحاظ سے۔ اختلاف مراتب تھا۔ اس لئے اضافی طور پر کبھی کبھی اس فرقہ میں سے ایک کو اہل الرائے اور دوسرے کو اہل حدیث کہتے تھے۔ مثلاً امام مالک کی بہ نسبت امام ابو حنیفہ پر مجتہد اور اہل الرائے کا لقب زیادہ موزوں تھا۔ امام احمد حنبل سے ایک بار نصر بن یحیٰی نے پوچھا کہ آپ لوگوں کو ابو حنیفہ پر کیا اعتراض ہے۔" انہوں نے جواب دیا کہ "رائے"۔ نصر نے کہا کہ کیا امام مالک رائے پر نہیں عمل کرتے۔ امام احمد بن حنبل بولے کہ ہاں۔ لیکن ابو حنیفہ۔ رائے کو زیادہ دخل دیتے ہیں۔ نصر نے کہا تو حصّہ رسدی کے موافق دونوں پر الزام آنا چاہیئے نہ صرف ایک پر امام احمد حنبل کچھ جواب نہ دیسکے اور چُپ ہو گئے[۱]

امام صاحب کے اہل الرائے کے لقب سے مشہور ہونیکی وجہ

امام ابو حنیفہ سے پہلے فقہ۔ کوئی مُستقل اور مرتب فن نہ تھا۔ امام صاحب نے جب اُسکی تدوین کی طرف توجہ کی تو ہزاروں مسئلے ایسے پیش آئے جن میں کوئی حدیث صحیح۔ بلکہ صحابہ کا قول بھی موجود نہ تھا۔ اسلئے اُن کو قیاس سے کام لینا پڑا۔ قیاس پر گو پہلے بھی عمل تھا۔ خود صحابہ قیاس کرتے تھے اور اُس کے مطابق فتوے دیتے تھے (اس کا مفصّل بیان آگے آئیگا) لیکن اُسوقت تک تمدّن کو چنداں وسعت حاصل نہ تھی۔ اسلئے نہ کثرت سے واقعات پیش آتے تھے نہ چنداں قیاس کی ضرورت پڑتی تھی۔ امام صاحب نے فقہ کو مستقل فن بنانا چاہا تو قیاس کی کثرت استعمال کے

ساتھ اُس کے اصول و قواعد بھی مرتب کرنے پڑے۔ اِس بات نے اُن کو رائے اور قیاس کے انتساب سے زیادہ شہرت دی۔ چنانچہ تاریخوں میں جہاں اُن کا نام لکھا جاتا ہے امام اہل الرائے لکھا جاتا ہے۔

اِس شہرت کی ایک اور وجہ ہوئی۔ عام محدثین۔ حدیث و روایت میں درایت سے بالکل کام نہیں لیتے تھے۔ امام ابوحنیفہ نے اُس کی ابتدا کی۔ اور اُس کے اصول و قواعد منضبط کئے۔ اُنھوں نے بہت سی حدیثیں اِس بنا پر قبول نہ کیں کہ اصولِ درایت کے موافق ثابت نہ تھیں اسلئے اس لقب کو زیادہ شہرت ہوئی۔ کیونکہ درایت۔ اور رائے مترادف سے الفاظ ہیں۔ اور کم از کم یہ کہ عام لوگ اِن دونوں میں فرق کر سکتے تھے۔

امام ابوحنیفہ کا محدث اور حافظ الحدیث ہونا

اِن عارضی بحثوں کے بعد ہم اصل مسئلہ پر متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ امام ابوحنیفہ کو فن حدیث میں کیا رتبہ حاصل تھا۔ اِس بحث کے فیصلے کے لئے اُن کی علمی زندگی کے اُن واقعات پر نظر ڈالنی چاہئے۔ جو نہایت صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت ہیں اِس کتاب کے پہلے حصہ میں ہم امام ابوحنیفہ کی تحصیل حدیث کے حالات۔ اُن کتابوں کی سند سے لکھ آئے ہیں۔ جن پر فن رجال کا دار و مدار ہے۔ اب غور کرو کہ جس شخص نے بیس برس کی عمر سے جو فہم کی درستی اور پختگی کا زمانہ ہے۔ علم حدیث پر توجہ کی ہو۔ اور ایک مدت تک اِس شغل میں مصروف رہا ہو جس نے کوفہ کے مشہور شیوخ حدیث سے حدیثیں سیکھی ہوں۔ جو حرم محترم۔ کی درسگاہوں میں برسوں تحصیل حدیث کرتا رہا ہو۔ جس کو مدینہ منورہ کے شیوخ نے سند فضیلت دی ہو۔ جس کے اساتذۂ حدیث عطاء بن ابی رباح۔ نافع بن عمر۔ عمرو بن دینار۔ محارب بن دثار۔ اعمش۔ کوفی۔ امام باقر۔ علقمہ بن مرثد۔ مکحول شامی۔ امام اوزاعی۔ محمد بن مسلم الزہری۔ ابواسحٰق السبیعی۔ سلیمان بن یسار۔ عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج۔ منصور المعتمر۔ ہشام بن عروہ۔ وغیرہ ہوں۔ جو فن روایت کے ارکان ہیں۔ اور جن کی روایتوں سے بخاری و مسلم مالا مال ہیں۔ وہ حدیث میں کس رتبہ کا شخص ہوگا؟

اس کے ساتھ۔ امام صاحب کے شاگردوں پر لحاظ کرو۔ یحییٰ بن سعید القطان جو فن جرح و تعدیل کے امام ہیں۔ عبدالرزاق بن ہمام جن کے جامع کبیر سے۔ امام بخاری نے فائدہ اُٹھایا ہے یزید بن ہارون۔ جو امام احمد حنبل کے اُستاد تھے۔ وکیع بن الجراح۔ جن کی

لہ ان لوگوں کا تذکرہ اس کتاب کے خاتمہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہے ۱۲

نسبت امام احمد حنبل کہا کرتے تھے کہ حفظ آسناد۔ روایت میں میں نے اُن کا ہمسر کسی کو نہیں دیکھا عبد اللہ بن المبارک جو فن حدیث میں امیر المومنین تسلیم کئے گئے ہیں یحیی بن زکریا بن ابی زائدہ۔ جن کو علی بن المدینی (اُستاد بخاری) انتہائے علم کہلاتے تھے۔ یہ لوگ برائے نام امام صاحب کے شاگرد نہ تھے بلکہ برسوں اُن کے دامن فیض میں تعلیم پائی تھی اور اس انتساب پر اُن کو فخر و ناز تھا عبد اللہ بن المبارک کہا کرتے تھے کہ اگر خدا نے ابو حنیفہ و سفیان ثوری سے میری مدد نہ کی ہوتی تو میں ایک معمولی آدمی ہوتا۔ وکیع۔ اور یحیی بن ابی زائدہ۔ امام صاحب کی صحبت میں اتنی مدت تک رہے تھے کہ صاحب ابی حنیفہ کہلاتے تھے کیا اس رتبہ کے لوگ جو خود حدیث و روایت کے پیشوا اور مقتدا تھے کسی معمولی شخص کے سامنے سر جھکا سکتے تھے؟

اجتہاد کے شروط اور امام ابو حنیفہ کا مجتہد مطلق ہونا

ان باتوں کے علاوہ امام ابو حنیفہ کا مجتہد مطلق ہونا ایک ایسا مسلم مسئلہ ہے جس سے بارہ سو برس کی مدت میں شاید ایک آدہ ہی شخص نے انکار کیا ہو۔ اجتہاد کی تعریف۔ علمائے حدیث۔ مثلاً۔ بغوی۔ رافعی۔ علامہ نووی۔ وغیرہ نے ان لفظوں میں کی ہے " مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن۔ حدیث۔ مذاہب سلف۔ لغت۔ قیاس۔ ان پانچ چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو یعنے مسائل شرعیہ کے متعلق جسقدر قرآن میں آیتیں ہیں جو حدیثیں رسول اللہ صلعم سے ثابت ہیں جس قدر علم لغت درکار ہے۔ سلف کے جو اقوال ہیں۔ قیاس کے جو طریق ہیں قریب کل کے جانتا ہو۔ اگر ان میں سے کسی میں کمی ہے تو وہ مجتہد نہیں ہے۔ اور اُس کو تقلید کرنی چاہئے"[۲]

اسی بنا پر علامہ بن خلدون نے فصل علوم الحدیث۔ میں مجتہدین کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ " بعض نا انصاف مخالفین کا قول ہے کہ ان مجتہدوں میں سے بعض۔ فن حدیث میں کم مایہ تھے۔ اسلئے اُن کی روائتیں کم ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ائمہ کبار کی نسبت یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ شریعت۔ قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے پس جو شخص حدیث۔ میں کم مایہ ہے اُس کو تلاش اور کوشش کرنی چاہئے تاکہ دین کو اصول صحیحہ سے اخذ کر سکے" اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ " فن حدیث میں امام ابو حنیفہ کا کبار مجتہدین میں ہونا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا مذہب محدثین میں معتبر خیال کیا جاتا ہے اور رداً و قبولاً اُس سے بحث کیجاتی

[۱] تہذیب التہذیب ترجمہ امام ابو حنیفہ ۱۲ [۲] عقد الجید شاہ ولی اللہ صاحب بحث حقیقت اجتہاد ۱۲

ہے[1]۔ علامۂ موصوف نے اِس کا سبب بھی بتایا ہے۔ کہ امام ابوحنیفہ کی رُوایتیں کم کیوں ہیں۔ ہم خود اس کو مفصل لکھیں گے۔

محدثین میں بھی اکثروں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ علامۂ ذہبی نے جو زمانۂ مابعد کے تمام محدثین کے پیشوا اور امام ہیں۔ حفاظِ حدیث کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "یہ اُن لوگوں کا تذکرہ ہے جو علم نبوی کے حامل ہیں اور جن کے اجتہاد پر توثیق اور تضعیف۔ تصحیح و تزئیف میں رجوع کیا جاتا ہے۔" علامہ موصوف نے تمام کتاب میں اِس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور کسی ایسے شخص کا حال نہیں لکھا جو علم حدیث کا بڑا ماہر نہ ہو۔ چنانچہ خارجہ بن زید بن ثابت کا ضمناً ایک موقع پر ذکر آگیا ہے تو لکھتے ہیں۔ کہ "میں نے اُن کو حفاظ حدیث میں اسلئے ذکر نہیں کیا کہ وہ قلیل الحدیث تھے۔" امام ابوحنیفہ کے محدث ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت درکار ہے کہ علامۂ ذہبی نے اس کتاب میں اُن کا ترجمہ لکھا ہے اور اُن کو حفاظ حدیث سے شمار کیا ہے۔

محدث ذہبی نے امام ابوحنیفہ کو حفاظ حدیث میں محسوب کیا ہے ۱۲

حافظ ابوالمحاسن دمشقی شافعی نے عقود الجمان[2] میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کے یہ الفاظ ہیں الباب الثالث والعشرون۔ فی بیان کثرۃ حدیثه وکونه من اعیان الحفاظ المحدثین۔ یعنی تئیسواں باب اس بیان میں ہے کہ وہ (امام ابوحنیفہ) کثیر الحدیث اور اعیان الحفاظ سے تھے۔" قاضی ابویوسف صاحب جنکو یحیٰی بن معین۔ صاحب الحدیث کہتے تھے۔ اور علامۂ ذہبی نے اُن کو حفاظ حدیث میں محسوب کیا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ "ہم لوگ امام ابوحنیفہ سے مسائل میں بحث کرتے ہوتے تھے۔ جب اُن کی رائے قایم ہو جاتی تھی تو میں حلقۂ درس سے اُٹھ کر کوفہ کے محدثین کے پاس جاتا تھا۔ اور اُن سے اُس مسئلہ کے متعلق حدیثیں دریافت کرکے

---

[1] تعجب ہے کہ اس تصریح کے ہوتے ہوئے بعض کوتاہ بینوں نے امام صاحب کی ناواقفیت حدیث پر۔ ابن خلدون کے ایک ضمنی قول سے استدلال کیا ہے جس کو خود ابن خلدون نے ایسے لفظوں سے بیان کیا ہے جو ضعف اور عدم وثوق پر دلالت کرتا ہے ۲[2] عقود الجمان ۱۲

امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔

امام صاحب اُن حدیثوں میں سے بعض کو قبول کرتے تھے۔ بعض کو فرماتے تھے کہ صحیح نہیں ہیں میں پوچھتا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔ فرماتے کہ کوفہ میں جو علم ہے۔ میں اُس کا عالم ہوں۔

یہ تمام باتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ علم حدیث میں امام ابوحنیفہ کا کیا پایہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں نے امام ابوحنیفہ کو امام ابوحنیفہ نہیں بنایا۔ اگر وہ حافظ الحدیث تھے تو اور لوگ بھی تھے اگر اُن کے شیوخ حدیث کئی سو تھے تو بعض ایمہ سلف کے شیوخ کئی کئی ہزار تھے اگر اُنہوں نے کوفہ وحرمین کی درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی تو اوروں نے بھی یہ شرف حاصل کیا تھا۔ امام ابوحنیفہ کو جس بات نے تمام ہمعصروں میں امتیاز دیا وہ اور چیز ہے جو ان سب باتوں سے بالاتر ہے یعنی احادیث کی تنقید اور بلحاظ ثبوت احکام۔ اُن کے مراتب کی تفریق امام ابوحنیفہ کے بعد علم حدیث کو بہت ترقی ہوئی غیر مرتب اور پریشان حدیثیں یکجا کی گئیں صحاح کا التزام کیا گیا۔ اصول حدیث کا مستقل فن قائم ہو گیا جس کے متعلق سیکڑوں بیش بہا کتابیں تصنیف ہوئیں زمانہ اس قدر ترقی کر گیا ہے۔ باریک بینی اور دقت آفرینی کی کوئی حد نہیں رہی تجربہ اور وقتِ نظر نے سیکڑوں نئے نکتے ایجاد کئے لیکن تنقید احادیث اصول درائیت امتیاز مراتب۔ میں امام ابوحنیفہ کی تحقیق کی جو حد ہے آج بھی ترقی کا قدم اُس سے آگے نہیں بڑھتا۔

اس اجمال کی تفصیل اُسوقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ فن حدیث کی آغاز اور طرز ترقی کا اجمالی نقشہ کھینچا جائے۔ جس سے ظاہر ہو کہ روایتوں کا سلسلہ کیونکر پیدا ہوا۔ اور کس کس دور میں اُسکی کیا کیا حالتیں بدلیں۔ اِسی سے اس بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ احادیث کی تنقید میں اجتہاد و رائے کا کس قدر کام ہے اور امام ابوحنیفہ کو اِس لحاظ سے اپنے تمام ہم فنوں میں کیا خاص امتیاز حاصل ہے۔

سلسلہ حدیث کی مختصر تاریخ

اسناد و روائیت کا سلسلہ اگرچہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو چکا تھا لیکن اُسوقت تک جسقدر تھا نہایت سادہ اور قدرتی صورت میں تھا۔ آغاز نبوت سے تیرہ برس کا زمانہ تو ایسا پُر آشوب زمانہ تھا کہ صحابہ کو اپنی جان کی پڑی تھی اسناد و روائیت کا کہاں موقع تھا اسی ضرورت سے احکام و فرائض بھی کم تھے۔ یعنی نماز کے سوا اور کچھ فرض نہ ہوا تھا۔ کیونکہ اس زحمت میں اور فرائض

کی تکلیف۔ تکلیف مالایطاق سے کم نہ تھی۔ نمازیں بھی مختصر تھیں یعنی ظہر عصر عشا سب میں صرف دو دو رکعتیں فرض تھیں۔ جمعہ و عیدین سرے سے مامور بہ نہ تھے۔ ۲سنہ ہجری میں یعنی نبوت سے تیرھویں برس روزے فرض ہوئے۔ زکوٰۃ کی نسبت اختلاف ہے علامہ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ ۹ھ میں فرض ہوئی۔ حج کا حکم بھی اسی سنہ میں ہوا۔ غرض آغاز نبوت سے ایک مدت تک نماز کے سوا نہ اور احکام صادر ہوئے تھے نہ اُن کے متعلق حدیثیں اور روائتیں پیدا ہوئی تھیں۔ صحابہ مسائل و احکام کے متعلق زیادہ پرس و جو نہیں کرتے تھے۔ خود قرآن میں حکم آچکا تھا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسوء کم۔ عبداللہ بن عباس فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ کے اصحاب سے کسی قوم کو بہتر نہیں دیکھا۔ تمام زمانۂ نبوت میں صرف ۱۳ مسئلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے جو سب قرآن میں مذکور ہیں[۵۱]۔ اور صحابہ سے بھی اسی قسم کے اقوال منقول ہیں۔

جو احکام اور واقعات پیش آتے تھے ان میں بھی روایت کا سلسلہ کم جاری ہوا تھا۔ صحابہ خود رسول اللہ سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ اور واسطہ و روایت کی کم ضرورت پڑتی تھی۔ حدیثوں کے قلم بند کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ لاتکتبوا عنی شیئًا الا القران ومن کتب عنی شیئًا غیر القران فلیمحہ۔ رسول کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت شروع ہوئی ابتداء ہی

حضرت عمرؓ کثرت روایت کو روکتے تھے

۵۱ مسند دارمی ۱۲ ۵۲ مشارق الانوار میں ہے عن ابو سعید۔ لَا تَکْتُبُوْا عَنِّیْ وَمَنْ کَتَبَ عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْاٰنِ فَلْیَمْحُہٗ وَحَدِّثُوْا عَنِّیْ وَلَا تَکْذِبُوْا عَلَیَّ۔ ھٰذَا حَدِیْثٌ مَنْسُوْخٌ۔ بخاری اور مسلم میں ابو سعید روایت ہے۔ کہ حضرت نے فرمایا کہ: لکھو میری حدیث کو۔ سو جس نے مجھ سے سُن کر سوائے قرآن کے جو لکھا ہو اُسکو مٹا ڈالے اور حدیث نقل کرو مجھ سے یعنی جو بات مجھ سے سنو وہ لوگوں کو سکھاؤ۔ اور مجھ پر جھوٹ نہ باندھو" صغانی مشارق الانوار والے کہتے ہیں کہ اس حدیث کا اوّل مضمون یعنی حدیث کے لکھنے کو منع فرمانا منسوخ ہے[۱۲۹]"۔ حضرت عمرؓ کا حدیث کو قلمبند کرنے سے روکنا یا کثرت روایت سے منع فرمانا احتیاطًا تھا۔ کہ حدیث اور قرآن باہم مخلوط نہ ہو جائیں۔ اُس زمانہ میں یہ احتیاط ضروری بھی تھی۔ لیکن ابو ہریرہؓ کی حدیث کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ابو شاہ یمنی کو حدیث لکھوا دی قطعی ممانعت تحریر حدیث نہیں رہنے دیتی اور یہ ہی درست بھی ہے۔ کیونکہ صحاح ستہ کا جمع ہو جانا اس طرح خلاف حکم حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرتا ہے ۱۲ سید مبارک علی شاہ گیلانی مولوی فاضل ؎

میں عرب کی بغاوتِ عام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اِس سے فارغ ہو کر روم و ایران کی مہمیں شروع ہو گئیں۔ اور اُن کی مختصر خلافت میں حدیثوں کی چنداں اشاعت نہ ہو سکی حضرت عمرؓ نے سات برس خلافت کی اور مُلک میں نہائیت امن و امان رہا۔ لیکن وہ دانستہ حدیثوں کی کثرت کو روکتے رہے۔ علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ۔ اس خوف سے کہ حدیث بیان کرنے والا رسول اللہؐ کی طرف غلط روائیت منسوب نہ کر دے۔ صحابہ کو ہمیشہ حکم دیتے تھے کہ حدیثیں کم بیان کیا کریں۔[۵۱] ایک بار انصار کے ایک گروہ کو کوفہ بھیجا۔ چلتے وقت اُن سے فرمایا کہ "تم لوگ کوفہ۔ جا رہے ہو۔ وہاں ایک قوم سے ملو گے جو بڑی رقت سے قرآن تلاوت کرتے ہیں۔ وہ تمہاری آمد سُن کر مشتاق ہونگے کہ رسول اللہؐ کے اصحاب آئے ہیں رسول اللہؐ کے اصحاب آئے ہیں لیکن جب وہ تمہارے پاس آئیں اور حدیثیں سننی چاہیں تو زیادہ حدیثیں نہ بیان کرنا"[۵۲] اسی طرح عراق۔ کو صحابہ جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے خود اُن کی مشایعت کی۔ اور اُن سے پوچھا کہ "جانتے ہو ایں کیوں تمہارے ساتھ آ رہا ہوں" لوگوں نے تکرمۃً علینا۔ یعنی ہماری عزت افزائی کے لئے" فرمایا کہ "ہاں لیکن ایک اور مقصد ہے۔ وہ یہ کہ جہاں جا رہے ہو وہاں لوگ اکثر قرآن کی تلاوت کیا کرتے ہیں۔ اُن کو حدیثوں میں نہ پھنسا لینا اور رسول اللہؐ سے کم روائیت کرنا چنانچہ جب یہ لوگ قرظہ پہنچے۔ تو لوگ یہ سُن کر کہ صحابہ تشریف لائے ہیں زیارت کو آئے۔ اور حدیثوں کی خواہش ظاہر کی۔ اِن لوگوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ "حضرت عمرؓ نے منع کیا ہے"[۵۳] حضرت ابو ہریرہؓ سے ابو سلمہ نے پوچھا کہ آپ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اس طرح حدیثیں روائیت کیا کرتے تھے۔ بولے کہ "نہیں ورنہ عمرؓ۔ درہ مارتے"[۵۴]

حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ۔ کی مجموعی خلافت بیس کیس برس رہی۔ اس میں احادیث کی زیادہ اشاعت ہوئی۔ صحابہ دور دور پہنچ گئے تھے۔ ضرورتیں بڑھتی جاتی تھیں۔ نئے نئے مسئلے پیش آتے تھے۔ اِن اسباب نے حدیث و روائیت کے سلسلہ کو بہت وسعت دی۔ حضرت عثمانؓ کے اخیر زمانہ میں بغاوت ہوئی جس کا خاتمہ خلیفہ وقت کی شہادت پر ہُوا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ

---

۵۱ طبقات الحفاظ ترجمہ حضرت عمرؓ ۱۲ ۵۲ مسند دارمی ۱۲ ۵۳ طبقات الحفاظ۔ ترجمہ حضرت عمر فاروقؓ

۵۴ طبقات الحفاظ۔ ترجمہ عمر فاروقؓ ۱۲

حدیثوں کا وضع کیا جانا

جماعت اسلام میں فرقہ بندیاں قائم ہوئیں۔ حضرت علیؓ کی خلافت شروع ہی سے پُر آشوب رہی۔ ان اختلافات اور فتن کے ساتھ وضع احادیث کی ابتدا ہوئی اور اگرچہ کثرت اور انتشار زیادہ تر زمانۂ مابعد میں ہوا۔ لیکن خود صحابہ کے عہد میں اہل بدعت نے سیکڑوں ہزاروں حدیثیں ایجاد کر لی تھیں۔ مقدمہ صحیح مسلم۔ میں ہے کہ ایکبار بشیر عدوی۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس آیا اور حدیث بیان کرنی شروع کی۔ اُنہوں نے کچھ خیال نہ کیا بشیر نے کہا ابن عباس! میں رسول اللہؐ سے روایت کر رہا ہوں اور تم متوجہ نہیں ہوتے۔" فرمایا کہ" ایک زمانہ میں ہمارا یہ حال تھا کہ کسی کو قال رسول اللہ کہتے سُنتے تھے تو فوراً ہماری نگاہیں اُٹھ جاتی تھیں اور کان لگا کر سُنتے تھے لیکن جب سے لوگوں نے نیک و بد میں تمیز نہیں رکھی ہم صرف اُن حدیثوں کو سُنتے ہیں جن کو ہم خود بھی جانتے ہیں"

زبانی روائیت سے گذر کر تحریروں میں بھی جعل شروع ہو گیا تھا۔ مسلم نے روائیت کی ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن عباس۔ حضرت علیؓ کے ایک فیصلہ کی نقل لے رہے تھے بیچ بیچ میں الفاظ چھوڑتے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ" واللہ علیؓ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا ہوگا اسی طرح ایک اور دفعہ عبداللہ بن عباس نے حضرت علیؓ کی ایک تحریر دیکھی تو تھوڑے سے الفاظ کے سوا باقی سب عبارت مٹا دی۔

وضع حدیث اور روایت میں بے احتیاطی کے اسباب

لوگوں کو وضع حدیث کی زیادہ جرأت اسوجہ سے ہوتی تھی کہ اُسوقت تک اسناد و روائیت کا طریقہ جاری نہیں ہُوا تھا۔ جو شخص چاہتا تھا قال رسول اللہ کہدیتا تھا۔ اور اثبات سند کے مواخذہ سے بری رہتا تھا۔ ترمذی نے کتاب العلل۔ میں امام ابن سیرین سے روایت کی ہے کہ" پہلے زمانہ میں لوگ اسناد نہیں پوچھا کرتے تھے۔ جب فتنہ پیدا ہُوا تو اسناد کی پوچھ گچھ ہوئی۔ تاکہ اہل سنت کی حدیثیں لی جائیں اور اہل بدعت کی ترک کی جائیں" لیکن حدیث کی بے اعتباری اہل بدعت پر موقوف نہ تھی۔ اس لئے یہ احتیاط چنداں مفید نہ ہوئی اور غلطیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

بنو امیہ۔ کا دور شروع ہُوا اور بڑے زور شور سے حدیث نے ترویج پائی۔ صحابہ کی تعداد جس قدر کم ہوتی جاتی تھی۔ اُسی قدر۔ اُن کی قدر اور اُن کی طرف التفات بڑھتا جاتا تھا۔ تمدن

میں بہت کچھ ترقی ہوگئی تھی۔ نئی نئی قومیں مسلمان ہوتی جاتی تھیں۔ اِن نومسلموں کو اودھر تو اسلام کا نیا نیا جوش تھا۔ اُودھر۔ قوم فاتح کے مجمع میں عزت و اثر پیدا کرنے کی اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہ تھی۔ ان باتوں نے اُن کو معلومات مذہبی کا اسقدر شائق بنا دیا تھا کہ خود عرب۔ اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ غرض تمام ممالک اسلامیہ میں گھر گھر حدیث و روائیت کے چرچے پھیل گئے اور سیکڑوں ہزاروں درسگاہیں قائم ہوگئیں۔

لیکن جس قدر اشاعت کو وسعت حاصل ہوتی جاتی تھی۔ اعتماد اور صحت کا معیار کم ہوتا جاتا تھا ارباب روائیت کا دائرہ اسقدر وسیع تھا کہ اُس میں مختلف خیال مختلف عادات۔ مختلف عقاید۔ مختلف قوم کے لوگ شامل تھے۔ اہل بدعت جا بجا پھیل گئے تھے۔ اور اپنے مسائل کی ترویج میں مصروف تھے۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری ایک صدی گذر جانے پر بھی کتابت کا طریقہ مروج نہیں ہوا تھا۔ ان اسباب سے روائیتوں میں اسقدر بے احتیاطیاں ہوئیں کہ **موضوعات** اور اغالیط کا ایک دفتر بے پایاں تیار ہوگیا۔ یہاں تک کہ امام بخاری نے اپنے زمانہ میں صحیح حدیثوں کو جدا کرنا چاہا تو کئی لاکھ میں سے انتخاب کر کے جامع صحیح لکھی جس میں کُل ۷۲۹۷ حدیثیں ہیں اُس میں بھی اگر مکررات نکال ڈالی جائیں تو صرف ۲۷۶۱ حدیثیں باقی رہتی ہیں۔

زنادقہ نے چودہ ہزار حدیثیں وضع کیں ایک شخص نے چار ہزار حدیثیں وضع کیں۔

سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں حدیثیں دانستہ لوگوں نے وضع کرلیں۔ حماد بن زید کا بیان ہے کہ چودہ ہزار حدیثیں صرف ایک فرقہ زنادقہ[ا] نے وضع کرلیں۔ عبدالکریم وضاع نے خود تسلیم کیا تھا کہ چار ہزار حدیثیں اُس کی موضوعات سے ہیں[۲]۔ بہت سے ثقات اور پارسا تھے جو نیک نیتی سے فضائل اور ترغیب میں حدیثیں وضع کرتے تھے حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں کہ "ان حدیثوں نے بہت ضرر پہنچایا کیونکہ ان واضعین کی ثقہ اور تورع و زہد کی وجہ سے یہ حدیثیں اکثر مقبول ہوگئیں اور رواج پا گئیں۔

وضع کے بعد۔ مسامحات۔ غلط فہمیاں۔ بے احتیاطیوں کا درجہ تھا۔ جن کی وجہ سے ہزاروں اقوال رسول اللہؐ کی طرف بے قصد منسوب ہو گئے۔ بعض محدثین۔ کا قاعدہ تھا کہ حدیث کے ساتھ۔ حدیث کی تفسیر بھی بیان کرتے جاتے تھے اور اکثر حروف تفسیر حذف کر دیتے تھے جس سے سامعین کو دھوکا ہوتا تھا اور وہ اُن کے تفسیری جملوں کو بھی حدیث مرفوع

[ا] فتح المغیث صفحہ ۱۰۰۔ [۲] فتح المغیث صفحہ ۱۰۰۔

سمجھ لیتے تھے۔ تعجب یہ ہے کہ اس قسم کے مسامحات بڑے بڑے ائمہ فن سے صادر ہوئے امام زہری۔ جو امام مالک۔ کے استاد۔ اور حدیث کے ایک بڑے رکن تھے۔ اُن کی نسبت علامۂ سخاوی۔ لکھتے ہیں وکذا کان الزھری یفسر الحدیث کثیرا وربما اسقط اداۃ التفسیر یعنی اُسی طرح۔ زہری۔ اکثر حدیث کی تفسیر کرتے تھے اور وہ حروف جن سے اُس عبارت کا تفسیر ہونا ظاہر ہو۔ چھوڑ دیا کرتے تھے۔" وکیع۔ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اکثر حدیث کے بیچ بیچ میں "یعنی" کہکر مطلب بیان کرتے جاتے۔ اور اکثر "یعنی" کا لفظ چھوڑ دیتے تھے جس سے سامعین کو اشتباہ ہوتا تھا۔ کتب رجال و اصول حدیث میں اس قسم کی اور بہت مثالیں ملتی ہیں۔

بڑی آفت تدلیس کی تھی جس کا ارتکاب بڑے بڑے ائمہ فن کرتے تھے۔ اِس تدلیس نے اسناد کے اتصال کو بالکل مشتبہ کر دیا تھا ان کے سوا اور بہت سی بے احتیاطیاں تھیں جنکی تفصیل حدیث کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔

غرض امام ابو حنیفہ کے زمانہ میں احادیث کا جو دفتر تیار ہو چکا تھا۔ ہزاروں۔ موضوعات اغالیط ضعاف۔ مدرجات۔ سے بھرا ہوا تھا۔ اُسوقت امام بخاری۔ و مسلم نہ تھے۔ جو صحیح حدیثوں کے انتخاب کی کوشش کرتے۔ امام ابو حنیفہ۔ گو مہمات فقہ کی وجہ سے اس طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ تاہم اُنہوں نے روایتوں کی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ اور اُس کے اصول و ضوابط قرار دئیے اُنکے اصولِ تنقید نہایت سخت خیال کئے گئے ہیں۔ یہانتک کہ محدثین نے اُن کو مشدد فی الروایۃ کا لقب دیا ہے۔ تمام اور محدثین کی بہ نسبت امام صاحب کی قلیل الروایۃ ہونے کی ایک یہ بھی وجہ ہے بلکہ تمام اور وجوہ کی بہ نسبت یہ زیادہ قوی سبب ہے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں۔

والامام ابو حنیفۃ انما قلّت روایتہ لما شدّد فی شروط الروایۃ والتحمل۔

یعنی ابو حنیفہ کی روائتیں اسلئے کم ہیں کہ اُنہوں نے روایت اور تحمل کی شروط میں سختی کی۔"

امام صاحب کا خیال تھا کہ بہت کم حدیثیں صحیح ہیں

حدیث کے متعلق پہلا اجمالی خیال جو امام صاحب کے دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ بہت کم حدیثیں ہیں جو صحیح ہیں۔ یا یہ کہ بہت کم حدیثیں ہیں جن کی صحت کا کافی ثبوت موجود ہے۔ یہ صداء۔ اگرچہ جدت کی وجہ سے کسی قدر نامانوس صدا تھی اور اسی وجہ سے بعض بعض ارباب حدیث نے نہایت سخت مخالفت کی۔ لیکن امام صاحب اِس خیال پر مجبور بلکہ معذور تھے۔ اُنہوں نے

یہ رائے مقلدانہ نہیں قایم کی تھی۔ وہ اپنے زمانہ کے اکثر مشہور شیوخ سے ملے تھے۔ اور اُن کے سرمایۂ حدیث سے متمتع ہوئے تھے۔ حرمین کی بڑی بڑی درسگاہوں میں برسوں تعلیم پائی تھی۔ کوفہ۔ بصرہ۔ حرمین۔ میں ارباب روائیت کا جو گروہ موجود تھا برسوں کے تجربہ سے اُن کے ذاتی اوصاف۔ اخلاق وعادات۔ پر اطلاع حاصل کی تھی غرض اس مسئلہ کے متعلق اثباتاً یا نفیاً مجتہدانہ رائے قایم کرنے کے لئے جو شرطیں درکار تھیں۔ سب اُن میں موجود تھیں۔

اس خیال کا ایک بڑا اسبب

اِس خیال کا ایک بڑا اسبب یہ بھی تھا کہ یہ مسئلہ کسی نہ کسی پیرایہ میں اُن کے خاندان تعلیم میں وراثتاً چلا آتا تھا۔ حدیث وفقہ میں اُن کے خاندانِ تعلیم کے مورثِ اوّل۔ عبداللہ بن مسعودؓ ہیں اور مذہب حنفی کی بنیاد زیادہ تر انہیں کی روایات واستنباطات پر ہے۔ عبداللہ بن مسعود اگرچہ بہت ہی بڑے محدث تھے لیکن اور محدثین صحابہ کی نسبت قلیل الروائیۃ تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مشدد اور محتاط تھے۔ علاّمہ ذہبی۔ اُن کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ممن یتحری فی الاداء ویشدد فی الروایۃ ** وکان یقل من الروایۃ للحدیث یعنی عبداللہ بن مسعود اداء میں تحری اور روائیت میں تشدّد کرتے تھے۔ اور حدیث کی روائیت کم کرتے تھے" ابراہیم نخعی۔ جو عبداللہ بن مسعود کے بہ یک واسطہ شاگرد اور امام ابوحنیفہ کے بہ یک واسطہ اُستاد تھے۔ اُن کا بھی یہی مذہب تھا اور اسی وجہ سے وہ صیرفی الحدیث کہلاتے تھے۔ امام ابوحنیفہ نے گو اور بہت سے درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی لیکن اُن کی معلومات اور خیالات کا اصلی مرکز یہی خاندان تھا۔ یہی خاندانی اثر تھا جس نے اُن کے دل میں یہ خیال پیدا کیا۔ اور اُس کو اُن کے ذاتی تجربہ اور دقتِ نظر نے اور بھی قوت دی۔

امام مالکؒ امام ابوحنیفہ کی شرط روائیت قریب قریب متحد ہیں

امام صاحب کے اِس خیال نے اگرچہ قبول عام کی سند حاصل نہیں کی تاہم وہ بالکل بے اثر نہیں رہا۔ امام مالک وامام شافعی۔ جو اجتہاد میں امام ابوحنیفہ سے متاخر ہیں اُن کے اصول اجتہاد میں اِس خیال کا صاف پرتو پایا جاتا ہے۔ امام مالک نے روائیت کے متعلق جو قید اور شرطیں لگائی ہیں وہ امام ابوحنیفہ کے شرائط کے قریب قریب ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مشددین فی الروائیۃ۔ میں۔ امام ابوحنیفہ وامام مالک کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ ابن الصلاح۔ مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ ومن مذاھب التشدید مذھب من قال لاحجۃ

الا فیما رواہ الراوی من حفظہ وتذکرہ وذلک مروی عن مالک وابی حنیفۃ یعنی متشددین کا یہ مذہب ہے کہ صرف وہ حدیث قابل حجت ہے جس کو راوی نے اپنی حفظ سے یاد رکھا ہو اور یہ قول مالک وابوحنیفہ سے منقول ہے۔" محدثین نے لکھا ہے کہ امام مالک نے اوّل جب موطاء لکھی تو اُس میں دس ہزار حدیثیں تھیں۔ پھر امام مالک زیادہ تحقیق کرتے گئے تو یہ تعداد کم ہوتی گئی۔ یہانتک کہ چھ سات سو رہ گئی۔ امام شافعی نے صاف لفظوں میں امام ابوحنیفہ کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ امام بیہقی نے روایت کی ہے کہ ایک دن ہرم قرشی نے امام شافعی سے کہا کہ آپ وہ حدیثیں لکھوا لیئے جو رسول اللہؐ سے ثابت ہیں۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ "ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں کم ہیں۔ کیونکہ ابوبکر صدیقؓ نے جو حدیثیں رسول اللہؐ سے روایت کیں اُن کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں ہے۔ عمر بن الخطابؓ باوجود اس کے کہ رسول اللہؐ کے بعد مدت تک زندہ رہے اُن کی روائیت سے پچاس حدیثیں بھی ثابت نہیں۔ حضرت عثمانؓ کا بھی یہی حال ہے۔ حضرت علیؓ۔ اگرچہ لوگوں کو حدیث سیکھنے کی ترغیب دلاتے تھے۔ لیکن اُن سے بھی کم حدیثیں مروی ہیں کیونکہ وہ مطمئن نہیں رہے۔ اُن سے جو حدیثیں مروی ہیں اکثر حضرت عمرؓ۔ اور حضرت عثمانؓ۔ کے عہد خلافت کی ہیں۔ ان لوگوں کے سوا اور صحابہ سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں لیکن اہل معرفت کے نزدیک وہ تمام روائیتیں صحیح سند سے ثابت نہیں۔"

امام شافعی کا قول تھا کہ صحیح حدیثیں بہت کم ہیں

اِن باتوں سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ امام ابوحنیفہ معتزلیوں کی طرح احادیث کے منکر تھے یا صرف دس بیس حدیثوں کو تسلیم کرتے تھے۔ اُن کے شاگردوں نے خود اُن سے سیکڑوں حدیثیں روائیت کیں ہیں۔ موطا امام محمد۔ کتاب الآثار۔ کتاب الحج۔ جو عام طور پر متداول ہیں اِن میں بھی امام صاحب سے بیسیوں حدیثیں مروی ہیں۔ البتہ اور محدثین کی نسبت اُن کی احادیث مسلّمہ کی تعداد کم ہے اور۔ اُس کی وجہ وہی شروطِ روائیت کی سختی ہے۔ امام صاحب نے روائیت کے متعلق جو شرطیں اختیار کیں کچھ تو وہی ہیں جو اور محدثین کے نزدیک مسلّم ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں وہ منفرد ہیں یا صرف امام مالک اور بعض اور مجتہدین اُن کے ہم زبان ہیں اِن میں سے ایک یہ مسئلہ ہے کہ صرف وہ حدیث حجت ہے

امام صاحب نے روائیت کیلئے کیا شرطیں مقرر کیں۔

جس کو راوی نے اپنے کانوں سُنا ہو اور روائیت کے وقت تک یاد رکھا ہو“ یہ قاعدہ بظاہر نہائیت صاف ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اُس کی تفریعین نہائیت وسیع اثر رکھتی ہیں اور عام محدثین کو اُن سے اتفاق نہیں ہے۔ محدثین کے نزدیک اِن پابندیوں سے روائیت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اور اس سے ہم کو بھی انکار نہیں لیکن اس کا فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں کہ احتیاط مقدم ہے یا روائیت کی وسعت۔ ہم بعض تفریعات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ امام ابو حنیفہ کو کس خیال نے اس قسم کی سختیوں پر مجبور کیا تھا۔

اکثر شیوخ کا حلقۂ درس نہائیت وسیع ہوتا تھا یہاں تک کہ ایک ایک مجلس میں دس دس ہزار سامعین جمع ہوتے تھے۔ اُسوقت متعدد مستملی یعنے نائب۔ جا بجا بٹھائے جاتے تھے کہ شیخ کے الفاظ کو دور والوں تک پہنچائیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہوتے تھے جن کے کانوں میں شیخ کا ایک لفظ بھی نہیں پہنچتا تھا وہ صرف مستملی کے الفاظ سُن کر حدیث روائیت کرتے تھے۔ اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ جس شخص نے صرف مستملی سے سُنا وہ اصل شیخ کی نسبت حدثنا کہہ سکتا ہے یا نہیں۔ اکثر ارباب روائیت کا مذہب ہے کہ کہہ سکتا ہے امام ابو حنیفہؒ اس کے خلاف ہیں۔ أیمہ محدثین میں سے حافظ ابو نعیم فضل بن دکین۔ زاید بن قدامۃ امام صاحب ہمزبان ہیں[1]۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ”مقتضائے عقل یہی (امام ابو حنیفہ کا) مذہب ہے لیکن عام مذہب میں آسانی ہے[2]“

امام ابو حنیفہؒ کو اس احتیاط پر جس چیز نے مجبور کیا تھا وہ یہ تھی کہ اُن کے زمانہ تک روائیت بالمعنی کا طریقہ نہائیت عام تھا اور بہت کم لوگ تھے جو الفاظ حدیث کی پابندی کرتے تھے۔ اسلئے روایات میں تغیر و تبدل کا احتمال ہر واسطہ میں بڑھتا جاتا تھا۔ کم از کم یہ کہ ہر روائیت پہلے واسطہ میں جسقدر قوی ہوتی تھی دوسرے واسطہ میں اُس کا وہ پایہ نہیں قائم رہ سکتا تھا۔ بے شبہ مستملی کے مقرر کرنے کا طریقہ قائم رکھنا ضرور تھا کیونکہ اکثر موقعوں پر بغیر مستملی کے کام نہیں چل سکتا تھا۔ لیکن نا انصافی تھی کہ جس شخص نے بلا واسطہ شیخ سے سنا ہو اور جس نے مستملی سے روائیت کی ہو دونوں کا ایک درجہ قرار دیا جاوے۔ مستملی کبھی کبھی نہائیت غافل اور بے سمجھ ہوتے تھے۔ اسلئے غلطیوں کا احتمال اور بھی قوی ہو جاتا تھا۔

[1] فتح المغیث صفحہ ۱۸۸ و صفحہ ۱۸۷ [2] فتح المغیث صفحہ ۱۲۸-۱۲

اخبرنا و حدثنا کی مفہوم کی وسعت

اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ غیر محتاط طریقہ یہ تھا کہ اخبرنا و حدثنا کو بعض بعض محدثین نہایت عام معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ امام حسن بصریؒ نے متعدد روایتوں میں کہا ہے حدثنا ابوھریرۃؓ حالانکہ ابوہریرہؓ سے وہ کبھی نہیں ملے تھے۔ انہوں نے اسکی یہ تاویل کی تھی کہ ابوہریرہؓ نے جب وہ حدیث بیان کی تھی تو اس شہر میں وہ موجود تھے۔ اسی طرح اور شیوخ۔ صحابہ کی نسبت حدثنا کا لفظ استعمال کرتے تھے اور معنی یہ لیتے تھے کہ اُن کے شہر والوں نے اُن شیوخ سے سُنا تھا۔ محدث بندارؒ[51] نے لکھا ہے کہ حسن بصریؒ نے اُن لوگوں سے روائت کی ہے جن سے وہ کبھی نہیں ملے۔ اور تاویل یہ کرتے تھے کہ اُن کی قوم نے وہ حدیث اُن لوگوں سے سُنی تھی[52]۔ یہ امر علاوہ اس کے کہ ایک قسم کی غلط بیانی تھی حدیث کی اسناد کو مشتبہ کر دیتا تھا کیونکہ راوی نے جب خود شیخ سے حدیث نہیں سُنی تو بیچ میں کوئی واسطہ ہوگا اور چونکہ راوی نے اُس کا نام نہیں بتایا اسلئے اُس کے ثقہ و غیر ثقہ ہونے کا حال نہیں معلوم ہو سکتا۔ صرف حُسن ظن پر مدار رکھا کہ ایسے شخص نے جس سے سُنا ہوگا وہ ضرور قابل استناد ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس طریقہ کو ناجائز قرار دیا۔ اور اُن کے بعد اور ائمہ حدیث نے بھی اُن کی متابعت کی۔

اجزاء سے روایت

ارباب روائت کا ایک یہ طریقہ تھا کہ جب کسی شیخ سے کچھ حدیثیں سُنیں اور قلمبند کر لیں تو اِن اجزاء سے روائت کرنی ہمیشہ جائز سمجھتے تھے۔ اس کو اسقدر وسعت دیگئی کہ گو راوی کو اُن حدیثوں کے الفاظ و معانی کچھ یاد نہ رہے ہوں تاہم اس بنا پر کہ اجزاء اُس کے پاس موجود ہیں اُن کی روائت کر سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اِس طریقہ کو قائم رکھا لیکن یہ قید لگائی کہ حدیث کے الفاظ و مطالب محفوظ ہونے چاہئیں ورنہ روائت جائز نہیں۔

یہ مسئلہ بھی اگرچہ عام طور پر نہیں تسلیم کیا گیا تاہم جیسا کہ محدث سخاوی نے تصریح کی ہے امام مالک اور بہت سے ائمہ فن نے اُس کی مُوافقت کی۔ امام بخاری و مسلم وغیرہ کے زمانہ میں اِس قید کی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اُسوقت روائت باللفظ کا عام رواج ہو چکا تھا لیکن امام ابوحنیفہؒ کے عہد تک حدیثیں زیادہ تر بالمعنے روائت کی جاتی تھیں اسلئے اگر

---

[51] محدث بندار۔ بندار بالضم تاجرے کہ متاع نگاہدارد تا بقیمت گران بفروشد و آنکہ خرید و فروخت جواہر بسیار نمودہ باشد ۱۲ منتخب محشی۔ [52] فتح المغیث ص ۱۶۷ ۱۲

راوی کو الفاظ حدیث۔ موقعِ حدیث۔ شان نزول۔ وغیرہ یاد نہیں ہوتے تھے تو روایت کا بعینہا ادا کرنا قریباً ناممکن ہوتا تھا۔ اِسی ضرورت سے امام ابو حنیفہ نے اِس طریقہ کو محدود کر دیا اور انصاف یہ ہے کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔

روایت بالمعنے

سب سے زیادہ مہتم بالشان اور قابل بحث مسئلہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ ایسی روائیت قطعاً قابل حجت ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ ہمیشہ مختلف فیہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ امام شافعی۔ نے روائیت کی ہے کہ بعض تابعین نے ایک حدیث۔ متعدد صحابہ سے سُنی جس کو سب نے مختلف لفظوں میں بیان کیا لیکن مطلب ایک تھا۔ اُنھوں نے کسی صحابی سے یہ حقیقت بیان کی صحابی نے جواب دیا کہ جب معنی مختلف نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں"۔ اگرچہ امام شافعی نے تابعی کا نام نہ بتایا جس سے روائیت کی قوت اور ضعف کا اندازہ ہو سکتا۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض صحابہ روائیت بالمعنی جائز سمجھتے تھے اور اُس پر عمل کرتے تھے۔ بخلاف اِسکے بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعود کو روائیت باللفظ پر اصرار تھا۔ علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں اُنکے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ "وہ روایت میں سختی کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو زجر کرتے تھے الفاظ کے ضبط میں بے پروائی نہ کریں"۔ عبداللہ بن مسعود جب کبھی بالمعنی روایت کرتے تھے تو ساتھ ہی یہ الفاظ استعمال کرتے تھے او مثلہ او نحوہ او شبیہ بہ۔ اما فوق ذلک واما دون ذلک واما قریب من ذلک یعنے رسول اللہ صلعم نے اس طرح فرمایا تھا یا اسکے مثل یا اس کے مشابہ یا اس سے کچھ زیادہ یا کم یا اس کے قریب فرمایا تھا۔ ابو الدرداء کا بھی یہی حال تھا وہ حدیث بیان کر کے کہا کرتے تھے ھذا او نحوہ او شکلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو لوگوں کو روائیتِ حدیث سے منع کیا کرتے تھے اُن کا بھی غالباً یہی منشا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ الفاظ کم یاد رہ سکتے ہیں اور معنے کی عام اجازت میں تغیر و تبدل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے۔

روایت بالمعنی میں صحابہ کی احتیاط

صحابہ کے دور کے بعد بھی یہ مسئلہ یکسو نہ ہوا۔ تابعین کے دو گروہ تھے اور خود امام ابو حنیفہ کے اُستاد الاستاد روائیت بالمعنی کے قائل تھے۔ آگے چل کر تو گویا اس پر اتفاق عام ہو گیا کہ روایت بالمعنی جائز ہے۔ چنانچہ اصولِ حدیث کی کتابوں میں جمہور کا یہی مذہب بیان کیا جاتا ہے۔ مجتہدین میں سے صرف امام مالک اِس کے خلاف ہیں۔ محدثین کا ایک گروہ جن میں امام مسلم قاسم بن محمد

۱؎ فتح المغیث ۱۲

محمد بن سیرین۔ رجاء بن حیوۃ۔ ابو زرعۃ۔ سالم بن ابی الجعد عبد الملک بن عمر۔ داخل ہیں۔ روائیت باللفظ پر عمل کرتا تھا۔ لیکن عام محدثین جواز ہی کے قایل ہیں۔ اور در حقیقت ایک ایسا فرقہ جس کا عام میلان ہر حالت میں کثرت روائیت کی طرف ہو۔ جواز ہی کا قایل ہو سکتا تھا۔

اس میں شبہہ نہیں کہ اکثر تابعین اور صحابہ نے بالمعنی حدیثیں روائیت کیں۔ اور اگر شروع سے یہ قید لگائی جائے تو روائیت کا دائرہ اسقدر تنگ ہو جاتا ہے کہ مسایل و احکام کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ روائیت بالمعنے میں اصل روائیت کا اصلی حالت پر قائم رکھنا اسقدر مشکل ہے کہ قریباً ناممکن ہے۔ زبان کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ مرادف الفاظ بھی یکساں اثر نہیں رکھتے اور معنی کی حیثیتوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مجوزین نے مرادف وغیرہ کی قید بھی نہیں رکھی۔

اور ادائے مطلب کو نہائیت عام وسعت دی ہے صحابہ سے زیادہ کوئی شخص رسول اللہؐ کے الفاظ و مطالب کا اندازہ دان نہیں ہو سکتا تھا۔ اول تو وہ زباندان اور زبان کے حاکم تھے۔ اس کے ساتھ شرف صحبت کی وجہ سے رسول اللہؐ کی طرز ادا طریقہ گفتگو۔ انداز کلام۔ فحوائے سخن سے خوب واقف تھے۔ تاہم کتب حدیث میں اس کی متعدد نظیریں ملتی ہیں کہ خود صحابہ سے ادائے مطلب میں کمی یا زیادتی ہوگئی۔

صحابہ سے ادائے مطلب میں جو کمی یا زیادتی ہوگئی اُسکی مثالیں۔

ابن ماجہ۔ میں روائیت ہے کہ ابو موسیٰ اشعری نے آنحضرتؐ سے روائیت کی ان المیت یعذب ببکاء الحی اذا قالوا اعضداہ واکاسباہ واناصراہ واجبلاہ ۵ یعنی جب مُردہ پر یہ الفاظ کہکر رویا جاتا ہے تو اُس کو عذاب دیا جاتا ہے"۔ کسی نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ ابن عمر یہ حدیث بیان کرتے تھے حضرت عائشہؓ نے کہا میں یہ نہیں کہتی کہ ابن عمر جھوٹ کہتے ہیں لیکن اُن کو سہو ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک یہودی عورت مرگئی۔ اُس کے گھر والے اُس پر روتے تھے۔ آنحضرتؐ نے سُنا تو فرمایا کہ "اُس کے گھر والے رو رہے ہیں اور اُس پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے"۔ ایک اور روائیت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے قرآن کی یہ آئیت پڑھی ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ جس سے اس بات پر استدلال کیا کہ ایک شخص کے فعل کا دوسرا شخص ذمہ دار نہیں ہو سکتا گھر والے روتے ہیں تو اُن کا قصور ہے مردے نے کیا گناہ کیا ہے کہ اُس پر عذاب کیا جاوے۔

دیکھو اس حدیث میں رسول اللہؐ نے یہودیہ عورت کا معذب ہونا بطور ایک واقعہ بیان کیا تھا۔ راوی نے رونے کو اُس کا سبب قرار دیا اور حدیث کے یہ الفاظ بیان کئے کہ ان المیت یعذب ببکاء الحی۔ یعنی مُردہ کو۔ زندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔

اِسی طرح غزوہ بدر۔ کے واقعہ میں عام روائیت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے قلیب پر کھڑے ہو کر فرمایا ھل وجد تم ما فعل ربکم حقاً لوگوں نے عرض کی کہ آپ مردوں سے خطاب فرماتے ہیں۔ ارشاد ہُوا کہ جو میں نے کہا ان لوگوں نے سُن لیا۔ لیکن یہ واقعہ حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا رسول اللہؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ الفاظ کہے تھے لقد علموا ان ما دعو تھم حق۔ یعنے اِن لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جس چیز کی میں نے دعوت کی تھی۔ وہ حق ہے۔ دیکھو اِن دونوں جملوں کے مفہوم میں کس قدر فرق ہے اور اُس سے سماع موتے کے مسئلہ پر کیسا مختلف اثر پڑتا ہے۔

غرض جب صحابہ سے اِس قسم کے مسامحات واقع ہوتے تھے تو دوسرے اور تیسرے دور کا کیا ذکر ہے۔ لُطف یہ ہے کہ جو لوگ روائیت بالمعنی کے قایل ہیں اُنہوں نے چند الفاظ مثالاً بتائے ہیں کہ اُن کو دوسرے لفظوں میں اِس طرح ادا کر سکتے ہیں اور معنی میں مطلق فرق نہیں پیدا ہو گا۔ حالانکہ غور سے دیکھئے تو اِن لفظوں کے اثر میں صاف تفاوت نظر آتا ہے۔ محدث سخاوی لکھتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے۔ اقتلوا الاسودین الحیۃ والعقرب ۔ اب بجائے اِسکے یہ کہہ سکتے ہیں کہ امر بقتلھما محدث سخاوی کے نزدیک اِس مثال میں الفاظ کے اختلاف نے معنی میں کچھ فرق نہیں پیدا کیا۔ حالانکہ اقتلوا اور امر بالقتل میں صریح تفاوت ہے۔ اقتلوا اگرچہ امر کا صیغہ ہے لیکن اس میں وہ تحتم اور تاکید نہیں ہے جو امر میں ہے۔

روائیت بالمعنے کے متعلق امام ابو حنیفہ کے اصول

امام ابو حنیفہ نے اِن مشکلات کا اندازہ کر کے نہائیت معتدل طریقہ اختیار کیا۔ جو حدیثیں اُن کے زمانہ سے پہلے بالمعنی روائیت ہو چکی تھیں اور محدثین میں شائع تھیں اُن کے قبول سے تو چارہ نہ تھا ورنہ روائیت کا تمام دفتر بیکار ہو جاتا۔ اسلئے امام صاحب نے اُن حدیثوں کو قبول کیا لیکن یہ قید لگائی کہ رواۃ حدیث فقیہ ہوں یعنی الفاظ کے اثر اور مطالب کی تعبیر سے واقف ہوں، تغیر مطالب کا احتمال اب بھی باقی رہتا ہے لیکن احادیث کا مدار (جیسا کہ محدثین نے تصریح

سلہ تاریخ کبیر علامہ ابو جعفر جریر طبری صفحہ ۱۳۳۲ - ۱۲

کردی ہے اظن غالب پر ہے۔ اسلئے جب تک کوئی مخالف دلیل موجود نہ ہو روائیت بالمعنی قابل عمل ہو گی۔ امام صاحب نے اُن احادیث کو بھی قبول کیا جنکے رُواۃ ثقہ ہوں اور فقیہ نہ ہوں لیکن اُن کا درجہ پہلے کی بہ نسبت کم قرار دیا اور اُن میں اصولِ درائیت کی زیادہ ضرورت سمجھی۔ امام صاحب کے ان اصول سے اور ائمہ نے بھی اتفاق کیا۔ الفیۃ الحدیث میں ہے کہ جو شخص مدلولِ الفاظ کو اچھی طرح نہیں سمجھتا اُس کو روائیت باللفظ ضروری ہے۔ البتہ جو شخص مطالب کا اندازہ دان ہے اُسکی نسبت اختلاف ہے۔ کثرت رائے اس طرف ہے کہ وہ الفاظ کا پابند نہیں؛ لیکن امام ابوحنیفہؒ نے اس اجازت کو صحابہ اور تابعین تک محدود کر دیا اور لوگوں کے لئے روائیت بالالفاظ کی قید لگائی۔ اور امام طحاوی نے بسند متصل اُن سے روائیت کی ہے کہ صرف وہ حدیث روائیت کرنی چاہئے جو روائیت کرنے کے وقت اُسی طرح یاد ہو جس طرح سُننے کے وقت یاد تھی۔ ملّا علی قاری اس روائیت کو نقل کر کے لکھتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ "امام ابوحنیفہؒ روائیت بالمعنی کو جائز نہیں رکھتے تھے"۔ اس پابندی میں اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے امام ابوحنیفہ سے اتفاق کیا۔ فتح المغیث میں ہے۔ وقیل لا تجوز له الروایة بالمعنی مطلقاً قال له طائفة من المحدثین والفقهاء والاصولیین من الشافعیة وغیرهم قال القرطبی وهو الصحیح من مذهب مالک .... لیکن عام ارباب روائیت اِس سختی کے کیونکر پابند ہو سکتے تھے چنانچہ ایک بڑے فرقہ نے مخالفت کی اور امام صاحب کو مشدّد فی الروایۃ ٹھہرایا۔ تاہم انصاف یہ ہے کہ جو اصول امام صاحب نے اختیار کیا وہ ضروری اور نہائیت ضروری تھا۔ خود حدیث میں آیا ہے کہ نضر الله امرءً اسمع منّا شیئاً فبلّغه کما سمعه۔ یعنی رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خدا اُس شخص کو شاداب کرے جسنے ہم سے کچھ سُنا اور اُس کو اُسی طرح پہنچایا جیسا کہ ہم سے سُنا تھا"۔ اس سے زیادہ اس باب میں کسی دلیل کی کیا ضرورت ہے۔ صحابہ میں سے جو لوگ روائیت باللفظ کو غیر ضروری سمجھتے تھے ممکن ہے کہ یہ حدیث اُن کو نہ پہنچی ہو چنانچہ جن صحابہ کی نسبت ثابت ہے کہ اُنہوں نے اِس حدیث کو سُنا تھا مثلاً عبداللہ بن مسعود۔ جو اس حدیث کے راوی ہیں۔ وہ الفاظ کے پابند

---

[۱] یعنے کہا گیا ہے کہ روائیت بالمعنی مطلقاً جائز نہیں۔ محدثین وفقہاء واصولیین شافعیہ کا ایک گروہ اسی قول کا قائل ہے اور قرطبی نے کہا ہے کہ امام مالک کا صحیح مذہب یہی ہے ۱۲ [۲] شرح امام اعظم از ملا علی قاری ص۱۳۔ ۱۲

تھے۔ امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں یہ حدیث عام ہو چکی تھی اس لئے اُن کو اُس کی تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا۔

اصول درائیت

فن حدیث میں سب سے بڑا کام امام ابوحنیفہ نے یہ کیا کہ درائیت کے اصول قائم کئے اور اُن کو احادیث کی تحقیق و تنقید میں برتا۔ فن حدیث کی ایک شاخ یعنے روائیت پر ہمارے علما نے جسقدر توجہ کی اُس کی کوئی نظیر دُنیا کی گذشتہ اور موجودہ تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن یہ افسوس ہے کہ اصول درائیت کے ساتھ چنداں اعتنا نہیں کیا گیا۔ حافظ ابن حجرؒ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس فن میں بعض تصنیفیں لکھی گئیں۔ لیکن وہ اِسقدر کم اور غیر متعارف ہیں کہ گویا نہیں ہیں۔ اصولِ حدیث ایک مستقل فن بن گیا ہے اور بڑی بڑی کتابیں جو اِس فن میں لکھی گئیں عموماً متداول ہیں۔ لیکن اُن سے اصولِ درائیت کے متعلق بہت کم واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ یہی اصول۔ فن حدیث کے نہائیت ضروری اجزا ہیں یہ عزت صرف امام ابوحنیفہؒ کو حاصل ہے کہ جب اس فن کا نام و نشان بھی نہ تھا اُسوقت اُن کی نگاہ اِن باریک نکتوں پر پہنچی۔ بے شبہ صحابہ کی تاریخ میں جستہ جستہ اصول درائیت کے آثار نظر آتے ہیں اور درحقیقت وہی امام ابوحنیفہ کے لئے دلیل راہ بنے لیکن وہ باتیں عام مسائل کے ہجوم میں ایسی گم اور ناپید تھیں۔ کہ اُن پر عام لوگوں کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔

روایات کی صحت و عدم صحت کا مدار ہمیشہ راویوں کے اعتبار و عدم اعتبار پر نہیں ہوتا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کی روائیت جس سند سے بیان کی جاتی ہے اُس کے تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہوتے ہیں لیکن واقعہ صحیح نہیں ہوتا۔ حدیث میں بھی اس کی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ صرف رواۃ کی بنا پر احادیث کا فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ اصول درائیت کے مطابق ہیں یا نہیں۔

درائیت سے یہ مطلب ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کی جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضا۔ زمانہ کی خصوصیتیں۔ منسوب الیہ۔ کے حالات۔ اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے۔ اگر اس معیار پر پورا نہیں اُترتا تو اُس کی صحت بھی مشتبہ ہو گی۔ یعنی یہ احتمال ہو گا کہ روائیت کے تغیرات نے واقعہ کی صورت بدل دی ہے۔ اِس قسم کے قواعد۔ حدیث کی تحقیق و تنقید میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور انہیں کا نام اصول درائیت ہے۔ علامہ ابن جوزی۔ جو فن

حدیث میں بڑا پایہ رکھتے تھے لکھتے ہیں[1] کہ جس حدیث کو تم دیکھو کہ عقل کے مخالف یا اصول کے مناقض ہے تو یہ سمجھ لو کہ وہ موضوع ہے۔ اُس میں راویوں کی تحقیق حال کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح وہ حدیث بھی موضوع ہے جو حس و مشاہدہ سے باطل ثابت ہو۔ یا قرآن۔ حدیث متواتر اجماع قطعی کے خلاف ہو اور قابل تاویل نہ ہو۔ یا جس میں ایک معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا ذرا سے کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو۔ اس طرح کی حدیثیں واعظوں اور سوقیوں کی رؤایتوں میں بہت پائی جاتی ہیں۔" امام ابوحنیفہؒ نے درائیت کے جو اصول قائم کئے اُن میں سے بعض ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

جو حدیث عقل قطعی کے مخالف ہو صحیح نہیں۔

(۱) "جو حدیث عقل قطعی کے مخالف ہو وہ اعتبار کے قابل نہیں[2]"۔ یہ وہی قاعدہ ہے جس کو ابن جوزی نے تمام اصول درائیت پر مقدم رکھا ہے۔ ابن جوزی چھٹی صدی میں تھے۔ اُسوقت اسلامی علوم۔ اوج کمال تک پہنچ گئے تھے۔ اور فلسفیانہ خیالات کا اثر زیادہ عام ہو گیا تھا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے زمانہ تک مذہب میں عقل کا نام لینا ایک جرم عظیم تھا۔ امام صاحب نے اول اول جب یہ قاعدہ قرار دیا اور روایات میں برتا تو سخت مخالفت ہوئی۔ اس قسم کی حدیثیں جن میں ناممکن اور محال واقعات بیان کئے جاتے ہیں امام صاحب کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو وہ اُن سے انکار کرتے تھے۔ یہ امر عام لوگوں پر گراں گذرتا تھا۔ کیونکہ اِن لوگوں کے خیال میں روایات کی تحقیق و تنقید کا مدار صرف رُواۃ کی حالت پر تھا۔ اصول درائیت سے غرض نہ تھی۔ زمانۂ مابعد میں اگرچہ یہ قاعدہ۔ اصول حدیث میں داخل کر لیا گیا۔ لیکن ارباب روائیت نے اس کو بہت کم برتا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بیسیوں مزخرف اور دور از کار حدیثیں قبول عام کے شرف سے ممتاز ہیں۔

---

[1] ابن جوزی کے الفاظ۔ جیسا کہ فتح المغیث میں منقول ہے یہ ہیں۔ کل حدیث رایتہ یخالف العقول او یناقض الاصول فاعلم انہ موضوع فلا یتکلف اعتبارہ ای لا تعتبر رواتہ ولا تنظر فی جرحھم او یکون مما یدفعہ الحس والمشاھدۃ او مباینا لنص الکتاب او السنۃ المتواترۃ والاجماع القطعی حیث لا یقبل شئی من ذلک التاویل او تتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر او بالوعد العظیم علی الفعل الیسیر وھذا الاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والطرقیۃ

[2] اس اصول کو علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔ ۱۲

تلک الغرانیق العلیٰ) کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہؐ کی زبان سے (سورۂ نجم کی تلاوت کے وقت) بتوں کی تعریف میں یہ الفاظ ادا ہوئے۔ تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی یعنے "یہ بت بہت معزز ہیں اور اُن کی شفاعت کی اُمید کی جا سکتی ہے" اور یہ الفاظ شیطان نے آنحضرتؐ کی زبان میں ڈال دیئے تھے۔ چنانچہ تلاوت کے بعد جبرئیل آئے اور اُنہوں نے یہ شکایت کی کہ میں نے تو یہ الفاظ آپ کو نہیں سکھائے تھے آپنے کہاں سے پڑھ دیئے۔ اس حدیث کو امام صاحب کے اصول کے موافق۔ بعض محدثین مثلاً قاضی عیاض و ابوبکر بیہقی وغیرہ نے غلط کہا لیکن محدثین کا ایک بڑا گروہ اُس کو اب بھی صحیح تسلیم کرتا ہے۔ متاخرین میں حافظ ابن حجر سے زیادہ نامور کوئی محدث نہیں گذرا وہ بڑے زور شور سے اِس حدیث کی تائید کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ چونکہ اس کے رُواۃ ثقہ ہیں اسلیئے اُس کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا!!! اسی طرح ردالشمس کی حدیث کو جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کی نماز عصر قضا ہو گئی تھی اسلیئے آنحضرتؐ کی دعا سے آفتاب غروب ہونے کے بعد پھر طالع ہُوا۔ محدث ابن جوزی نے جرأت کر کے موضوع کہا۔ لیکن حافظ ابن حجر و جلال الدین سیوطی وغیرہ نے نہائیت شدت سے مخالفت کی۔ امام صاحب کے زمانہ میں اس سے زیادہ مخالفتیں ہوئیں لیکن وہ اِن باتوں کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ لفظ عقل سے امام صاحب کی مراد وہ وسیع معنی نہیں ہیں جو آجکل کے تعلیم یافتہ لوگوں نے قرار دئیے ہیں جس کی رُو سے شریعت کے بہت سے اصلی مسائل برباد ہوئے جاتے ہیں۔

(۲) جو واقعات تمام لوگوں کو رات دن پیش آیا کرتے ہیں اُن کے متعلق اگر رسول اللہؐ سے کوئی ایسی روائیت منقول ہو جو اخبار احاد کے درجہ سے زیادہ نہ ہو تو وہ روائیت مشتبہہ ہو گی یہ اصول اس بنا پر ہے کہ جو واقعات تمام لوگوں کو اکثر پیش آیا کرتے تھے اُن کے متعلق جو کچھ آنحضرتؐ کا ارشاد تھا اُس کی ضرورت تمام لوگوں سے متعلق تھی۔ اسلیئے صرف ایک آدھ شخص تک اُس روائیت کا محدود رہنا درائیت کے خلاف ہے۔

مخالفت قیاس

اکثر مصنفین نے تصریح کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اُس روائیت کو قبول نہیں کرتے تھے جو قیاس کے مخالف ہو۔ اگرچہ یہ قول محض بے اصل نہیں ہے۔ لیکن اُس کی تعبیر میں لوگوں نے اکثر غلطی کی ہے اور انہیں غلط تعبیرات کا اثر ہے کہ امام ابوحنیفہ۔ کی نسبت ارباب ظاہر میں بہت سی بدگمانیاں

قائم ہو گئیں۔ ان لوگوں نے امام صاحب کے مقصد و منشا پر کافی غور نہیں کی اور عام رائے قائم کر لی کہ وہ قیاس کو حدیث پر مقدم سمجھتے ہیں۔ امام صاحب سے اس مسئلہ کے متعلق جو اقوال منقول ہیں وہ صریح اِس دعوے کے خلاف ہیں۔ مسائل فقہ میں متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں امام ابو حنیفہؒ نے حدیث و اثر کی وجہ سے قیاس کو مطلقاً ترک کر دیا ہے۔ امام محمدؒ اس بحث میں کہ قہقہہ نماز ناقض وضو ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے استدلال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں لولا ما جاء من الاٰثار کان القیاس علی ما قال اھل المدینۃ ولکن لا قیاس مع اثرولا ینبغی الا ان ینقاد للاٰثار یعنی" قیاس وہی ہے جو اہل مدینہ کہتے ہیں لیکن حدیث کے ہوتے قیاس کوئی چیز نہیں۔ اور صرف حدیث ہی کی پیروی کرنی چاہیئے" اس سے زیادہ اس باب میں کیا تصریح ہو سکتی ہے عقود الجمان۔ کے مصنف نے مختلف روایتوں سے امام ابو حنیفہؒ کے خاص اقوال نقل کئے ہیں کہ میں حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو دخل نہیں دیتا۔ امام جعفر صادقؑ سے امام صاحب نے جو گفتگو کی تھی اُس میں بھی اِس خیال کا اظہار کیا ہے۔

اِن تصریحات کو دیکھ کر بعضوں نے اس انتساب میں تخصیص کی اور دعوے کیا کہ" جو حدیث قیاس جلی کے مخالف ہو۔ اُس کو امام صاحب قبول نہیں کرتے" عبد الکریم شہرستانی نے اصحاب الرائے۔ کے بیان میں جہاں امام ابو حنیفہؒ۔ اور اُن کے تلامذہ کا ذکر آیا ہے لکھا ہے کہ وربما یقدمون القیاس الجلی علی احاد الاخبار یعنی یہ لوگ اکثر قیاس جلی کو اخبار احاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ امام رازی نے بھی مناقب الشافعی میں اس کی جا بجا تصریح کی ہے اور اِس بنا پر امام ابو حنیفہؒ کے مقابلہ میں۔ امام شافعیؒ کی ترجیح کے وجوہ قائم کئے ہیں ہیں۔ نے بہت کچھ جد و جہد کی کہ اس مسئلہ کے متعلق امام صاحب کا کوئی صریح قول مل سکے لیکن نہ مل سکا۔ جن لوگوں نے امام صاحب کی طرف اِس قول کو منسوب کیا ہے غالباً صرف استنباط سے کام لیتے ہیں صریح قول نہیں پیش کر سکتے۔ بے شبہہ حنفیوں کے اصول فقہ میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ" وہ حدیث جس کے رُواۃ فقیہ نہ ہوں اور ہر طرح قیاس کے مخالف ہو قابل حجت نہیں" لیکن یہ حنفیوں کا مسلمہ اصول نہیں ہے۔ بلکہ صرف عیسٰے بن امان۔ اور اُنکے پیرؤں کی رائے ہے۔ ابو الحسن کرخیؒ۔ وغیرہ صریح اِس کے مخالف ہیں۔ اور صاحب مسلم الثبوت

نے اِسی قول کو ترجیح دی ہے۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ بغیر کسی ثبوت کے امام ابوحنیفہ رح کی طرف یہ دعوے صرف اِس اعتماد پر منسوب کر دیا گیا کہ فقہائے حنفیہ رح میں سے چند علماء اُس کے قائل ہیں۔ بہت بڑی مثال بیع مصراۃ۔ کی پیش کی جاتی ہے جس سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رح نے اس مسئلہ میں صریح حدیث کے ہوتے ہوئے قیاس کو مقدم رکھا ہے[1] لیکن ان مدعیوں کو معلوم نہیں کہ اِس مثال میں قیاس کی تقدیم بعض علمائے حنفیہ کی ذاتی رائے ہے۔ امام صاحب سے اُس کو کچھ واسطہ نہیں۔ امام رازی نے مناقب الشافعی میں اتنی احتیاط کی کہ اِس موقع پر امام ابوحنیفہ رح کا نام نہیں لیا۔ بلکہ اصحاب ابی حنیفہ لکھا۔ لیکن ہم اس احتیاط میں بھی اُن کو معذور نہیں رکھتے۔ کیونکہ یہ رائے بعض حنفیوں کی ہے نہ سب کی۔ امام رازی نے اصحاب کے لفظ سے جو تعمیم ظاہر کی وہ صحیح نہیں۔

بیع مصراۃ۔ کی حدیث کو امام ابوحنیفہ رح نے قیاس کی بنا پر رد نہیں کیا بلکہ اُس کے نسخ کا دعوے کیا ہے۔ امام طحاوی نے معانی الآثار میں اِس بحث کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد۔ کا مذہب لکھ کر لکھتے ہیں وذھبوا الی ان ما روی عن رسول اللہ فی ذلک مما تقدم ذکرنا لہ فی ھذا الباب منسوخ یعنی یہ لوگ اِس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ اِس بارہ میں جو کچھ رسول اللہ صلعم سے روائیت کیا گیا ہے وہ منسوخ ہے۔

اِس موقع پر ہم اس بحث کی تفصیل نہیں کر سکتے صرف یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں امام صاحب نے قیاس کو ترجیح نہیں دی بلکہ نسخ کا دعویٰ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر نہایت دقیقہ بینی سے دیکھنا چاہئے کہ جو اقوال امام صاحب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ اِن سے ثابت بھی ہیں یا نہیں؟۔ متاخرین نے اِن باتوں میں کم احتیاط کی ہے۔ اسلئے ہم کو نہائیت غور و تحقیق سے کام لینا ہے۔ یہی بیع مصراۃ کی حدیث۔ ہمیشہ اصول موضوعہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور اِس سے ثابت کیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رح۔ قیاس کو۔ حدیث پر مقدم رکھتے تھے۔ لیکن ذرا تحقیق سے کام لو تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام شور و غل کی کچھ اصل نہیں۔

---

[1] تعجب ہے کہ بڑے بڑے علماء یہاں تک کہ امام غزالی۔ امام رازی۔ نے بھی۔ امام ابوحنیفہ رح کی نسبت یہ الزام لگایا اور یہی بیع مصراۃ کی مثال پیش کی ۱۲۔

امام صاحب نے تصریح کی ہے کہ وہ حدیث کے مقابلہ میں قیاس کا اعتبار نہیں کرتے تھے

بخلاف اِس کے نہایت قوی ذریعہ سے امام ابوحنیفہؒ کی تصریحات ثابت ہیں کہ وہ حدیث صحیح کے مقابلہ میں قیاس کا مطلق اعتبار نہیں کرتے تھے۔ امام محمد۔ اس بحث کے ذیل میں کہ جو شخص رمضان میں بُھول کر کچھ کھا پی لے تو روزہ نہیں ٹُوٹتا اور قضا نہیں لازم آتی۔ حدیث پر استدلال کر کے لکھتے ہیں کہ آثار کے ہوتے ہوئے رائے کچھ چیز نہیں۔ پھر امام ابوحنیفہؒ کا خاص قول نقل کرتے ہیں کہ لولا ما جاء فی ھذا من الآثار لامرت بالقضاء[1] یعنی "اگر اس بارہ میں آثار موجود نہ ہوتے تو میں قضا کا حکم دیتا"۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ احادیث کے ثبوت کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کی شرطیں نہایت سخت ہیں جب تک وہ شرطیں پائی نہ جائیں وہ حدیث کو قابل استدلال نہیں سمجھتے لیکن اُن شرطوں کے ساتھ حدیث ثابت ہو تو اُن کے نزدیک پھر قیاس کوئی چیز نہیں۔

قیاس کے ایک اور معنی

جس حد تک ہم تحقیق کر سکے امام ابوحنیفہؒ نے قیاس فقہی کو حدیث پر ہرگز مقدم نہیں رکھا۔ لیکن اُن کے زمانہ تک قیاس کا لفظ نہایت وسیع معنوں میں مستعمل تھا اور بے شبہہ اُن معنوں کے لحاظ سے امام صاحب نے قیاس کو حدیثوں میں دخل دیا ہے مسائل اور احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قایم ہو گئے تھے۔ ایک کا خیال تھا کہ شرعی احکام کسی مصلحت اور اقتضائے عقل پر مبنی نہیں ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حسن و قبح اشیاء عقلی نہیں ہے۔ دوسرے فریق کی رائے تھی کہ تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔ جن میں سے بعض کی مصلحتیں صاف نمایاں ہیں اور خود شارع کے کلام سے اُس کے اشارے پائے جاتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کی مصلحت ہم کو معلوم نہیں لیکن فی الواقع وہ مصالح سے خالی نہیں۔ اس اختلاف رائے نے حدیثوں کی روائت پر مختلف اثر پیدا کئے۔ بعض لوگ۔ جب کسی حدیث کو سُنتے تھے تو صرف یہ دیکھ لیتے تھے کہ اُس کے راوی ثقہ ہیں یا نہیں۔ اگر اُن کے خیال کے موافق قابل حجت ہیں تو پھر ان کو کوئی بحث نہیں ہوتی تھی۔ اور بے تکلف اُس حدیث کو قبول کر لیتے تھے۔ دوسرا فریق جو حسن و قبح عقلی کا قایل تھا یہ بھی دیکھتا تھا کہ جو مسئلہ یا عقیدہ۔ حدیث سے مستنبط ہوتا ہے۔ وہ عقل و مصلحت کے موافق ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہوتا تھا تو وہ حدیث کی زیادہ تحقیق و تنقید کی طرف مائل ہوتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ راوی نے فہم و درائت کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتے ہیں۔

[1] کتاب الحج امام محمد ۱۲

روائیت باللفظ ہے یا بالمعنی۔ موقع حدیث کیا تھا۔ کون لوگ مخاطب تھے۔ کیا حالت تھی۔ غرض اس قسم کے اسباب اور وجوہ پر غور کرتے تھے۔ ان باتوں سے اکثر اصل حقیقت کا پتہ لگ جاتا تھا یہ طرز تحقیق خود صحابہ کے زمانہ میں قائم ہو چکا تھا۔ صحیح بن ماجہ و ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلعم سے حدیث روائیت کی کہ توضئوا مما غیرت النار یعنی جس چیز کو آگ نے متغیر کر دیا ہو اُس کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔" اسی بنا پر بعض مجتہدین قائل ہیں کہ گوشت کھانے سے وضو لازم آتا ہے۔ ابوہریرہ۔ نے جب یہ حدیث بیان کی تو عبداللہ بن عباس۔ موجود تھے بولے کہ "اتوضاء من الحمیم یعنی اِس بنا پر تو گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو لازم آتا ہے۔" ابوہریرہ نے کہا۔ اے برادر زادہ! جب رسول اللہ صلعم سے کوئی روائیت سُنو تو اُس پر مثالیں نہ کہو،" لیکن عبداللہ بن عباس اپنی رائے پر قائم رہے۔ حضرت عائیشہؓ نے ابن عمر کی اِس حدیث پر ان المیت یعذب ببکاء اھلہ جو اعتراض کیا تھا۔ اسی طرز تحقیق پر مبنی تھا۔ صحابہ کے حالات میں اس قسم کی متعدد مثالیں ملتی ہیں جن کا استقصاء اِس موقع پر ضروری نہیں۔

امام ابوحنیفہ۔ کا بھی یہی مسلک تھا اور اِسی کو لوگوں نے قیاس کے لفظ سے شہرت دی۔ اِس مسئلہ پر کہ احکام شریعت مصالح پر مبنی ہیں۔ اِس موقع پر ہم تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ اِس بحث کے لئے کافی و وافی ہے۔ یہاں صرف اسقدر کہنا ضرور ہے کہ علمائے اسلام میں جو لوگ عقل و نقل دونوں کے جامع تھے مثلاً امام غزالی عزالدین عبدالسلام۔ شاہ ولی اللہ وغیرہ اِن لوگوں کا یہی مسلک تھا۔ امام ابوحنیفہؒ احادیث کی تنقید میں اِس اصول کو ضروری طور پر ملحوظ رکھتے تھے۔ دو متعارض حدیثیں جو روائیت کی حیثیت سے یکساں نسبت رکھتی تھیں اُن میں وہ اُس حدیث کو ترجیح دیتے تھے جو اصول مذکور کے موافق ہو۔

امام صاحب۔ نے بعض موقعوں پر محض اس اصول کی مخالفت کی وجہ سے بعض حدیثوں کے

ابن ماجہ صفحہ ۳۸ مطبوعہ اصح المطابع ۱۳۱۵ھ ہجری ۱۲ ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے گرم پانی سے وضو کرنا جائز سمجھا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس نے اُسی وجہ سے اس حدیث آگ والی پر جرح کی۔ لہذا حضرت ابوہریرہ والی حدیث قابلِ استقصاء نہیں سمجھی۔ اسلام میں آسانی زیادہ مدنظر رکھی جو دہ حالات بھی اسی کے مقتضی ہیں ۱۲ سید مبارک علی شاہ گیلانی

تسلیم میں تامل کیا ہے۔ اُن کی اصطلاح میں یہ ایک علّت خفیہ ہے۔ محدّثین نے اقسام حدیث میں ایک قسم معلل قرار دی ہے جس کی یہ تعریف کی ہے کہ "حدیث میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں۔ اور وہ قابل استدلال نہیں ہوتی" اِس قسم کی حدیثوں کی تمیز پر محدثین کو نہایت فخر ہے اور وہ اُس کو ایک قسم کا الہام سمجھتے ہیں۔ علی بن المدینی جو امام بخاری کے اُستاد اور بہت بڑے مشہور محدث تھے اُن کا قول ہے کہ ھی الھام ولو قلت للقیم بالعلل من این لك ھذا لم تکن لہ حجۃ یعنی "یہ الہام ہے اور اگر تم ماہر علل سے پوچھو کہ تم نے کیونکر اُس کو معلل کہا تو وہ کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتا۔ محدث ابو حاتم سے ایک شخص نے چند حدیثیں پوچھیں اُنھوں نے بعض کو مدرج۔ بعض کو باطل۔ بعض کو منکر۔ بعض کو صحیح بتایا۔ پوچھنے والے نے کہا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہُوا۔ کیا راوی نے آپ کو اِن باتوں کی اطلاع دی؟ ابو حاتم نے کہا نہیں! بلکہ مجھ کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ سائل نے کہا تو کیا آپ علم غیب کے مدعی ہیں۔ ابو حاتم نے جواب دیا کہ تم اور ماہرین فن سے پوچھو۔ اگر وہ میرے ہمزبان ہوں تو سمجھنا کہ میں نے بیجا نہیں کہا سائل نے ابو زرعہ سے وہ حدیثیں جا کر دریافت کیں۔ اُنھوں نے ابو حاتم کی موافقت کی تب سائل کو تسکین ہوئی۔[1]

بعض محدثین کا قول ہے۔ اثر یھجم علی قلوبھم لا یمکنھم ردہ ھیئۃ نفسانیۃ لا معدل لھم یعنی "وہ ایک امر ہے جو ائمہ حدیث کے دل پر وارد ہوتا ہے اور وہ اِس کو رد نہیں کر سکتے اور نفسانی اثر ہے جس سے گریز نہیں ہو سکتا"[2] محدثین کا یہ دعوے بالکل صحیح ہے۔ بے شبہہ فن روائیت کی ممارست سے ایک ملکہ یا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے خود تمیز ہو جاتی ہے کہ یہ قول رسول اللہ کا ہو سکتا ہے یا نہیں۔

اسی طرح شریعت کے احکام اور مسائل۔ اور اُن کے اسرار و مصالح کے تتبع اور استقراء سے ایسا ذوق حاصل ہو سکتا ہے جس سے یہ تمیز ہو سکتی ہے کہ رسول اللہؐ نے یہ حکم دیا ہو گا یا نہیں۔ لیکن ان اسرار و مصالح کا تتبع محدث کا فرض نہیں ہے۔ وہ مجتہد کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب اِن دقیق وجوہ کے لحاظ سے امام ابو حنیفہؒ نے بعض حدیثوں کو معلل قرار دیا تو ارباب ظاہر نے مخالفت کی۔ اور بعضوں کو بد گمانی ہوئی کہ امام صاحب حدیث کو

[1] فتح المغیث صفحہ ۹۸۔ [2] فتح المغیث صفحہ ۱۲۹۔

عقل ورائے کی بنا پر رد کرتے ہیں۔ لیکن انصاف پسند انصاف کرسکتا ہے کہ جب روایات اور ظاہر الفاظ کے استقراء سے محدثین کو ایسا مذاق پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ایک حدیث کو جس میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں۔

رد کرسکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ جس شخص نے وقت نظر اور نکتہ شناسی کے ساتھ احکام شریعت کے اسرار اور مصالح کا تتبع کیا ہو وہ ایسے وجدان اور ذوق سے محروم رہے البتہ یہ نہائیت نازک اور ذمہ واری کا کام ہے جس کا صرف وہ شخص متکفل ہوسکتا ہے جو بہت ہی بڑا عالم۔ مجتہد۔ محدث۔ دقیقہ بین۔ مؤید بتائید الٰہی ہو لیکن ان شرطوں کا جامع امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ کون ہوسکتا ہے۔

مراتب احادیث کا تفاوت

نہائیت مہتم بالشان اور دقیق چیز جو امام ابوحنیفہؒ نے اِس فن میں اضافہ کی وہ احادیث کے مراتب کا تفاوت اور اُن تفاوتوں کے لحاظ سے احکام شرعیہ کی تقسیم ہے۔ احکام اور مسائل کا پہلا ماخذ قرآن ہے جس میں کسی کو گفتگو نہیں ہوسکتی۔ قرآن کے بعد حدیث کا رتبہ ہے۔ حدیث اور قرآن میں اصل امر کے لحاظ سے تو چنداں فرق نہیں۔ وہ وحی متلو ہے اور یہ غیر متلو۔ جو کچھ تفاوت اور اختلاف ہے وہ ثبوت کی حیثیت سے ہے۔ اگر کوئی حدیث اُسی تواتر اور قطعیت سے ثابت ہو جس طرح قرآن ثابت ہے تو اثبات احکام میں وہ قرآن کے ہم پلّہ ہے لیکن حدیثوں کے ثبوت کے مراتب متفاوت ہیں اور احکام کے ثبوت میں انہیں تفاوتوں کے لحاظ کی ضرورت ہے۔ محدثین نے حدیث کی جو تقسیمیں کی ہیں یعنی صحیح حسن ضعیف۔ مشہور۔ عزیز۔ غریب۔ وغیرہ اُن کے اختلاف مراتب سے احکام پر چنداں اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ اِن قسموں میں سے محدّثین صرف ضعیف کا اعتبار نہیں کرتے۔ باقی اقسام کو قریباً یکساں قابل حجت قرار دیتے ہیں۔ محدّثین کو اس سے زیادہ تدقیق اور امتیاز مراتب کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ استنباط احکام اور تفریع مسایل اُن کا فرض نہ تھا لیکن امام ابوحنیفہؒ کو تدوین فقہ کی وجہ سے جس کے وہ بانی اوّل ہیں زیادہ تدقیق اور فرق مراتب کی ضرورت پڑی۔ اُنہوں نے نوعیّت ثبوت کے لحاظ سے حدیث کی تین قسمیں قرار دیں۔

متواتر

(۱) متواتر۔ یعنی وہ حدیث جس کے رواۃ ہر طبقہ روائیت میں اس کثرت سے ہوں جن کے

تواتر علی الکذب کا گمان نہیں ہو سکتا۔ یعنی رسول اللہؐ سے بیشمار لوگوں نے روائیت کی ہو اسی طرح اُن لوگوں سے لیکر اخیر زمانہ تک بیشمار رواۃ روائیت کرتے آتے ہوں۔

مشہور

(۲) مشہور یعنی وہ حدیث جس کے رواۃ پہلے طبقہ روائیت میں تو بہت نہ ہوں لیکن دوسرے طبقہ سے اخیر تک اُسی کثرت سے ہوں جو متواتر کے لئے مشروط ہے۔

احاد

(۳) احاد۔ جو متواتر اور مشہور نہ ہو۔ اِس تقسیم کا اثر اُن کی رائے کے موافق احکام شرعیہ پر جو پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ متواتر سے فرضیت اور رکنیت ثابت ہو سکتی ہے مشہور کا درجہ چونکہ متواتر سے کم ہے اسلئے اُس سے فرضیت کا اثبات تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن میں جو حکم مطلق ہو۔ حدیث مشہور سے مقید ہو سکتا ہے۔ اِسی طرح اُس سے زیادۃ علی الکتاب ہو سکتی ہے۔ احاد کا ثبوت چونکہ بالکل ظنی ہے اسلئے وہ قرآن کے احکام منصوصہ پر کچھ اثر نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ مسئلہ اگرچہ نہایت واضح اور صاف ہے لیکن تعجب ہے کہ امام شافعی اور بعض اور محدثین اس کے مخالف ہیں۔ امام بیہقی وغیرہ نے بعض مناظرات نقل کئے ہیں جو امام شافعی اور امام محمد میں واقع ہوئے اور جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام شافعی نے امام محمد کو بند کر دیا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ مناظرے فرضی مناظرے ہیں جن کا ثبوت اصول روائیت کے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتا لیکن اِس سے اسقدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اِس مسئلہ کا انتساب۔ امام ابو حنیفہؒ کی طرف ضرور صحیح ہے۔

قوی سے قوی اعتراض اِس مسئلہ پر جو کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خود امام ابو حنیفہؒ اور اُن کے تلامذہ اُس کے پابند نہ رہ سکے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ امام شافعی نے امام محمد سے کہا کہ کیا آپ کے نزدیک خبر واحد سے قرآن پر زیادتی نہیں ہو سکتی امام محمدؒ نے کہا ہاں۔ امام شافعیؒ نے کہا قرآن مجید میں وارثوں کے حق میں وصیت کا حکم ہے آپ اِس حدیث کی بنا پر وصیت کو ناجائز کیوں قرار دیتے ہیں؟

غالباً شاہ صاحب نے یہ روائیت بیہقی کی کتاب مناقب الشافعی سے لی ہے جس میں اور بھی بہت بے سروپا روائیتیں مذکور ہیں لیکن ہم شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں

کہ حنفیوں کے نزدیک وارثوں کے حق میں وراثت[1] کا حکم کسی حدیث سے نہیں منسوخ ہوا بلکہ خود قرآن مجید کی اُس آیت سے جس میں توریث کے احکام ہیں۔ یہ صرف حنفیوں ہی کی رائے نہیں بلکہ تمام مفسرین کا یہی قول ہے (الا الشاذ النادر منہم)

اِن مسائل پر اور بھی بہت سی بحثیں پیدا ہو گئی ہیں جن کی تفصیل ہم نہیں کر سکتے لیکن اخبار احاد کی بحث اور اُس سے عقائد اسلام پر جو اثر پڑتا ہے اُس کو ہم اس موقع پر تفصیل سے لکھتے ہیں کیونکہ بعض محدثین کو زیادہ تر اسی مسئلہ میں اُن سے اختلاف ہے۔

اخبار احاد کی نسبت اگرچہ محققین اور اکثر ائمہ حدیث کا یہی مذہب ہے کہ وہ ظنی الثبوت ہیں لیکن ایک فرقہ اس کے خلاف بھی ہے جس کے سرگروہ علامہ ابن الصلاح ہیں۔ اگرچہ علامہ ابن الصلاح نے بھی اخبار احاد کی تمام اقسام کو قطعی نہیں تسلیم کیا ہے۔ اُنہوں نے حدیث صحیح کی سات قسمیں کی ہیں (۱) جس پر بخاری و مسلم دونوں متفق ہوں (۲) بخاری منفرد ہوں (۳) مسلم منفرد ہوں (۴) بخاری و مسلم نے اُس کو روایت نہ کیا ہو لیکن اُن کی شرطوں کے موافق ہو۔ (۵) صرف بخاری کی شرط پر ہو۔ (۶) صرف مسلم کی شرط پر ہو۔ (۷) بخاری و مسلم کی شرط کے موافق نہ ہو لیکن اور محدثین نے اُس کو صحیح تسلیم کیا ہو۔ ان سات قسموں میں سے علامہ ابن الصلاح پہلی قسم کو قطعی الصحۃ قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ وھذا القسم جمیعہ مقطوع بصحتہ و العلم النظری واقع بہ متفردات بخاری اور مسلم کی نسبت اُن کی رائے ہے کہ اسی قبیل میں داخل ہیں بجز اُن چند حدیثوں کے جن پر دارقطنی وغیرہ نے جرح کی ہے۔ ابن الصلاح کا قول اگرچہ ظاہر بینوں میں اور بالخصوص آجکل زیادہ رواج پا گیا ہے۔ لیکن کچھ شبہہ نہیں کہ وہ بالکل غلط اور بے دلیل خیال ہے۔ اور خود ائمہ حدیث اُس کے مخالف ہیں۔ علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں ابن الصلاح کا قول تفصیلاً نقل کر کے لکھتے ہیں۔ وھذا الذی ذکرہ الشیخ فی ھذہ المواضع خلاف ما قالہ المحققون والاکثرون فانھم قالوا احادیث

---

[1] وراثت مقررہ کے علاوہ وصیت کے مطابق وارث اور وراثت حاصل کرے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ خداوند تعالیٰ نے حصص وراثت جو کتاب مجید میں مقرر کئے ہیں اُن میں نقص ہے معاذ اللہ۔ یہ حدیث اگرچہ احاد سے ہے لیکن اس سے قرآن پر زیادتی نہیں بلکہ قرآن کے منشاء کو واضح کرنا ہے ۱۲ محشی

الصحیحین اللتی لیست بمتواترۃ انما تفید الظن فانہا احاد والاحاد انما تفید الظن علےٰ ما تقرر ولا فرق بین البخاری والمسلم وغیرھما فی ذالک یعنے شیخ ابن الصلاح۔ نے اِن موقعوں پر جو کچھ کہا وہ محققین اور اکثروں کی رائے کے خلاف ہے کیونکہ محققین اور اکثروں کا قول ہے کہ صحیحین کی حدیثیں جو تواتر کے رتبہ کو نہیں پہنچی ہیں صرف ظن کی مفید ہیں۔ کیونکہ وہ اخبار احاد ہیں اور اخبار احاد کی نسبت ثابت ہو چکا ہے کہ اُن سے صرف ظن پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس باب میں بخاری و مسلم اور اور لوگ سب برابر ہیں"۔ ابن الصلاح کے قول کو اور ائمہ فن نے بھی رد کیا ہے لیکن ہم اس بحث کو نقلی طور سے طے کرنا نہیں چاہتے۔ ہم کو خود غور کرنا چاہئے کہ اخبار احاد سے یقین پیدا ہو سکتا ہے یا ظن۔

احاد کی ظنی الثبوت ہونے کی تحقیق

کسی حدیث کو جب ایک محدث گو وہ کسی رتبہ کا ہو صحیح کہتا ہے تو اُس کا یہ دعویٰ درحقیقت چند ضمنی دعووں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ روائت متصل ہے۔ اُس کے رواۃ ثقہ ہیں۔ ضابطۃ القلب ہیں۔ روائت میں شذوذ نہیں ہے۔ کوئی علۃ قادحہ نہیں ہے۔ یہ سب امور ظنی اور اجتہادی ہیں۔ جن پر یقین کی بنیاد قایم ہو سکتی ہے۔ جس طرح ایک فقیہ کسی مسئلہ کو قرآن یا حدیث سے استنباط کر کے اپنی دانست میں صحیح سمجھتا ہے اور اُس کی صحت یقینی نہیں ہوتی۔ کیونکہ استنباط میں جن مقدمات سے اُس نے کام لیا ہے اکثر اُس کے ظنیات ہیں۔ اسی طرح حدیث کا حال ہے۔ کسی حدیث کو صحیح کہنا محدث کے ظنیات و اجتہادات پر مبنی ہے ایک یا چند محدثین نے کسی حدیث کو اگر صحیح کہا ہے۔ اور دوسرا شخص اُس کی صحت نہیں تسلیم کرتا تو وہ صرف اس گناہ کا مجرم ہے کہ اُس محدث یا محدثین کے اصول تحقیق۔ قواعد استنباط۔ طریق روائت۔ غرض اُن کے اجتہادات اور مزعومات کا مخالف ہے۔ حدیث کی تحقیق و تنقید کے لئے محدثین نے جو اصول مقرر کئے ہیں اور جن پر احادیث کی صحت کا مدار ہے۔ سب عقلی اور اجتہادی مسائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُن میں۔ خود محدثین باہم اختلاف عظیم رکھتے ہیں۔ ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ حدیث کا فن نقلی ہے نہ عقلی لیکن جس شخص نے اصول حدیث پر غور کی ہے وہ اس خیال کی غلطی کو نہائت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اِسی نکتہ کی طرف امام ابوحنیفہ نے اشارہ کیا ہے کہ ھذا الذی نحن فیہ رائی لا نجبر علیہ احداً ولا نقول یجب علےٰ احدٍ قبولہ

[۱] یعنی احاد احادیث وغیرہ کے ظنی الثبوت یا یقینی الثبوت کے ہم جو اصول قرار دے رہے ہیں چونکہ ہمارا اپنا استنباط اور

بعضوں نے غلطی سے امام صاحب کے اِس وسیع قول کو فقہ پر محدود سمجھا۔ لیکن اُن کو معلوم نہیں کہ مجتہد کو مسائل سے زیادہ مسائل کے ماخذ سے بحث ہوتی ہے۔

اصول حدیث۔ کے ظنی اور اجتہادی ہونے کا ہی اثر ہے کہ محدثین کو احادیث کی صحت و عدم صحت میں باہم اختلاف ہوتا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو نہایت صحیح۔ مستند و واجب العمل قرار دیتا ہے۔ دوسرا اُسی کو ضعیف بلکہ موضوع کہتا ہے۔ محدث ابن جوزی نے بہت سی حدیثوں کو موضوعات میں داخل کیا ہے۔ جن کو دوسرے محدثین صحیح اور حسن کہتے ہیں۔ ابن جوزی نے تو یہ قیامت کی کہ صحیحین کی بعض حدیثوں کو موضوع لکھ دیا۔ علامہ سخاوی لکھتے ہیں۔ بل ربما ادرج فیہا الحسن والصحیح مما ھو فی احد الصحیحین فضلاً عن غیرھا یعنے "ابن جوزی نے حسن اور صحیح تک کو جو بخاری یا مسلم میں موجود ہیں موضوعات میں درج کر دیا ہے۔ دوسری کتابوں کا کیا ذکر ہے"۔ بے شبہہ ابن جوزی نے اس افراط میں غلطی کی لیکن یہ غلطی ایک اجتہادی غلطی ہے جس کا حاصل اسی قدر ہے کہ اُنہوں نے بخاری یا مسلم کی صحیح اجتہاد کو غلط خیال کیا۔ اِن اصولی اختلافات کی وجہ سے احادیث کی صحت اور عدم صحت میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اُن کا استقصاء کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب طیار ہو سکتی ہے۔

حدیث مرفوع کی پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ رسول اللہؐ تک متصل ثابت ہو لیکن اتصال کے ثبوت کے جو طریقے تسلیم کئے ہیں اُن میں اکثر ظنی اور اجتہادی ہیں۔ صحابہ کے اِن الفاظ کو۔ "یہ امر سنت ہے"۔ "ہم کو یہ حکم دیا گیا تھا"۔ "ہم اس بات سے روکے گئے تھے"۔ "رسول اللہؐ کے زمانہ میں ہم فلاں کام کرتے تھے"۔ "یا ہم اُس کو بُرا نہیں سمجھتے تھے اکثروں نے مرفوع قرار دیا ہے۔ اور بعضوں نے یہانتک وسعت دی کہ جن حدیثوں میں یہ الفاظ تھے اُن کو اِن لفظوں سے روائیت کر دیا کہ "رسول اللہؐ نے یہ فرمایا"۔ حالانکہ یہ الفاظ تھے اُن کو ان لفظوں سے روایت کر دیا کہ "رسول اللہؐ نے یہ فرمایا"۔ حالانکہ یہ الفاظ اِس معنی میں قطعی الدلالۃ نہیں ہیں۔ بلکہ صحابہ کے ظن اور اجتہاد پر مبنی ہیں جس کی نسبت عموماً تسلیم کیا گیا ہے کہ فہم الصحابی لیس بحجۃ یعنے صحابی کی سمجھ کوئی دلیل نہیں۔ اسی بنا پر بعض علما نے اختلاف کیا اور کہا کہ یہ الفاظ اتصالِ رفع کے لئے کافی نہیں ہیں۔ امام شافعی۔ ابن حزم ظاہری۔ ابوبکر رازی۔ اور دیگر محققین نے

صحابہ کے اس قول کو کہ "یہ فعل سُنّت ہے" حدیث مرفوع نہیں قرار دیا۔ کتب سیر واحادیث میں بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن میں صحابی نے یہ الفاظ استعمال کئے اور وہ حدیث نبوی نہ تھی بلکہ خود اُن کا قیاس واجتہاد تھا۔ لیکن اکثر محدثین نے اِن حدیثوں کو مرفوع کہا۔ اِس خیال نے یہ آفت پیدا کی کہ اُس کی بنا پر بعض رواۃ نے صریح مرفوع الفاظ میں حدیث کی روائیت کردی جس کی وجہ سے ایک عام شبہہ پیدا ہوگیا۔

معنعن روائیتیں

معنعن روائیتوں میں اتصال کا ثابت ہونا نہایت مشکل ہے۔ حالانکہ اِس قسم کی روائیتیں کثرت سے ہیں۔ امام بخاری کا مذہب ہے کہ معنعن حدیثوں میں اگر یہ ثابت ہو کہ راوی اور مروی عنہ دونوں ہمزماں تھے اور کبھی ملے بھی تھے تو وہ حدیث متصل سمجھی جائیگی امام مسلم حالانکہ امام بخاری کے شاگرد اور زیادہ تر اُنہیں کے طریقے کے پیرو تھے۔ تاہم اُنہوں نے نہایت سختی سے اِس شرط کی مخالفت کی اور صرف ہمزمان ہونا کافی سمجھا[1] اِس اختلاف کا یہ نتیجہ ہے کہ امام بخاری کے اصول کے موافق۔ امام مسلم کی وہ تمام معنعن روائیتیں جن میں لقا نہیں ثابت ہے مقطوع ہیں۔ حالانکہ امام مسلم۔ اُن کو متصل سمجھتے ہیں۔ اور اِس پر اُن کو یہانتک اصرار ہے کہ اپنے مخالف کو سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ امام مسلم نے تو زیادہ توسیع کی لیکن امام بخاری کی شرط کے موافق بھی معنعن روائیت میں اتصال کا ثبوت محض ظنی ہے۔ یہ کچھ ضرور نہیں کہ دو شخص ہمزمان اور ہم لقا ہوں تو اُن کی روائیتیں ہمیشہ بالذات ہوں۔ جہاں حدثنا اور اخبرنا ہوگا۔ وہاں ایسا ہونا البتہ ضرور ہے۔ لیکن اگر یہ الفاظ نہیں ہیں اور راوی نے عن کے لفظ سے روائیت کی ہے تو اتصال کا خیال قیاس غالب ہوگا لیکن یقینی نہ ہوگا۔ حدیث وسیر میں بیسیوں مثالیں مل سکتی ہیں کہ دو راوی۔ ایک زمانہ میں تھے اور آپس میں ملاقات بھی تھی۔ تاہم ایک نے دوسرے سے بعض روائیتیں بواسطہ کیں۔ روزمرہ کے تجربوں میں اس کی سیکڑوں شہادتیں ملتی ہیں۔

رجال کی تنقید

سب سے بڑا ضروری اور اہم مسئلہ رجال کی تنقید ہے۔ اخبار احاد کا تمامتر مدار رجال پر ہے لیکن رجال کی تنقید وتوثیق۔ ایسا ظنی مسئلہ ہے جس کا قطعی فیصلہ نہایت مشکل اور قلیل الوجود ہے۔ ایک شخص کو بہت سے لوگ نہایت ثقہ۔ نہایت متدین۔ نہائیت راستباز

[1] دیکھو مقدمہ صحیح مسلم ۱۲

سمجھتے ہیں اُسی شخص کو دوسرے اشخاص ضعیف الروایۃ۔ غیر ثقہ۔ نا قابل اعتبار۔ خیال کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اس رتبہ کے ہوتے ہیں جن کی عظمت وشان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ امام بخاری و مسلم میں گو ایسا سخت اختلاف نہیں ہے۔ تاہم بہت سے رُواۃ ہیں جن کو اِن دونوں اماموں میں سے ایک قابل حجت سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں سمجھتا۔ علامہ نووی نے مقدمہ شرح صحیح مسلم میں بعضوں کے نام بھی لکھے ہیں۔ اور محدث حاکم کی کتاب المدخل سے نقل کیا ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد جن سے امام مسلم نے مسند صحیح میں احتجاج کیا ہے اور امام بخاری نے جامع صحیح میں اُن سے حجت نہیں لی ۶۲۵ ہے۔

میزان الاعتدال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں رُواۃ ہیں جنکی جرح وتعدیل مختلف فیہ ہے اور ایسا ہونا ضرور تھا۔ کسی شخص کے اُن تمام اوصاف وعادات پر مطلع ہونا جن کا اثر روایت کی قوت وضعف پر پڑ سکتا ہے۔ مدتوں کی ملاقات اور تجربہ پر موقوف ہے۔ جو لوگ جرح وتعدیل کے کام میں مصروف تھے سیکڑوں ہزاروں راویوں سے ایسی عمیق واقفیت کیونکر حاصل کر سکتے تھے۔ اِسی لئے مختلف قرائن ظاہری آثار۔ عام شہرت۔ سمعی روائتوں سے کام لینا پڑتا تھا اور بہت کم قطعی فیصلہ ہو سکتا تھا۔ اگرچہ محدثین۔ نے ان متعارضات کے رفع کرنے کے لئے اصول قرار دئے ہیں لیکن وہ اصول خود اجتہادی اور مختلف فیہ ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد موقعوں پر محدثین کو خود اپنے اصول سے انحراف کرنا پڑتا ہے۔ جرح کو عموماً تعدیل پر مقدم مانا گیا ہے۔ لیکن بہت سے رواۃ ہیں جن کی نسبت اِس قاعدہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔ محمد بن بشار المصری۔ احمد بن صالح مصری۔ عکرمہ مولی ابن عباس۔ کی نسبت مفسر جرحیں موجود ہیں تاہم اِن جرحوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

تعجب یہ ہے کہ جارحین ومعدلین دونوں ائمہ فن ہوتے ہیں اور اُن کی رایوں میں اسقدر اختلاف ہوتا ہے جس سے تعجب پیدا ہوتا ہے۔ جابر جعفی کوفی۔ ایک مشہور راوی ہے۔ جس کو دعوے تھا کہ مجھ کو پچاس ہزار حدیثیں یاد ہیں۔ اُس کی نسبت ائمہ جرح وتعدیل کی یہ رائیں ہیں۔ سفیان کا قول ہے کہ میں نے جابر سے زیادہ محتاط حدیث میں نہیں دیکھا۔ شعبہ کہتے ہیں کہ جابر جب اخبرنا وحدثنا کہیں تو وہ الناس[1] ہیں۔ امام سفیان ثوری نے شعبہ سے

[1] یعنی لا یعباء بہ ۱۲ المحشی

کہا کہ اگر تم جابر جعفی میں گفتگو کروگے۔ تو میں تم میں گفتگو کروں گا۔ وکیع کا قول ہے کہ تم لوگ اور کسی بات میں شک کرو تو کرو لیکن اس بات میں کچھ شک نہ کرو کہ جابر جعفی۔ ثقہ ہیں۔ اِس کے مقابلہ میں اور ائمہ فن کی رائیں ہیں جن کے یہ الفاظ ہیں کہ وہ متروک ہے۔ کذاب ہے۔ وضاع ہے چنانچہ اخیر فیصلہ جو پچھلے محدثوں نے کیا وہ یہی ہے کہ جابر کی روائیت قابل اعتبار نہیں۔

اِس سے یہ غرض نہیں کہ جرح و تعدیل کا فن ناقابل اعتبار ہے۔ بلکہ یہ مقصود ہے کہ جن وسایل اور طرق سے رجال کے حالات قلمبند کئے گئے اور کئے جاسکتے تھے۔ اُن کا مرتبہ ظن غالب۔ یا محض ظن سے فائق نہیں ہوسکتا۔ اسلئے اُس پر یقینیات اور قطعیات کی بُنیاد نہیں قایم ہوسکتی۔

ادائے مطلب

اِن امور کے بعد تادیہ معنی کی بحث باقی رہتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث تمام محدثین اور مجتہدین کے اصول کے موافق متصل بھی ہے۔ رُواۃ بھی ثقہ ہیں۔ شذوذ بھی نہیں ہے لیکن یہ بحث اب بھی باقی ہے کہ راوی نے ادائے مطلب کیونکر کیا؟ موقع اور محل روائیت کی تمام خصوصیتیں ملحوظ رکھیں یا نہیں؟ فہم مطلب۔ یا طریقہ اداء میں تو کوئی غلطی نہیں کی؟ چونکہ یہ مسلّم ہے کہ حدیثیں اکثر بالمعنی روائیت کی گئی ہیں اس لئے اِن احتمالات کو زیادہ قوت ہوجاتی ہے۔ صحابہ کے زمانہ میں کسی روائیت کی صحت سے انکار کیا جاتا تھا۔ تو اِسی بنا پر کیا جاتا تھا۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ صحابہ عموماً ثقہ تھے اور اُن کی روائیت میں انقطاع کا کوئی احتمال نہ تھا۔ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے مسئلہ دریافت کیا کہ مجھ کو غسل کی حاجت ہوئی اور پانی نہ مل سکا حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نماز نہ پڑھو۔ عمار موجود تھے اُنہوں نے اِس مسئلہ کے متعلق رسول اللہ صلعم سے ایک روائیت بیان کی اور کہا کہ اُس موقع پر آپ بھی موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ اتق اللہ یاعمار۔ یعنی "اے عمار خدا سے ڈرو"۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ۔ عمار کو کاذب الروایۃ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن اس احتمال پر کہ شاید ادائے مطلب میں غلطی ہوئی۔ یہ الفاظ فرمائے چنانچہ عمار نے کہا "کہ اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو میں یہ حدیث نہ روائیت کیا کروں"۔ اخبار احاد کی بحث کو ہم نے قصداً اسلئے طول دیا کہ محدثین زیادہ تر اُسی مسئلہ کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ پر ردو قدح کرتے ہیں۔ حالانکہ امام صاحب کا مذہب۔ نہائیت تحقیق اور دقت نظر پر مبنی ہے۔

یہ تمام احتمالات اور اجتہادات اخبار احاد کے ساتھ مخصوص۔ متواتر اور مشہور میں اِن

بحثوں کا مساغ نہیں۔ انہیں وجوہ اور اسباب سے اخبار احاد کے متعلق مختلف رائیں پیدا ہوگئیں۔ معتزلہ نے تو سرے سے انکار کیا۔ اُن کے مقابلہ میں بعض محدثین نے یہ شدۃ کی کہ خبر واحد کو قطعی قرار دیا۔ صرف یہ شرط لگائی کہ رواۃ ثقہ ہوں۔ اور انقطاع وشذوذ وعلت نہ ہو۔ بعض محدثین اگرچہ اصول کے طور پر اخبار احاد کو ظنی کہتے ہیں لیکن جزئیاتِ احکام اور مسائل اعتقادی میں اس کا خیال نہیں رکھتے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس بحث میں جو مسلک اختیار کیا وہ نہائیت معتدل اور اُن کی وقت نظر کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اُنہوں نے نہ معتزلہ کی طرح سرے سے انکار کیا۔ نہ ظاہر بینوں کی طرح خوش اعتقادی سے اُس کی قطعیت تسلیم کی۔ امام صاحب کی یہ رائے بڑے بڑے صحابہ کی رائے کے موافق ہے۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عائشہؓ۔ عبداللہ بن مسعود نے متعدد موقعوں پر خبر واحد کی تسلیم میں تردد کیا ہے۔ جس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اخبار احاد کو قطعی نہیں سمجھتے تھے۔ فاطمہ بنت قیس نے جب حضرت عمرؓ کے سامنے رسول اللہؐ سے روائیت کی کہ لا سکنی ولا نفقۃ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ لا نترك كتاب الله بقول امرأة لا ندری حفظت ام کذبت یعنی "ایک عورت کی روائیت کی بنا پر جس کی نسبت معلوم نہیں کہ اُس نے غلط کہا یا صحیح۔ ہم کتاب الٰہی کو چھوڑ نہیں سکتے۔ فقہی احکام اس قاعدہ کی متعدد تفریعیں ہیں مثلاً یہ کہ اخبار احاد سے کسی حکم کا فرض ہونا نہیں ثابت ہو سکتا۔ کیونکہ فرضیت۔ ثبوت قطعی کی محتاج ہے البتہ اُس سے ظن غالب پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے وجوب۔ تسنن۔ استحباب۔ ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر نماز میں قرأۃ فاتحہ۔ کو امام شافعی۔ فرض سمجھتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہؒ۔ واجب۔ اس اصول پر بہت سے احکام متفرع ہیں۔

خبر واحد میں صحابہ نے شک کیا

فقہ سے زیادہ اس قاعدہ کا اثر علم کلام پر پڑتا ہے۔ اور یہی چیز ہے جس نے ایک زمانہ کو امام ابوحنیفہؒ کا مخالف بنا دیا تھا۔ امام صاحب نے مذکورۂ بالا قاعدہ کی بنا پر یہ اصول قرار دیا تھا کہ جو مسائل اور عقائد۔ اسلام میں متفق علیہ ہیں اُن کے خلاف اخبار احاد۔ قابل اعتبار نہیں۔ مثلاً انبیا کی عصمت۔ اہل حق کا ایک مسلّمہ مسئلہ ہے۔ اس کے برخلاف۔ جن روائیتوں سے انبیا کا مرتکب کبائر ہونا ثابت ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے اصول کے موافق وہ روائتیں قابل اعتبار نہیں۔ اِس اصول کی بنا پر بہت سے اشکالات سے جو ملاحدہ پیش کرتے ہیں نجات ملتی ہے،

اس قاعدہ کا اثر علم کلام کے مسائل پر

لیکن افسوس ہے کہ اکثر ارباب روایت نے اس عمدہ اصول کی قدر نہ کی بلکہ اُلٹی اور مخالفت کی۔ علامہ ابن عبد البر نے جو مشہور محدث ہیں کتاب العلم میں لکھا ہے۔ کان من مذھب الامام ابی حنیفۃ فی الاخبار الاحاد ان لا یقبل منھا المخالف الاصول المجمع علیھا فانکر علیہ اصحاب الحدیث فافرطوا[۱]۔ یعنی اخبار احاد میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ مذہب تھا کہ اصول متفق علیہ کے خلاف ہو تو قابل قبول نہیں۔ اس پر اصحاب حدیث نے اُن کی مخالفت کی اور افراط کو پہنچا دیا۔"

محدثین اور امام ابو حنیفہؒ کے اصول میں عملاً یہ فرق ہے کہ جو حدیث اصول متفق علیہ کے خلاف ہوتی تھی محدثین اُس کی صحت کو تسلیم کر کے تاویل سے کام لیتے تھے۔ حالانکہ اکثر جگہ محض بارد تاویل ہوتی تھی بخلاف اس کے امام صاحب اِس طرف مائل ہوتے تھے کہ چونکہ وہ حدیث متواتر اور مشہور نہیں ہے اسلئے ممکن ہے کہ رُواۃ نے غلطی یا مسامحت کی ہو۔ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں ایک بحث لکھی ہے جو اس موقع کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ایک شخص سے میں نے کہا کہ یہ حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم تین بار جھوٹ بولے۔ ماکذب ابراھیم الا ثلث کذبات۔ صحیح نہیں۔ کیونکہ اِس سے حضرت ابراہیم کا (نعوذ باللہ) کاذب ہونا لازم آتا ہے۔ اُس شخص نے کہا کہ اِس حدیث کی رواۃ ثقہ ہیں اُن کو کاذب کیونکر کہا جائے۔ میں نے جواب دیا کہ حدیث کو صحیح مانیں تو حضرت ابراہیم کا کذب لازم آتا ہے۔ اور غلط تسلیم کریں تو راوی کو کاذب ماننا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بدیہی بات ہے کہ حضرت ابراہیم کو راوی پر ترجیح ہے۔" امام رازی کا استدلال۔ امام ابو حنیفہؒ کے اِسی خیال پر مبنی ہے۔ یعنی چونکہ انبیا کا معصوم اور صادق ہونا متفق علیہ ہے۔ اِسلئے خبر واحد اُس کے متعارض نہیں ہو سکتی۔ افسوس ہے کہ محدث قسطلانی صحیح بخاری کی شرح میں اِس استدلال کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "جب رُواۃ ثقہ ہیں تو حدیث کو بہر حال صحیح ماننا چاہئے۔"

اِسی اصول پر امام صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ہر سورہ کے شروع میں جزو قرآن نہیں ہے۔" امام شافعی۔ اور بعض محدثین اِس کے خلاف ہیں اور

[۱] اس عبارت کو حافظ ابو المحاسن نے عقود الجمان میں نقل کیا ہے ۱۲۔ اللھم ۱۲ محشی

سند میں چند حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے یہ جواب ہے کہ قرآن تواتر سے ثابت ہے اور جو تواتر سے ثابت ہے وہی قرآن ہے۔ اخبار احاد سے قرآن نہیں ثابت ہو سکتا۔ اسی طرح امام صاحب کے اصول کے مطابق، وہ روائتیں قابل اعتنا نہیں ہیں جن میں عبداللہ بن مسعود کی طرف معوذتین۔ کا انکار منسوب کیا گیا ہے حافظ ابن حجر نے ان روائیتوں کو صحیح تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ "روائت سے انکار نہیں کرنا چاہئے بلکہ تاویل سے کام لینا چاہئے"۔ لیکن تاویل کیا ہو سکتی ہے۔ خدانخواستہ یا تو یہ ماننا پڑیگا کہ معوذتین۔ متواتر نہیں ہیں۔ یا تواتر کا اتنا رتبہ گھٹانا ہو گا کہ رسول اللہؐ کے اصحاب کو بھی اُس سے واقف ہونا ضرور نہ ہو امام صاحب کے اس اصول کے مطابق اسلام کا دایرہ اُسقدر وسیع رہتا ہے جسقدر کہ اُس کو رہنا چاہئے۔ بخلاف اس کے اور لوگوں کی رائے کے مطابق اُس کی وسعت نقطہ سے بھی کم رہجاتی ہے مثلاً یہ مسلم اور یقینی ہے کہ جو شخص توحید و نبوت کا قائل ہے اور دل سے اُس پر اعتقاد رکھتا ہے وہ قرآن مجید کی نص کے مطابق مسلمان ہے۔ اب اس کے مقابلہ میں وہ حدیثیں جو قطعی الثبوت نہیں ہیں۔ اور جن میں بہت سے خارجی امور پر کفر کا حکم دیا گیا ہے کچھ اثر نہیں پیدا کر سکتیں اسی بنا پر امام صاحب معتزلہ قدریہ۔ جہمیہ۔ وغیرہ کو کافر نہیں کہتے تھے اور اس قسم کی حدیثوں کا کہ "بہتر فرقوں میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہے اور باقی دوزخی" اعتبار نہیں کرتے تھے لیکن بہت سے ظاہر بینوں نے ان حدیثوں کا یہ رُتبہ قائم کیا کہ اُن کی بنا پر بات بات پر کُفر کے فتوے دئیے یہانتک کہ جو شخص وضع قطع میں ذرا بھی کسی دوسرے کے مشابہ ہو جائے وہ کافر ہے خود متاخرین حنفیہ نے امام صاحب کے اس عمدہ اصول کو نظر انداز کر دیا اور سینکڑوں ہزاروں مسئلے کفر کے ایجاد کر دئے جن کی تفصیل سے فقہ کی کتابیں مالامال ہیں ؎

فقہ

اسلامی علوم مثلاً تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ مغازی۔ ان کی ابتدا اگرچہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہوئی لیکن جس وقت تک اُن کو فن کی حیثیت نہیں حاصل ہوئی وہ کسی خاص شخص کی طرف منسوب نہیں ہوئے۔ دوسری صدی کے اوائل میں تدوین و ترتیب شروع ہوئی ہے اور جن لوگوں نے

تدوین و ترتیب کی وہ اُن علوم کے بانی کہلائے چنانچہ بانی فقہ کا لقب۔ امام ابو حنیفہؒ کو ملا جو درحقیقت اِس لقب کے سزاوار تھے۔ اگر ارسطو علم منطق کا موجد ہے تو بے شبہ امام ابو حنیفہؒ بھی علم فقہ کے موجد ہیں۔ امام صاحب کی علمی زندگی کا بڑا کارنامہ فقہ ہی ہے اسلئے ہم اُس پر تفصیلی بحث کرنی چاہتے ہیں لیکن اصل مقصد سے پہلے ضرور ہے کہ مختصر طور پر ہم علم فقہ کی تاریخ لکھیں جس سے ظاہر ہو کہ علم کب شروع ہُوا اور کیونکر شروع ہُوا؟ اور خاصکر یہ کہ امام ابو حنیفہؒ نے جب اُس کو پایا تو اُس کی کیا حالت تھی؟

فقہ کی مختصر تاریخ

فقہ۔ کی تاریخ پر شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک نہایت عمدہ مضمون لکھا ہے جسکا التقاط ہمارے لئے کافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "رسول اللہؐ کے زمانہ میں احکام کی قسمیں نہیں پیدا ہوئی تھیں۔ آنحضرتؐ صحابہ کے سامنے وضو فرماتے تھے۔ اور کچھ نہ بتاتے تھے۔ کہ یہ رُکن ہے۔ یہ واجب ہے۔ یہ مستحب ہے۔ صحابہ۔ آپ کو دیکھ کر۔ اُسی طرح وضو کرتے تھے نماز کا بھی یہی حال تھا۔ یعنے صحابہ۔ فرض و واجب وغیرہ کی تفصیل و تدقیق نہیں کیا کرتے تھے جسطرح رسول اللہؐ کو نماز پڑھتے دیکھا۔ خود بھی پڑھ لی۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ "میں نے کسی قوم کو رسول اللہؐ کے اصحاب سے بہتر نہیں دیکھا۔ لیکن اُنہوں نے رسول اللہؐ کی تمام زندگی میں تیرہ ۱۳ مسئلوں سے زیادہ نہیں پوچھے۔ جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں۔ البتہ جو واقعات غیر معمولی طور سے پیش آتے تھے اُن میں۔ لوگ آنحضرتؐ سے استفتا کرتے اور آنحضرتؐ جواب دیتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ لوگوں نے کوئی کام کیا اور آپ نے اُس پر تحسین کی یا اُس سے ناراضامندی ظاہر کی۔ اِس قسم کے فتاوے اکثر عام مجمعوں میں ہوتے تھے۔ اور لوگ آنحضرتؐ کے اقوال کو محفوظ رکھتے تھے۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد۔ فتوحات کو نہایت وسعت ہوئی اور تمدن کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ واقعات اس کثرت سے پیش آئے کہ اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑی اور اجمالی احکام کی تفصیل پر متوجہ ہونا پڑا۔ مثلاً کسی شخص نے غلطی سے نماز میں کوئی عمل ترک کر دیا۔ اب بحث یہ پیش آئی کہ "نماز ہوئی یا نہیں"۔ اِس بحث کے۔ پیدا ہونے کے ساتھ یہ تو ممکن نہ تھا کہ نماز میں جسقدر اعمال تھے سب کو فرض کہدیا جاتا۔ صحابہ کو تفریق کرنی پڑی کہ نماز

ہیں کتنے ارکان فرض و واجب ہیں۔ کتنے مسنون اور مستحب۔ اِس تفریق کے لئے جو اصول قرار دئے جاسکتے تھے۔ اُن پر تمام صحابہ کی رائیوں کا متفق ہونا ممکن نہ تھا۔ اسلئے مسائل میں اختلاف آرا ہُوا اور اکثر مسئلوں میں صحابہ کی مختلف رائیں قائم ہوئیں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے کہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں اُن کا عین و اثر بھی پایا گیا صحابہ کو اِن صورتوں میں۔ استنباط۔ تفریع۔ حمل النظیر علے النظیر۔ قیاس۔ سے کام لینا پڑا۔ ان اصول کے طریقے یکساں نہ تھے۔ اسلئے ضروری اختلاف پیدا ہوئے۔ غرض صحابہ ہی کے زمانہ میں۔ احکام اور مسائل۔ کا ایک دفتر بن گیا اور جُدا جُدا طریقے قائم ہو گئے صحابہ میں سے جن لوگوں نے استنباط و اجتہاد سے کام لیا۔ اور مجتہد یا فقیہ۔ کہلائے اُن میں سے چار بزرگ نہایت ممتاز تھے عمرؓ۔ علیؓ۔ عبداللہ بن مسعود۔ عبداللہ بن عباس۔ حضرت علیؓ و عبداللہ بن مسعود زیادہ تر کوفہ میں رہے اور وہیں اُن کے مسائل و احکام کی زیادہ ترویج ہوئی۔ اِس تعلق سے کوفہ۔ فقہ کا دارالعلوم بن گیا۔ جس طرح کہ حضرت عمرؓ و عبداللہ بن عباس کے تعلق سے حرمین کو دارالعلوم۔ کا لقب حاصل ہُوا تھا۔

مجتہدین صحابہ

حضرت علیؓ

حضرت علیؓ۔ بچپن سے رسول اللہؐ۔ کی آغوش تربیت میں پلے تھے۔ اور جسقدر اُن کو آنحضرتؐ کے اقوال و افعال سے مطلع ہونے کا موقع ملا تھا کسی کو نہیں ملا تھا۔ ایک شخص نے اُن سے پوچھا کہ آپ اور صحابہ کی نسبت کثیر الروایۃ کیوں ہیں۔؟ فرمایا کہ "میں آنحضرتؐ سے کچھ دریافت کرتا تھا تو بتاتے تھے اور چُپ رہتا تھا تو خود ابتدا کرتے تھے"۔ اس کے ساتھ ذہانت۔ قوت استنباط۔ ملکہ استخراج۔ ایسا بڑھا ہوا تھا کہ عموماً صحابہ۔ اعتراف کرتے تھے حضرت عمرؓ۔ کا عام قول تھا کہ "خدا نہ کرے کہ کوئی مشکل مسئلہ آن پڑے اور علیؓ موجود نہ ہوں"۔ عبداللہ بن عباس۔ خود مجتہد تھے مگر کہا کرتے تھے کہ "جب ہم کو علیؓ۔ کا فتوےٰ مل جائے تو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں"۔

عبداللہ بن مسعود

عبداللہ بن مسعود بھی حدیث و فقہ۔ دونوں میں کامل تھے۔ رسول اللہؐ کے ساتھ جسقدر جلوت و خلوت میں وہ ہمدم و ہمراز رہے تھے بہت کم لوگ رہے ہونگے صحیح مسلم میں ابو موسیٰ سے روائت ہے کہ ہم یمن سے آئے اور کچھ دنوں تک (مدینہ میں) رہے۔ ہم نے

عبداللہ بن مسعودؓ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس اِس کثرت سے آتے جاتے دیکھا کہ ہم اُنکو رسول اللہ ﷺ کے اہلبیت سے گمان کرتے رہے"۔ عبداللہ بن مسعودؓ کو دعوے تھا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کی نسبت میں یہ نہ جانتا ہوں کہ کس باب میں اُتری ہے" وہ کہا کرتے تھے کہ "اگر کوئی شخص قرآن مجید کا مجھ سے زیادہ عالم ہوتا تو میں اُس کے پاس سفر کر کے جاتا"۔ صحیح مسلم میں ہے کہ اُنہوں نے ایک مجمع میں دعوے کیا کہ تمام صحابہ جانتے ہیں کہ میں قرآن کا سب سے زیادہ عالم ہوں شقیق اس جلسہ میں موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اس واقعہ کے بعد میں اکثر صحابہ کے حلقوں میں شریک ہُوا مگر کسی کو عبداللہ بن مسعودؓ کے دعوے کا منکر نہیں پایا۔

عبداللہ بن مسعودؓ باقاعدہ طور پر حدیث و فقہ کی تعلیم دیتے تھے اور اُن کی درسگاہ میں بہت سے تلامذہ کا مجمع رہتا تھا۔ جن میں سے چند شخص یعنی اسود۔ عبیدہ۔ حارث۔ علقمہ۔ نہایت نامآور ہوئے علقمہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے۔ اور حضرت عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ۔ عائشہؓ۔ سعدؓ۔ حذیفہؓ۔ خالد بن الولید۔ خبابؓ۔ اور بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں۔ خاصکر عبداللہ بن مسعودؓ کی صحبت میں۔ اِس التزام سے رہے تھے اور اُن کے طور و طریقے کے اسقدر قدم بقدم چلتے تھے کہ لوگوں کا قول تھا کہ "جس نے علقمہ کو دیکھ لیا اُسنے عبداللہ بن مسعودؓ کو دیکھ لیا"۔ خود عبداللہ بن مسعودؓ کا قول تھا کہ جسقدر علقمہ کی معلومات ہیں میری معلومات اُس سے زیادہ نہیں ہیں"۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ صحابہ اُن سے مسائل دریافت کرنے آتے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں میں اگر کوئی شخص علقمہ کا ہمسر تھا تو اسود تھے۔

ابراہیم نخعی

علقمہ و اسود کے انتقال کے بعد ابراہیم نخعی مسند نشین ہوئے۔ اور فقہ کو بہت کچھ وسعت دی یہانتک کہ اُن کو فقیہ العراق کا لقب ملا۔ علم حدیث میں اُن کا یہ پایہ تھا کہ صیرفی الحدیث کہلاتے تھے۔ امام شعبی نے جو علامۃ التابعین کے لقب سے ممتاز ہیں اُن کی وفات کے وقت کہا کہ "ابراہیم نے کسی کو نہیں چھوڑا جو اُن سے زیادہ عالم اور فقیہ ہو"۔ اس پر ایک شخص نے تعجب سے پوچھا کہ کیا حسن بصری۔ اور ابن سیرین بھی؟ شعبی نے کہا حسن بصری اور ابن

سیرین پر گیا ختم ہے۔ بصرہ۔ کوفہ۔ شام۔ حجاز۔ میں کوئی شخص اُن سے زیادہ عالم نہیں رہا۔
ابراہیم نخعی کے عہد میں مسائل فقہ کا ایک مختصر مجموعہ طیار ہو گیا تھا جس کا ماخذ حدیث
نبوی اور حضرت علیؓ اور عبد اللہ بن مسعود۔ کے فتاوے تھے۔ یہ مجموعہ گو مرتب طور پر قلمبند
نہیں کیا گیا۔ لیکن اُن کے شاگردوں کو اُس کے مسائل زبانی یاد تھے۔ سب سے زیادہ یہ
مجموعہ۔ حماد کے پاس جمع تھا۔ جو ابراہیم۔ کے تلامذہ میں نہایت ممتاز تھے۔ چنانچہ اُن کے مرنے
کے بعد فقہ۔ کی مسند خلافت بھی انہیں کو ملی۔ حماد۔ نے گو فقہ۔ کو چنداں ترقی نہیں دی لیکن وہ
ابراہیم۔ کے مجموعہ فقہ کے بہت بڑے حافظ تھے۔ حماد نے سنہ ۱۲۰ھ ہجری میں قضا کی اور لوگوں
نے اُن کی جگہ امام ابوحنیفہؒ۔ کو فقہ کی مسند پر بٹھایا۔

امام صاحب کے زمانہ تک اگرچہ فقہ کے معتد بہ مسائل مدون ہو چکے تھے لیکن اولاً تو یہ تدوین
صرف زبانی روائت تھی۔ دوسرے جو کچھ تھا فن کی حیثیت سے نہ تھا نہ استنباط و استدلال کے قواعد
قرار پائے تھے نہ احکام کی تفریع کے اصول منضبط تھے نہ حدیثوں میں امتیاز مراتب تھا اور شبیہ
النظیر علی النظیر کے قاعدے مقرر تھے مختصر یہ کہ فقہ۔ جزئیات مسائل کا نام تھا اور اُسکو قانون
کے رتبہ تک پہنچانے کے لئے بہت سے زینے باقی تھے۔ تاریخ سے اِس بات کا پتہ لگانا مشکل
ہے کہ امام ابوحنیفہؒ۔ کو خاص کس وجہ سے فقہ۔ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ قلائد عقود العقیان۔
کے مصنف نے کتاب۔ انموذج القتال۔ سے اِس کا ایک قصہ نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں
کہ دو شخص حمام میں نہانے گئے اور حمامی کے پاس کچھ امانت رکھتے گئے۔ ایک اُن میں سے
نہا کر نکلا اور حمامی سے امانت طلب کی۔ اُس نے دیدی یہ لیکر چلتا ہوا۔ دوسرا حمام سے باہر آیا
اور امانت مانگی تو اُس نے عذر کیا کہ میں نے تمہارے شریک کو حوالہ کر دی۔ اس نے عدالت
میں استغاثہ کیا۔ قاضی صاحب نے حمامی کو مجرم ٹھہرایا۔ کہ جب دونوں نے مل کر تیرے
پاس امانت رکھی تھی تو تجھ کو ضرور تھا کہ دونوں کی موجودگی میں واپس کرتا۔ حمامی گھبرایا ہوا
امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا۔ امام صاحب نے کہا کہ تم جا کر اُس شخص سے کہو کہ میں تمہاری
امانت ادا کرنے کے لئے طیار ہوں لیکن قاعدہ کے موافق تنہا تم کو نہیں دے سکتا۔ شریک
کو لاؤ تو لیجاؤ۔ اس واقعہ کے بعد امام صاحب کو فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ اور اُسکی

امام ابوحنیفہؒ کو فقہ کی تدوین کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔

اصلی اسباب

ترتیب شروع کی۔

ممکن ہے کہ یہ واقع صحیح ہو لیکن اس خیال کے پیدا ہونے کے اصلی اسباب اور تھے یہ امر تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام صاحب کو تدوینِ فقہ کا خیال قریباً ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا یعنے جب اُن کے اُستاد حماد نے وفات کی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اسلام کا تمدن نہایت وسعت پکڑ گیا تھا۔ عبادات اور معاملات کے متعلق اس کثرت سے واقعات پیدا ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے کہ ایک مرتب مجموعہ قانون کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تھا۔ نیز سلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول۔ سے تعلیم و تعلم نے اسقدر وسعت حاصل کر لی تھی کہ زبانی سند و روایت اُس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے وقت پر قدرتی طور پر۔ لوگوں کے دل میں خیال آیا ہو گا کہ ان جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دے کر ایک فن بنا دیا جائے۔

امام ابو حنیفہ رہ کی طبیعت مجتہدانہ اور غیر معمولی طور پر متنفنانہ واقع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ تجارت کی وسعت اور ملکی تعلقات نے اُن کو معاملات کی ضرورتوں سے خبردار کر دیا تھا۔ اطراف و بلاد سے۔ ہر روز جو سیکڑوں ضروری استفتا آتے تھے اُن سے اُن کو اندازہ ہوتا تھا کہ مُلک کو اس فن کی کس قدر حاجت ہے قضاۃ اور حکّام فصلِ قضایا میں جو غلطیاں کرتے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ غرض یہ اسباب اور وجوہ تھے جنہوں نے اُن کو اس فن کی تدوین و ترتیب پر آمادہ کیا۔ ممکن ہے کہ کسی خاص واقعہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اس آمادگی کو اور تحریک ہوئی جس کے ساتھ عملی کوشش کا ظہور ہوا۔

امام صاحب نے جس طریقہ سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا وہ نہایت وسیع اور پرُ خطر کام تھا۔ اسلئے اُنہوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا۔ اس غرض سے اُنہوں نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور شخص۔ انتخاب کئے جن میں سے اکثر خاص خاص۔ فنوں میں جو تکمیل فقہ کے لئے ضروری تھے اُستاد زمانہ تسلیم کئے جاتے تھے مثلاً یحییٰ بن ابی زائدہ۔ حفص بن غیاث۔ قاضی ابو یوسف۔ داؤد الطائی۔ حبان۔ مندل۔ حدیث و آثار میں نہایت کمال رکھتے تھے۔ امام زفر۔ قوت استنباط میں مشہور تھے۔ قاسم بن معن اور امام محمد۔ کو ادب اور عربیت میں کمال تھا۔ امام صاحب۔ نے ان لوگوں کی شرکت سے

جو فقہ وین میں تھے

ایک مجلس مرتب کی۔ اور باقاعدہ طور سے فقہ کی تدوین شروع ہوئی امام طحاوی۔ نے بسندِ متصل اسد بن فرات۔ سے روائیت کی ہے کہ ابو حنیفہؒ کے تلامذہ جنہوں نے فقہ کی تدوین کی چالیس تھے۔ جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے۔ ابو یوسف۔ زفر۔ داؤد الطائی۔ اسد بن عمر۔ یوسف بن خالد التیمی۔ یحییٰ بن ابی زایدۃ" امام طحاوی نے یہ بھی روائیت کی ہے کہ لکھنے کی خدمت یحییٰ سے متعلق تھی۔ اور وہ تیس برس تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں کم و بیش تیس برس کا زمانہ صرف ہوا یعنی ۱۲۱ھ ہجری سے ۱۵۰ھ ہجری تک جو امام ابو حنیفہؒ کی وفات کا سال ہے لیکن یہ غلط ہے کہ یحییٰ۔ شروع سے اس کام میں شریک تھے۔ یحییٰ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اسلئے وہ شروع سے کیونکر شریک ہو سکتے تھے۔ طحاوی۔ نے جن لوگوں کے نام گنائے ہیں اُن کے سوا۔ عافیہ ازدی۔ ابو علی غزی۔ علی مسہر۔ قاسم بن معن۔ حبان۔ مندل۔ بھی اس مجلس کے ممبر رہے تھے۔

طریقہ تدوین

تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص باب کا کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا۔ اگر اُس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اُسی وقت قلمبند کر لیا جاتا۔ ورنہ نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں۔ کبھی کبھی بہت دیر تک بحث قائم رہتی۔ امام صاحب غور اور تحمل کے ساتھ سب تقریریں سُنتے اور بالآخر ایسا جنچا تُلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام صاحب کے فیصلہ کے بعد بھی لوگ اپنی اپنی رایوں پر قائم رہتے۔ اُسوقت وہ سب مختلف اقوال قلمبند کر لئے جاتے۔ اِس کا التزام تھا کہ جب تک تمام شرکائے جلسہ جمع نہ ہو لیں۔ کسی مسئلہ کو طے نہ کیا جائے۔

جواہر مضیئہ۔ کے مصنف۔ نے عافیہ بن یزید۔ کے تذکرہ میں اسحق۔ سے روائیت کی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے اصحاب کسی مسئلہ میں بحث کرتے ہوتے۔ اور عافیہ۔ موجود نہ ہوتے۔ تو امام صاحب فرماتے۔ کہ عافیہ۔ کو آلینے دو۔ جب وہ آلیتے اور اتفاق کرتے تب وہ مسئلہ درج تحریر کیا جاتا۔ اس طرح تیس برس کی مدت میں یہ عظیم الشان کام انجام کو پہونچا امام صاحب کی اخیر عمر قیدخانہ میں گذری وہاں بھی یہ کام برابر جاری رہا۔

اِس مجموعہ کی ترتیب جیسا کہ۔ حافظ ابو المحاسن۔ نے بیان کی ہے یہ تھی اوّل باب الطہارۃ

باب الصلوٰۃ۔ باب الصوم۔ پھر عبادات کے اور ابواب۔ اس کے بعد معاملات۔ سب سے اخیر میں باب المیراث۔

اس مجموعہ کا رواج

امام صاحب کی زندگی ہی میں اس مجموعہ نے وہ حسن قبول حاصل کیا کہ اسوقت کے حالات کے لحاظ سے مشکل سے قیاس میں آسکتا ہے۔ جسقدر اُس کے اجزا طیار ہوتے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ۔ تمام ملک میں اُس کی اشاعت ہوتی جاتی تھی۔ امام صاحب کا درسگاہ ایک قانونی مدرسہ تھا۔ جس کے طلبا نہایت کثرت سے ملکی عہدوں پر مامور ہوئے۔ اور اُن کی آئین حکومت کا یہی مجموعہ تھا۔ تعجب یہ ہے کہ جن لوگوں کو امام صاحب سے ہمسری کا دعوے تھا وہ بھی اس کتاب سے بے نیاز نہ تھے۔ امام سفیان ثوری نے بڑے لطائف الحیل سے کتاب الرہن کی نقل حاصل کی اور اُس کو اکثر پیش نظر رکھتے تھے۔ زایدہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن سفیان کے سرہانے ایک کتاب دیکھی جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے اُن سے اجازت مانگ کر میں اُس کو دیکھنے لگا تو۔ ابوحنیفہ کی کتاب الرہن نکلی میں نے تعجب سے پوچھا کہ "آپ ابوحنیفہ کی کتابیں دیکھتے ہیں" بولے "کاش۔ اُن کی سب کتابیں میرے پاس ہوتیں[1]"

یہ بھی کچھ کم تعجب کی بات نہیں کہ باوجودیکہ اُسوقت بڑے بڑے مدعیان فن موجود تھے اور اُن میں بعض امام ابوحنیفہ سے مخالفت بھی رکھتے تھے۔ تاہم کسی کو اس کتاب کی ردو قدح کی جرأت نہیں ہوئی۔ امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں "ان اصحاب الرای اظہروا مذاہبھم وکانت الدنیا مملوۃ من المحدثین ورواۃ الاخبار فلم یقدر احد منھم الطعن فی اقاویل اصحاب الرای۔ یعنے اصحاب الرائے (ابوحنیفہ اور انکے تلامذہ) نے اپنے مسائل جس زمانہ میں ظاہر کئے۔ دنیا محدثین اور راویان اخبار سے بھری ہوئی تھی تاہم کسی کو یہ قدرت نہ ہوئی کہ اُن کے اقوال پر اعتراض کرتا۔" امام رازی نے تو عام نفی کی ہے لیکن ہم کو زیادہ استقصاء سے معلوم ہوا کہ اس عموم میں ایک استثنا ہے۔ کیونکہ بیہقی نے تصریح کی ہے کہ امام اوزاعی نے ابوحنیفہ کی کتاب السیر کا رد لکھا تھا جس کا جواب قاضی ابویوسف نے لکھا۔

غالباً یہ مجموعہ بہت بڑا مجموعہ تھا اور ہزاروں مسائل پر مشتمل تھا۔ قلاید عقود العقیان کے مصنف نے

کتاب الصیانتہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "امام ابوحنیفہؒ نے جسقدر مسایل مدون کیئے انکی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زیادہ ہے" شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ "یہ مسایل چھ لاکھ تھے" یہ خاص تعداد شاید صحیح نہ ہو لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اُن کی تعداد لاکھوں سے کم نہ تھی۔ امام محمدؒ کی جو کتابیں آج موجود ہیں اُن سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

اگرچہ اس میں کسی طرح شبہ نہیں ہو سکتا کہ۔ امام ابوحنیفہؒ کی زندگی ہی میں فقہ کے تمام ابواب مراتب ہو گئے تھے۔ رجال و تاریخ کی کتابوں میں اس کا ثبوت ملتا ہے جس کا انکار گویا تواتر کا انکار ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ مجموعہ ایک مدت سے ضائع ہو گیا ہے۔ اور دُنیا کے کسی کتب خانہ میں اُس کا پتہ نہیں چلتا۔ امام رازی۔ مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں کہ "ابوحنیفہؒ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی" امام رازی نے ۶۰۶ھ میں انتقال کیا۔ اس لحاظ سے کم از کم چھ سو برس ہوئے کہ امام صاحبؒ کی تصنیفات ناپید ہو چکیں۔ امام صاحب کی تصنیفات کا ضائع ہو جانا اگرچہ کچھ محل تعجب نہیں۔ اُس عہد کی ہزاروں کتابوں میں سے آج ایک کا بھی وجود نہیں۔ امام اوزاعی۔ ابن جریج۔ ابن عروبہ۔ حماد بن ابی معمر ان کی تالیفات عین اُسی زمانہ میں شائع ہوئیں۔ جب امام ابوحنیفہؒ کا دفتر فقہ مرتب ہو رہا تھا تاہم اِن کتابوں کا نام بھی کوئی نہیں جانتا لیکن امام ابوحنیفہؒ کی تصنیفات کی گم شدگی میں ایک خاص وجہ ہے۔ امام صاحبؒ کا مجموعہ فقہ اگرچہ بجائے خود مرتب اور خوش اسلوب تھا لیکن قاضی ابویوسفؒ و امام محمدؒ نے انہیں مسایل کو اس توضیح و تفصیل سے لکھا۔ اور ہر مسئلہ پر استدلال و برہان کے ایسے حاشیئے اضافہ کیئے کہ انہیں کو رواج عام ہو گیا اور اصل ماخذ سے لوگ بے پروا ہو گئے۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح کہ متاخرین نحویوں کی تصنیفات کے بعد۔ فراء کسائی۔ خلیل۔ اخفش۔ ابوعبیدہ۔ کی کتابیں دُنیا سے بالکل ناپید ہو گئیں۔ حالانکہ یہ لوگ فن نحو کے بانی اور مدون اوّل تھے۔

امام صاحب کے زمانہ میں جو مجموعۂ فقہ مرتب ہوا تھا وہ معدوم ہو گیا۔

امام صاحبؒ کے مسایل کا آج جو ذخیرہ دُنیا میں موجود ہے وہ امام محمدؒ۔ اور قاضی ابویوسفؒ کی تالیفات ہیں جن کے نام اور مختصر حالات اِن بزرگوں کے ترجمہ میں ہم لکھیں گے۔ یہ فقہ۔ اگرچہ عام طور سے فقہ حنفی کہلاتی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ چار شخصوں یعنی امام

ابوحنیفہؒ۔ زفر۔ قاضی ابو یوسف۔ امام محمد۔ کی رائیوں کا مجموعہ ہے۔ قاضی ابو یوسف وامام محمد۔ نے بہت سے مسائیل ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ۔ کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ فقہاء حنفیہؒ نے روائتیں نقل کی ہیں کہ اِن صاحبوں کو اعتراف تھا کہ "ہمنے جو اقوال۔ امام ابوحنیفہؒ کے مخالف کہے وہ بھی امام ابوحنیفہؒ ہی کے اقوال ہیں۔ کیونکہ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہؒ نے متعدد اور مختلف رائیں ظاہر کی تھیں" یہ روائتیں۔ شامی۔ وغیرہ میں مذکور ہیں لیکن اُن کا ثابت ہونا مشکل ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اُن فقہا کا حُسن ظن ہے۔ قاضی ابو یوسف وامام محمد اجتہاد مطلق کا منصب رکھتے تھے اور اُن کو اختلاف کا پورا حق حاصل تھا۔ اسلام کی ترقیاں اُسی وقت تک رہیں کہ لوگ باوجود حُسن عقیدت کے بزرگوں اور اُستادوں کی رائے سے علانیہ مخالفت کرتے تھے۔ اور خیالات کی ترقی محدود نہ تھی۔

یہ مسائیل جو فقہ حنفی کے نام سے موسوم ہیں نہائیت تیزی سے تمام مُلک میں پھیل گئے عرب میں تو اُن کے مسائل کو چنداں رواج نہ ہُوا۔ کیونکہ مدینہ۔ میں امام مالک۔ اور مکہ۔ میں اور ائیمہ اُنکے حریف مقابل موجود تھے لیکن عرب۔ کے سوا تمام ممالک اسلامی میں جن کی وسعت سندھ سے ایشیائے کوچک تک تھی عموماً اُنہیں کا طریقہ جاری ہوگیا۔ ہندوستان۔ سندھ۔ کابل بخارا۔ وغیرہ میں تو اُن کے اجتہاد کے سوا کسی کا اجتہاد تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ دوسرے ممالک میں گو۔ شافعی۔ و حنبلی فقہ کا رواج ہُوا لیکن فقہ حنفی۔ کو دبا نہیں سکا البتہ بعض مُلکوں میں وہ بالکل معدوم ہوگیا۔ اور اُس کے خاص اسباب تھے مثلاً افریقہ۔ میں ۴۰۰ھ تک امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ۔ تمام اور طریقوں پر غالب تھا۔ لیکن معز بن بادیس۔ نے ۴۰۶ھ میں جب وہاں کی مستقل حکومت حاصل کی۔ تو حکومت کے زور سے تمام مُلک میں مالکی فقہ کو رواج دیدیا کہ آجتک قائم ہے[1]۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ عنانِ حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی وہ اکثر حنفی ہی فقہ کے پابند تھے۔ خلفائے عباسیہ۔ تو اس بحث سے خارج ہیں۔ کیونکہ یہ خاندان جب تک اوج پر رہا۔ یہ لوگ تلوار۔ کے ساتھ قلم کے بھی مالک رہے یعنی اُن کو خود دعوی اجتہاد تھا۔ اور کبھی کسی کی تقلید نہیں کی تنزل کے بعد وہ اِس قابل ہی نہیں رہے کہ اُن کے حالات

[1] تاریخ ابن خلکان ترجمہ معز بن بادیس [illegible]

سلاطین اکثر حنفی تھے

سے کسی مُلکی اثر کا اندازہ کیا جائے۔ تاہم اُن میں اگر کسی نے تقلید گوارا کی تو ابو حنیفہؒ ہی کی کی۔ عبداللہ بن المعتز جو فن بدیع۔ کا موجد تھا اور خلفائے عباسیہ میں سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا حنفی المذہب۔ تھا[۱]۔

عباسیہ۔ کے تنزل کے ساتھ جن خاندان کو عروج ہُوا اکثر حنفی تھے۔ خاندان سلجوق جس نے ایک وسیع مدت تک حکومت کی اور جن کے دائرہ حکومت کی وسعت طول میں کاشغر سے بیت المقدس تک اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک پہنچی تھی۔ حنفی تھا محمود غزنوی جس کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ فقہ حنفی۔ کا بہت بڑا عالم تھا فن فقہ میں اُس کی ایک نہائیت عُمدہ تصنیف موجود ہے جس کا نام۔ التفرید۔ ہے اور جس میں کم و بیش ساٹھ ہزار مسئلے ہیں۔ نور الدین زنگی۔ کا نام چُھپا ہُوا نہیں ہے۔ وہ ہمارے ہیروز میں داخل ہے بیت المقدس کی لڑائیوں میں اوّل اُسی نے نام حاصل کیا۔ صلاح الدین۔ فاتح بیت المقدس اُسی کے دربار کا ملازم تھا۔ دُنیا میں پہلا دار الحدیث اُسی نے قائم کیا اگرچہ وہ شافعی۔ و مالکی۔ فقہ کی بھی عزت کرتا تھا۔ لیکن وہ خود اور اُس کا تمام خاندان مذہباً حنفی تھا[۲]۔ صلاح الدین۔ خود شافعی تھا لیکن اُس کے خاندان میں بھی حنفی المذہب موجود تھے الملک المعظم عیسےٰ بن الملک العادل جو ایک وسیع مُلک کا بادشاہ تھا۔ علّامہ بن خلکان اُس کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "وہ نہائیت عالی ہمت۔ فاضل۔ ہوشمند۔ دلیر۔ پُر رعب تھا اور حنفی مذہب۔ میں غلو رکھتا تھا۔ جراکسہ مصر جو نویں صدی کے آغاز میں مصر کی حکومت پر پہنچے۔ اور ۲۰۰ برس تک فرمانروا رہے اور بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ خود حنفی تھے اور اُن کے دربار میں اِسی مذہب کو زیادہ فروغ تھا۔ سلاطین ترک جو کم و بیش چھ سو برس سے روم۔ کے فرمانروا ہیں اور آج اُنہیں کی سلطنت۔ اسلام کی عزت و وقار کی اُمید گاہ ہے عموماً حنفی تھے۔ خود ہمارے ہندوستان کے فرمانروا خوانین اور آلِ تیمور اِسی مذہب کے پابند رہے اور اُن کی وسیع سلطنت میں اِس طریقہ کے سوا اور کسی طریقہ کو رواج نہ ہو سکا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ حنفی۔ مذہب کو جو قبول عام حاصل ہُوا وہ حکومت کے مدد سے ہُوا۔ ابن حزم۔ جو ارباب ظاہر کے مشہور امام ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ "دو مذہبوں نے سلطنت کے

[۱] تاریخ ابن خلکان ترجمہ عبداللہ بن المعتز ۱۲ [۲] الجواہر المضیئہ ترجمہ نور الدین زنگی ۱۲

زور سے ابتداہی میں رواج عام حاصل کیا۔ ایک ابو حنیفہؒ کا مذہب کیونکہ جب قاضی ابو یوسف کو قاضی القضاۃ۔ کا منصب ملا تو انہوں نے حنفی لوگوں کو عہدہ قضا پر مقرر کیا دوسرا امام مالک کا مذہب۔ اندلس میں۔ کیونکہ امام مالک کے شاگرد یحییٰ اصمودی خلیفہ اندلس کے نہایت مقرب تھے اور کوئی شخص بے اُن کے مشورہ کے عہدۂ قضا پر مقرر نہیں ہو سکتا تھا وہ صرف اپنے ہم مذہبوں کو مقرر کراتے تھے؎

حنفی فقہ کی حسن قبول کا سبب

لیکن یہ ابن حزم۔ کی ظاہر بینی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے ۱۲۰ھ میں مسند اجتہاد پر بیٹھے قاضی ابو یوسف۔ نے ۱۷۰ھ کے بعد قاضی القضاۃ۔ کا منصب حاصل کیا۔ کیونکہ اُن کے تقرر اور عروج کا زمانہ ہارون الرشید کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ جو ۱۷۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ قاضی ابو یوسف۔ کے فروغ سے پہلے پچاس برس کا زمانہ گذر چکا تھا جس میں امام ابو حنیفہ کے مذہب نے قبول عام حاصل کر لیا تھا۔ اور اُن کے سیکڑوں شاگرد قضاء کے عہدوں پر مامور ہو چکے تھے۔ اِس کامیابی کو کس کی طرف منسوب کیا جائے؟ یہ ضرور ہے کہ قاضی ابو یوسف کی وجہ سے امام صاحب کے مسائل کو اور زیادہ عروج ہوا لیکن مذہب حنفی کا اصلی عروج۔ قاضی صاحب کی کوششوں کا محتاج نہ تھا۔ امام رازی نے باوجود مخالفت کے تسلیم کیا ہے۔ کہ ثم انہ لما قوی مذھب اصحاب الرای واشتھر وعظم وقعتہ فی القلوب ثم اتفق اتصال ابی یوسف ومحمد بخدمۃ ھارون الرشید عظمت تلک القوۃ جداً لان العلم والسلطنۃ حصلا معاً یعنے اصحاب الرائے کا مذہب قوی ہو گیا اور شہرت پکڑ گیا اور اُس کی وقعت دلوں میں بہت ہو گئی پھر اس کے بعد ابو یوسف و محمد کو ہارون الرشید کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی تو یہ قوت بہت ہی زیادہ بڑھ گئی کیونکہ علم اور حکومت دونوں مجتمع ہو گئے؎

اِس کے علاوہ قاضی ابو یوسف کا اثر ہارون الرشید کے زمانہ تک محدود تھا۔ دیرپا اور غیر منقطع کامیابی کس نے پیدا کی؟ یُوں تو بعض اور ائمہ نے بھی اپنے عہد میں نہایت عروج حاصل کیا تھا۔ امام اوزاعی اپنی زندگی میں بلکہ زمانہ مابعد تک بھی تمام شام۔ کے امام مطلق تسلیم کئے گئے اور اُن ممالک میں لوگ عموماً اُنہیں کی تقلید کرتے تھے لیکن وہ ایک محدود اثر تھا جو بہت جلد جاتا رہا۔ ان واقعات سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے مذہب میں ایسی

؎ ابن حزم کے اِس قول کو علامہ ابن خلکان نے یحییٰ صمودی کے ترجمہ میں نقل کیا ہے ۱۲

خاص خوبیاں ہیں جو اور مذہبوں میں نہیں۔

اور مجتہدین کے رواج مذہب کے اسباب

تمام ممالک اسلامی میں جن ائمہ کی فقہوں نے رواج پایا وہ صرف چار ہیں۔ ابوحنیفہؒ۔ مالک۔ شافعی۔ احمد حنبل۔ مسائل فقہ کی ترویج و اشاعت کا سبب۔ اگرچہ خود اُن مسائل کی خوبی و عمدگی ہے لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس امر میں واضع فقہ کے ذاتی رسوخ۔ اور عظمت کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ ہمارے نزدیک۔ امام ابوحنیفہؒ کے سوا۔ اور مجتہدین فقہ کی ترویج و اشاعت کا باعث زیادہ تر اُن کی ذاتی خصوصیتیں تھیں مثلاً امام مالک۔ مدینہ کے رہنے والے تھے جو نبوت کا مرکز۔ اور خلفائے راشدین کا دار الخلافہ رہ چکا تھا۔ اس تعلق سے لوگوں کو عموماً مدینہ اور ارباب مدینہ کے ساتھ خلوص و عقیدت تھی۔ اُن کا خاندان ایک علمی خاندان تھا۔ اُنکے دادا۔ مالک بن ابی عامر۔ نے بڑے بڑے صحابہ سے حدیثیں سیکھی تھیں۔ اُن کے چچا شیخ الحدیث تھے۔ امام مالک۔ نے جب حدیث و فقہ میں کمال پیدا کیا تو یہ عارضی اوصاف اُن کی ذاتی قابلیت پر طرہ بن کر نمایاں ہوئے۔ اور تمام اطراف و دیار میں اُن کی شہرت کا سکہ جم گیا امام شافعی۔ کو اور بھی زیادہ خصوصیتیں حاصل تھیں۔ مکہ معظمہ وطن تھا۔ باپ کی طرف سے قریشی اور مطلبی اور ماں کی طرف سے۔ ہاشمی تھے۔ اُن کا تمام خاندان ہمیشہ سے معزز و ممتاز چلا آتا تھا۔ اُن کے پردادا۔ سائب۔ جنگ بدر میں ہاشمیوں کے علم بردار تھے اور گرفتار ہو کر اسلام لائے تھے۔ مکہ معظمہ کی ولادت۔ خاندان کا اعزاز۔ رسول اللہ کی ہم نسبی۔ ایسی چیزیں تھیں جن سے بڑھ کر حسن قبول اور مرجعیت کے لئے کوئی کارگر آلہ نہیں ہو سکتا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ میں اس قسم کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ قریشی اور ہاشمی۔ ہونا تو ایک طرف وہ عربی النسل بھی نہ تھے۔ خاندان میں کوئی شخص ایسا نہیں گذرا تھا جو اسلامی گروہ کا مرجع اور مقتدا ہوتا۔ آبائی پیشہ تجارت تھا اور خود بھی تمام عمر اسی ذریعہ سے زندگی بسر کی کوفہ جو اُن کا مقام ولادت تھا گو دار العلم تھا لیکن مکہ معظمہ۔ اور مدینہ منورہ۔ کا ہمسر کیونکر ہو سکتا تھا۔ بعض اتفاقی اور ناگزیر اسباب سے ارباب روایت کا ایک گروہ اُن کی مخالفت پر کمربستہ تھا۔ غرض حسن قبول اور عام اثر کے لئے جو اسباب درکار ہیں وہ بالکل نہ تھے۔ باوجود اس کے اُن کی فقہ۔ کا تمام ممالک اسلامیہ میں اس وسعت اور ترقی کے ساتھ رواج پانا یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ اُن کا طریقۂ

فقہ انسانی ضرورتوں کے نہایت مناسب اور موزوں واقع ہوا تھا۔ اور بالخصوص تمدن کے ساتھ جسقدر اُن کی فقہ کو مناسبت تھی کسی کی فقہ کو نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اور ائمہ کے مذہب کو زیادہ تر انہیں ملکوں میں رواج ہوا جہاں تہذیب وتمدن نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ علامہ ابن خلدون۔ اِس بات کی وجہ بتاتے ہیں کہ مغرب واندلس میں امام مالک۔ کا مذہب کیوں زیادہ رائج ہوا۔؟ وہ لکھتے ہیں کہ "مغرب واندلس میں بدویت غالب تھی۔ اور وہاں کے لوگوں نے وہ ترقی نہیں حاصل کی تھی۔ جو اہل عراق نے کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں امام مالک۔ کی فقہ کے سوا اور کسی فقہ کو فروغ نہ ہو سکا"

حنفی فقہ جس میں امام ابوحنیفہؒ کے علاوہ اُن کے نامور شاگردوں کے مسائل بھی شامل ہیں اُس زمانہ کا بہت بڑا قانون بلکہ بہت بڑا مجموعہ قوانین تھا۔ زمانۂ بعد میں۔ گو علمائے حنفیہ نے اُس پر بہت کچھ اضافہ کیا۔ اور جزئیات کی تفریع کے ساتھ اصول فن کو نہایت ترقی دی۔ لیکن ایجاد کے زمانہ میں جسقدر کسی فن کی حالت ہو سکتی ہے۔ وہ اِس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ جو امام ابوحنیفہؒ کے عہد میں فقہ کو حاصل ہو چکی تھی۔ اِس مجموعہ میں عبادات کے علاوہ دیوانی۔ فوجداری۔ تعزیرات۔ لگان۔ مالگزاری۔ شہادت۔ معاہدہ۔ وراثت۔ وصیت۔ اور بہت سے قوانین شامل تھے۔ اُس کی وسعت اور خوبی کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ ہارون الرشید اعظم۔ کی وسیع سلطنت جو سندھ۔ سے ایشیائے کوچک۔ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اِنہیں اصول پر قائم تھی۔ اور اُس عہد کے تمام واقعات ومعاملات اِنہیں قواعد کی بنا پر فیصل ہوتے تھے۔

مسائل فقہ کی تقسیم

یہ قانون جس کو فقہ کہتے ہیں دو قسم کے مسائل پر مشتمل ہے اور اس لحاظ سے اُسکے واضع کی دو مختلف حیثیتیں ہیں۔

(۱) وہ مسائل جو شریعت سے ماخوذ ہیں۔ اور تشریعی احکام کہے جا سکتے ہیں۔

(۲) وہ احکام جن سے شریعت نے سکوت کیا ہے اور جو تمدن اور معاشرت کی ضرورتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یا جن کا ذکر شریعت میں ہے لیکن تشریعی طور پر نہیں۔

پہلی قسم کے مسائل کے لحاظ سے فقیہ کی حیثیت۔ شارح اور مفسر کی حیثیت ہے۔ اور اس اعتبار سے اُس کے لئے جس قسم کی قابلیت درکار ہے وہ مہارت زبان۔ واقفیت نصوص قوت

استنباط۔ توفیق متعارضات۔ ترجیح دلائل ہے۔ دوسری قسم کے احکام کے لحاظ سے واضع فقہ ایک مقنن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس لحاظ سے اُس کی قابلیت اُس رتبہ کی ہونی چاہیئے جیسی کہ دنیا کے اور مشہور مقننوں کی تھی۔ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ اسلام میں بہت سے نامور گذرے ہیں جو قرآن و حدیث کے عمدہ مفسر یا شارح تھے لیکن مقننانہ قابلیت سے معرّا تھے۔ اِسی طرح ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جو مقنن اور واضع قانون تھے لیکن نصوص شرعی کے مفسر نہیں کہے جا سکتے تھے۔ جہاں تک ہماری واقفیت ہے اسلام کے اِس وسیع دور میں قدرت نے یہ دونوں قابلیتیں جس اعلیٰ درجہ پر۔ امام ابو حنیفہؒ میں جمع کر دی تھیں۔ کسی مجتہد یا امام میں مجتمع نہیں ہوئیں۔

تشریعی اور غیر تشریعی احادیث کا فرق۔

علم فقہ کے متعلق سب سے بڑا کام جو امام صاحب نے کیا وہ تشریعی اور غیر تشریعی احکام میں امتیاز قائم کرنا تھا۔

شارع علیہ السّلام کے اقوال و افعال جو سلسلۂ روائیت سے منضبط کئے گئے اُن میں بہت سے ایسے امور تھے جن کو منصب رسالت سے کچھ تعلق نہ تھا۔ لیکن بطور ایک اصطلاح کے اُن سب پر حدیث کا لفظ اطلاق کیا جاتا تھا۔ فقہ کی توضیح میں ایک عام اور سخت غلطی یہ ہوئی کہ لوگوں نے ان تمام امور کو شرعی حیثیت پر محمول کیا اور اِس خیال سے اُن پر مسائل اور احکام کی بنیاد قائم کی۔ حالانکہ وہ حدیثیں منصب شریعت سے علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں[1] کہ آنحضرتؐ سے جو کچھ روائیت کیا گیا ہے اور کتب احادیث میں اُس کی تدوین ہوئی اُس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) جو تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے اور اسی بارہ میں یہ آیت اُتری ہے۔ مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ یعنی پیغمبر جو چیز تم کو دے اُس کو اختیار کرو اور جس چیز سے روکے اُس سے باز آؤ۔"

(۲) جو تبلیغ رسالت سے متعلق نہیں چنانچہ اُن کی نسبت آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِينِكُمْ فَخُذُوهُ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَايِي فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ۔ یعنی "میں ایک آدمی ہوں جب میں کوئی مذہبی حکم دوں تو تم لوگ اُس کے پابند ہو اور

[1] حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ دہلی صفحہ ۱۳۳ و ۱۳۴ و ۱۳۵۔

جب میں اپنی رائے سے کسی بات کا حکم دوں تو میں صرف ایک آدمی ہوں" اِس دوسری قسم میں وہ حدیثیں ہیں جو آنحضرتؐ نے طب کے متعلق ارشاد کیں۔ اور اِسی قسم میں وہ افعال داخل ہیں جو آنحضرتؐ سے علاوۃً صادر ہوئے نہ عبادۃً۔ اور اتفاقاً واقع ہوئے نہ قصداً اور اِسی قسم میں وہ حدیثیں داخل ہیں جو آنحضرتؐ نے اپنی قوم کے گمان کے موافق بیان کیں مثلاً ام زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث۔ اور اِسی قسم میں وہ امور داخل ہیں جو آنحضرتؐ نے اُسوقت مصلحت جزوی کے موافق اختیار فرمائے اور وہ سب لوگوں پر واجب العمل نہیں ہیں مثلاً فوج کی طیاری اور شعار کی تعیین۔ اِسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ "اب رمل کرنے کی کیا ضرورت ہے جس قوم کے دکھانے کے لئے ہم رمل کرتے تھے اُن کو خدا نے ہلاک کر دیا" اور آنحضرتؐ کے بہت سے احکام اِسی قسم میں داخل ہیں۔ مثلاً یہ حکم کہ جہاد میں جو شخص کسی کافر کو قتل کرے تو اُس کے ہتیار کا مالک بھی وہی ہوگا"۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کی قسموں میں جو دقیق فرق بیان کیا۔ یہ وہی نکتہ ہے جسکی طرف سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ کا ذہن منتقل ہوا۔ اِسی بنا پر بہت سے مسایل۔ مثلاً غسل جمعہ خروج النساء الے العیدین۔ نفاذ طلاق۔ تعین جزیہ تشخیص خراج تقسیم غنایم وغیرہ میں جو حدیثیں وارد ہیں اُن کو امام ابوحنیفہؒ نے دوسری قسم میں داخل کیا ہے۔ لیکن امام شافعی وغیرہ ان حدیثوں کو بھی تشریعی حدیثیں سمجھتے ہیں۔

حنفی فقہ کو مقابلہ اور فقہوں کے بہت بڑی خصوصیت جو حاصل ہے وہ یہی ہے کہ اُسکے مسایل عموماً اِسی قاعدہ پر مبنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُس میں وہ وسعت اور آزادی پائی جاتی ہے جو اور آئمہ کے مسایل میں نہیں پائی جاتی۔ یہ قاعدہ اگرچہ نہایت صاف اور صریح ہے لیکن افسوس ہے کہ اور آئمہ نے اُس پر لحاظ نہیں کیا۔ اور اگر خلفائے راشدین کی نظیریں موجود نہ ہوتیں تو شاید امام ابوحنیفہؒ کو بھی اُس کے اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اگرچہ امام صاحب کے بعد بھی بعض ایمہ نے جن کو اُن کے مقابلہ میں اجتہاد کا دعویٰ تھا اس عمدہ اصول کی پیروی نہ کی اور اُسی غلط خیال پر قایم رہے لیکن اس میں کون شبہ کر سکتا ہے کہ امام صاحب کی رائے نہایت صحیح اور نہایت دقیقہ سنجی پر مبنی تھی۔

جو مسائل تشریعی مسائل نہیں ہیں

خلفائے راشدین سے بڑھکر کون احکام شریعت کا نکتہ شناس ہو سکتا ہے اُنھوں نے کیا کیا۔ ؟ حضرت عمرؓ کے آغاز خلافت تک اُمہات اولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد ہو چکی ہو عموماً خریدی اور بیچی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس رواج کو بالکل روک دیا۔ آنحضرتؐ نے تبوک کے سفر میں غیر مذہب والوں پر جو جزیہ مقرر کیا وہ فی کس ایک دینار تھا حضرت عمرؓ نے ایران میں ۴۸ و ۲۴ و ۱۲ کے حساب سے شرحیں مقرر کیں۔ آنحضرتؐ۔ مال غنیمت جب تقسیم کرتے تھے تو اپنے عزیز و اقارب کا بھی حصہ لگاتے تھے۔ خلفائے راشدین میں سے کسی نے حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے بھی ہاشمیوں کو کبھی حصہ نہیں دیا۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں بلکہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد تک تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ۔ نے اپنے زمان خلافت میں منادی کرادی کہ تین طلاق طلاق بائن سمجھی جائیگی آنحضرتؐ کے عہد میں شراب پینے کی سزا میں کوئی خاص حد نہیں مقرر ہوئی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اُس کی حد چالیس درّے قرار دئے۔ اور حضرت عمرؓ نے بسبب اس کے کہ اُن کے زمانہ میں مے نوشی کا زیادہ رواج ہو چلا تھا۔ چالیس سے اسّی درّے کر دئے۔ یہ وہ واقعات ہیں جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اور جن کے ثبوت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خلفائے راشدین کسی حکم کو آنحضرتؐ کا تشریعی حکم سمجھ کر اُس کی مخالفت کرتے تھے!! (نعوذ باللہ) اگر ایسا کرتے تھے تو وہ خلفائے راشدین نہ تھے۔ بلکہ (عیاذاً باللہ) رسول اللہؐ کے حریف اور مقابل تھے!!!

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ جو رات دن آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور فیض صحبت کی وجہ سے شریعت کے اداشناس ہو گئے تھے۔ اُن کو یہ تمیز کرنا نہایت آسان کام تھا کہ کون سے احکام تشریعی حیثیت رکھتے ہیں اور کون سے اُس حد میں داخل ہیں جن کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُورِ دُنْیَاکُمْ حضرت عائشہؓ۔ نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ایک موقع پر کہا کہ آج اگر رسول اللہؐ موجود ہوتے تو عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت نہ دیتے"۔ یہ صریح اس بات کی شہادت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہؐ کی اُس اجازت کو تشریعی اور لازمی حکم نہیں قرار دیا۔ ورنہ زمانہ اور حالات کے اختلاف سے اُس پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ نے اِس مرحلہ میں صحابہ ہی کو دلیل راہ بنایا۔ اور اِس قسم کے مسائل میں

اُن کی رائے عموماً خلفائے راشدین کے طرز عمل کے موافق ہے۔ لیکن جن لوگوں کی نگاہ اُس نکتہ تک نہیں پہنچی وہ امام ابوحنیفہؒ بلکہ صحابہ کو بھی مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ طلاق کے مسئلہ میں قاضی شوکانی نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ رسول اللہؐ کے مقابلہ میں بیچارے عمرؓ کی کیا حقیقت ہے" لیکن قاضی شوکانی یہ نہ سمجھے کہ حضرت عمرؓ۔ قاضی صاحب سے زیادہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ رسول اللہؐ کے مقابلہ میں اُن کی کوئی حقیقت نہیں۔

فقہ کی پہلی قسم کے متعلق۔ امام ابوحنیفہؒ نے جو بڑا کام کیا وہ قواعد استنباط کا انضباط تھا جس کی وجہ سے فقہ (جو ابتک جزئیات مسایل کا نام تھا) ایک مستقل فن بن گیا۔ امام ابوحنیفہ کی علمی تاریخ میں جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر اور تعجب انگیز ہے وہ اِن قواعد کی تحدید اور انضباط ہے۔ ایسے زمانہ میں جبکہ علوم نہایت ابتدائی حالت میں تھے یہاں تک کہ نقل وکتابت کا بھی رواج نہ تھا ایسے وقیق فن کی بنیاو ڈالنی درحقیقت امام ابوحنیفہؒ ہی کا کام تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ یہ قواعد جن کو اب اصول فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے سب سے پہلے امام شافعی نے مرتب کئے یہ دعویٰ اِس لحاظ سے توصحیح ہے کہ امام شافعی سے پہلے یہ مسایل مستقل طور سے حیطۂ تحریر میں نہیں آئے تھے۔ لیکن اصل فن کی بنیاد۔ امام شافعی سے بہت پہلے پڑچکی تھی۔ اور اگر تحریر کی قید اُٹھادی جائے تو امام ابوحنیفہؒ اُس کے موجد کہے جاسکتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ مسایل کا استنباط اور احکام کی تفریع۔ تابعین بلکہ صحابہ ہی کے زمانہ میں شروع ہوچکی تھی۔ لیکن استنباط اور استخراج کا جو طریقہ تھا وہ کوئی علمی صورت نہیں رکھتا تھا جس طرح عام لوگ کسی عبارت سے کسی نتیجہ کا استنباط یا کسی حکم کی تفریع صرف وجدانی مذاق کی رو سے کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اُن کا استنباط یا تفریع کس قاعدہ کلیہ کے تحت میں داخل ہے اور اس کے کیا شرائط اور قیود ہیں۔ اِسی طرح فقہی مسائل بھی استنباط کئے جاتے تھے۔ نہ علمی اصطلاحیں قائم ہوئی تھیں نہ کچھ اصول منضبط ہوئے تھے۔

بنوامیہ۔ کے اخیر دور میں کچھ کچھ علمی اصطلاحیں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ واصل بن عطاء نے جو علم کلام کا موجد تھا احکام شرعیہ کی تقسیم کی اور کہا کہ "حق کے ثبوت کے چار طریقے ہیں۔ قرآن ناطق۔ حدیث متفق علیہ۔ اجماع امت عقل وحجت (یعنی قیاس)" واصل۔ نے اور بھی چند مسائل اور

اصطلاحیں قائم کیں مثلاً یہ کہ "عموم و خصوص دو جداگانہ مفہوم ہیں"

"نسخ صرف اوامر و نواہی میں ہو سکتا ہے۔ اخبار و واقعات میں نسخ کا احتمال نہیں"

ان مسائل کے لحاظ سے اصول فقہ میں اولیت کا فخر واصل کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے[1]

لیکن یہ اُسی قسم کی اولیت ہوگی جس طرح نحو کے دو تین قاعدوں کے بیان کرنے سے کہا جاتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام فن نحو کے موجد ہیں۔ بہر حال امام ابو حنیفہ رح کے زمانہ تک جو کچھ ہُوا تھا اس سے زیادہ نہیں ہُوا تھا۔ لیکن چونکہ امام صاحب نے فقہ کو مجتہدانہ اور مستقل فن کی حیثیت سے ترتیب دینا چاہا اسلئے استنباط اور استخراج مسائل کے اصول قرار دینے پڑے۔ اگرچہ زمانہ بعد میں اصول فقہ ایک نہائیت وسیع فن بن گیا اور سیکڑوں مسائل ایسے ایجاد ہو گئے جن کا امام ابو حنیفہ رح کے زمانہ میں اثر بھی نہ تھا لیکن کچھ شبہہ نہیں کہ اس فن کے مہات مسائل جن پر فن کی بنیاد قایم ہے امام صاحب ہی کے زمانہ میں منضبط ہو چکے تھے۔ اصول اربعہ کی توضیح حدیث کے مراتب اور اُن کے احکام۔ جرح و تعدیل کے اصول۔ اجماع کے حدود و ضوابط۔ قیاس کے اقسام و شرائط۔ احکام کی انواع۔ عموم و خصوص کی تحدید۔ رفع تعارض کے قواعد۔ فہم مراد کے طرق یہ مسائل ہیں جو اصول فقہ کے ارکان ہیں۔ ان تمام مسائل کے متعلق امام صاحب نے ضروری اصول و قواعد منضبط کر دئے تھے۔

حدیث کے متعلق امام صاحب نے جو اصول قرار دیئے اُن کو ہم حدیث کی بحث میں لکھ آئے ہیں انکے علاوہ۔ اور ابواب کے متعلق۔ امام صاحب نے تمام ضروری اصول منضبط کر دیئے تھے مثلاً

مالم یثبت بالتواتر لیس بقرآن الزیادۃ نسخ لا یجوز الزیادۃ علی الکتاب بخبر الواحد حمل المطلق علی المقید زیادۃ علی النص عموم القرآن لا یتخصص بالاحاد۔ العام قطعی کالخاص الخاص ان کان متاخرا خصص العام وان کان متقدما فلا بل کان العام ناسخا للخاص وان جھل التاریخ تساقطا و یطلب دلیل اخر۔ مفھوم الصفۃ لا یحتج بہ۔ النھی لا یدل علی البطلان

امام صاحب کے یہ اقوال اُن کے شاگردوں کی تصنیفات یا اصول کی کتابوں میں جو شافعیہ حنفیہ وغیرہ نے لکھے ہیں جستہ جستہ مذکور ہیں جن کو اگر یکجا جمع کر دیا جائے تو ایک مختصر رسالہ طیار

---

[1] ان مسائل کو ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوایل میں واصل بن عطاء کی طرف منسوب کیا ہے ۱۲

ہو سکتا ہے۔ یہی اصول ہیں جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ ایک خاص طریقہ اجتہاد کے بانی ہیں۔ انہیں اصول کے اتحاد کی بنا پر۔ امام محمد و قاضی ابو یوسف کا طریقہ۔ امام صاحب کے طریقہ سے الگ نہیں سمجھا جاتا حالانکہ جزئیات مسائل میں ان لوگوں نے سیکڑوں ہزاروں جگہ اُن سے اختلاف کیا ہے۔

ان اصولی مسائل پر بوجہ اس کے کہ امام شافعی وغیرہ نے اُن سے مخالفت کی ہے نہایت وسیع اور دقیق بحثیں قائم ہو گئیں ہیں۔ افسوس ہے کہ ہماری مختصر تالیف میں اُنکی گنجائش نہیں۔ اصول کی کتابوں میں یہ مباحث نہایت تفصیل سے مذکور ہیں جس شخص کا جی چاہے اُن کتابوں کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں فقہ کے اس حصہ میں امام صاحب کی حیثیت ایک مفسر اور مستنبط کی حیثیت ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ اس باب میں امام صاحب نے جو کام کیا وہ نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ کل دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ دنیا میں اور بھی قومیں ہیں جن کے پاس آسمانی کتابیں ہیں۔ اور وہ لوگ اُن کتابوں سے اخذ احکام کرتے ہیں۔ لیکن کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اُس نے استنباطِ مسائل کے اصول اور قواعد منضبط کیے اور اُس کو ایک مستقل فن کے رُتبہ تک پہنچا دیا۔

فقہ کا دوسرا حصہ

فقہ کا دوسرا حصہ جو صرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے حصہ کی نسبت بہت زیادہ وسیع ہے اور یہ وہ خاص حصہ ہے جس میں امام ابوحنیفہؒ علانیہ تمام مجتہدین سے ممتاز ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اگر اسلام میں کوئی شخص واضع قانون گذرا ہے تو وہ صرف امام ابوحنیفہؒ ہیں مسلمانوں میں توضیع قانون کا کام ہمیشہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو مذہبی پیشوا تھے اور زہد و اتقا میں نہایت غلو رکھتے تھے۔ مذہبی لوگوں میں جو اوصاف نہایت قابل قدر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ دنیاوی امور سے علیحدگی۔ کم آمیزی۔ معاملات میں سختی۔ عام واقعات سے بیخبری۔ غیر مذہب والوں سے تنفر۔

لہ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اصول فقہ کی کتابوں میں جو بہت سے اصول مذکور ہیں اُن سب کی نسبت یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے اقوال ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ البالغہ میں اس پر ایک نہایت عمدہ تقریر لکھی ہے لیکن شاہ صاحب نے بعض اُن اقوال سے بھی انکار کیا ہے جو بروایت صحیحہ امام صاحب سے ثابت ہیں ۱۲

یہ تمام اوصاف وہ ہیں جو تمدن کے مخالف ہیں اور جس شخص میں یہ اوصاف اعتدال سے بڑھکر ہوں اور فطرتی ہوں وہ مشکل سے تمدن کی ضروریات کا اندازہ داں ہو سکتا ہے۔ تقدس و پاکیزہ نفسی کے لحاظ سے اِن لوگوں کی جسقدر عظمت کی جائے کم ہے لیکن دُنیا اور دُنیا والوں کا کام اُن سے نہیں چل سکتا۔ حضرت جنید بغدادی معروف کرخی شیخ شبلی۔ داؤد طائی۔ کی عظمت و شان سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ واضع قانون نہیں ہو سکتے تھے۔

مجتہدین جنہوں نے فقہ کے نام سے مُلکی اور شخصی قانون بنائے۔ اگرچہ رہبانیت کی حد سے دُور تھے۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ تمدن کی اُن تمام وسیع تعلقات پر اُن کی نگاہ پڑ سکتی تھی جن سے اُن کو عمر بھر کبھی سروکار نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے قوانین میں بعض جگہ ایسی سختی اور تنگی پائی جاتی ہے جس پر مشکل سے عمل درآمد ہو سکتا ہے۔ امام شافعی وغیرہ کا مذہب ہے کہ نکاح میں بجز ثقاۃ کے کوئی شخص گواہ نہیں ہو سکتا۔ ہمسایہ کو حق شفعہ نہیں پہنچتا۔ بیع بالمعاطاۃ جائز نہیں۔ ذمیوں کی شہادت کسی حال میں مقبول نہیں۔ ایک مسلمان سیکڑوں ذمیوں کو بے قصور قتل کر ڈالے تاہم وہ قصاص میں پکڑا نہیں جا سکتا۔ اِن مسائل سے دُنیا کا کام کیونکر چل سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اِس وصف میں اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز تھے کہ وہ مذہبی تقدس کے ساتھ دُنیاوی اغراض کے اندازہ شناس تھے۔ اور تمدن کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مرجعیت اور فصل قضایا کی وجہ سے ہزاروں پیچیدہ معاملات اُن کی نگاہ سے گذر چکے تھے۔ اُن کی مجلس افتا بہت بڑی عدالت العالیہ تھی جس نے لاکھوں مقدمات کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ملکی حیثیت رکھتی تھی اور ارکانِ سلطنت مہمات امور میں اُن سے مشورہ لیتے تھے۔ اُن کے شاگرد اور ہمنشین جن کی تعداد سیکڑوں سے زیادہ تھی عموماً وہ لوگ تھے جو منصب قضا پر مامور تھے۔ اِن باتوں کے ساتھ خود اُن کی طبیعت مقننانہ اور معاملہ سنج واقع ہوئی تھی۔ وہ ہر بات کو قانونی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اور اُس کے دقیق نکتوں تک پہنچتے تھے۔ اِس بات کا اندازہ واقعہ ذیل سے ہو سکتا ہے جس کا ذکر اکثر مورخین نے کیا ہے۔

ایک دن امام صاحب قاضی ابن ابی لیلیٰ سے ملنے گئے۔ اُسوقت اُنکے سامنے ایک مقدمہ پیش تھا۔ مدعی کا بیان تھا کہ فلاں شخص نے میری ماں کو زانیہ کہا ہے۔ اسلئے میں ازالہ

حیثیت کا دعویدار ہوں۔ قاضی صاحب نے مدعا علیہ کی طرف جو اُس موقع پر موجود تھا خطاب کیا کہ تم کیا جواب دیتے ہو۔ امام ابوحنیفہؒ نے قاضی صاحب سے کہا کہ ابھی مقدمہ قایم نہیں ہُوا۔ مدعی کا اظہار لینا چاہیئے کہ اُس کی ماں زندہ ہے یا نہیں۔ کیونکہ اُس کو بھی شریک مقدمہ ہونا چاہیئے۔ یا اگر اُس نے اِس کی معرفت مقدمہ دائر کیا ہے تو اُس کو مختارنامہ پیش کرنا چاہیئے۔ قاضی صاحب نے مدعی کا اظہار لیا۔ معلوم ہُوا کہ اس کی ماں مرچکی ہے۔ اس پر قاضی صاحب نے مقدمہ آگے چلانا چاہا امام صاحب نے کہا۔ مدعی سے پوچھنا چاہیئے کہ اِس کے بھائی بہن ہیں یا نہیں کیونکہ اگر اور دعویدار موجود ہیں تو اُن کو بھی شریک مقدمہ ہونا چاہیئے اِسی طرح۔ امام صاحب نے اور چند سوالات کئے۔ جب وہ مراتب ہوچکے تو فرمایا کہ "اب مقدمہ قائم ہُوا اور آپ مدعا علیہ کا اظہار لیجیئے۔

اِس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے جس طریقہ سے مقدمہ کی کارروائی شروع کی تھی وہ اُس حیثیت سے بڑھکر نہ تھا جس طرح عوام آپس میں فصل خصومات کیا کرتے ہیں۔ لیکن امام صاحب۔ باقاعدہ فیصلہ چاہتے تھے جس کا ضروری اصول یہ ہے کہ ایک حق سے جتنے لوگ دعوے دار ہوسکتے ہیں اُن سب کو مقدمہ میں شریک ہونا چاہیئے۔ تاکہ عدالت کو ایک ہی حق کے فیصلہ کرنے میں باربار زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔

امام صاحب نے فقہ کے اِس دوسرے حصّہ کی جس طرح تدوین کی اور جس ضبط و ربط سے اُس کی جزئیات کا استقصا کیا وہ اُس زمانہ کا نہائیت وسیع قانون تھا۔ اگرچہ اُس کی تعبیر ایک عام لفظ (فقہ) سے کی جاتی ہے لیکن درحقیقت اُس میں بہت سے قوانین شامل تھے چنانچہ آج تعلیم یافتہ دُنیا میں اِن ہی ابواب کے مسائل جو ترتیب دیئے گئے ہیں وہ جدا جدا قانون کے نام سے موسوم ہیں مثلاً قانون معاہدہ۔ قانون بیع۔ قانون لگان و مالگذاری۔ تعزیرات ضابطہ فوجداری وغیرہ وغیرہ۔

اسی بنا پر بعض یورپین مصنفوں کا خیال[۱] ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کی تدوین میں رومن لا یعنے

---

[۱] ہمنے اس خیال کو شہرت عام کی بنا پر لکھا تھا لیکن تالیف کتاب کے بعد ہم کو معلوم ہُوا کہ مسٹر شیلڈن ایموز Sheldon Amos نے جو آجکل لندن یونیورسٹی کے لا پروفیسر ہیں اپنی کتاب رومن سول لا

رومیوں کے قانون سے بہت کچھ مدد لی اور اُس کے بہت سے مسائل اپنے فقہ میں داخل کر لئے۔
اس خیال کی تائید میں یہ قرائین پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) حنفی فقہ کے بہت سے مسائل رومن لا کے مطابق ہیں۔

(۲) رومن لا تمام ممالک شام میں جاری تھا اور چونکہ مسلمانوں پر شام کی معاشرت وتمدن کا بہت کچھ اثر پڑا تھا اسلئے قیاس غالب یہ ہے کہ علمائے اسلام نے قانونی مسائل میں بھی اُن سے استفادہ کیا۔

(۳) اسقدر متعدد اور وسیع قوانین۔ جو فقہ میں شامل ہیں اُن کی توضیح بغیر اس کے نہیں ہو سکتی کہ دنیا کے اور قوانین سے مدد لی گئی ہو۔

کیا فقہ حنفی رومن لا سے ماخوذ ہے؟

اِس بحث کا اصلی تصفیہ تو جب ہو سکتا ہے کہ رومن لا اور حنفی فقہ کا نہایت دقت نظر اور استقصاء کے ساتھ مقابلہ کیا جائے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ جسقدر دونوں قانون میں تطابق ہے وہ توارد کی حد سے متجاوز ہے یا اُسی قدر ہے جتنا کہ عموماً تمام قوموں کے قوانین بہت سی باتوں میں موافق ہوا کرتے ہیں۔ میں اوّلاً تو رومن لا سے واقف نہیں۔ اور ہوتا بھی تو اتنی فرصت کہاں نصیب

بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸۔ Roman civil law میں اس دعوے کو بڑی شد و مد سے ثابت کرنا چاہا ہے اور اس پر ایک مفصل بحث کی ہے۔ یورپ کو جو برتری آج تمام قوموں اور بالخصوص مسلمانوں پر حاصل ہے اُس نے یورپین مصنفوں کے دل میں بالطبع یہ بات پیدا کر دی ہے کہ وہ مسلمانوں کے تمام گذشتہ کارناموں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھیں اور اگر کوئی کمال ایسا بدیہی اور نمایاں ہو جس سے کسی طرح انکار نہ ہو سکے تو یہ دعویٰ کریں کہ وہ مسلمانوں کی ایجاد نہیں ہے۔ بلکہ روم و یونان و مصر وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ یہی اثر ہے جسنے مسٹر شیلڈن ایموز کو اس بحث پر مجبور کیا۔ اُنہوں نے اپنے دعوے کو فقہ حنفی تک محدود نہیں رکھا بلکہ عام قانون اسلام کی نسبت اُن کا یہ دعویٰ ہے ہم اُن کے مضمون کو قریباً اُن کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے دعوے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔

وہ اپنے مضمون کو اس تمہید سے شروع کرتے ہیں[۱] مشرق میں دفعتہً ایک بالکل جدید وضع زاد قائم بالذات سلسلہ قانون کا پیدا ہو جانا جس کی نسبت دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ قرآن و حدیث پر مبنی ہے۔ ایک ایسی عجیب بات ہے کہ خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی کی نسبت جو دعویٰ کیا جاتا ہے اُس کی تاریخی بنیاد

[۱] دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۲۰۹ تا صفحہ ۲۱۵ - ۱۲

کہ تمام مسائل کا مقابلہ کر سکتا۔ اس لئے مجھ کو اعتراف کرنا چاہئے کہ اس موقع پر جو کچھ میں لکھونگا اُس کا رتبہ قیاس اور ظن سے زیادہ نہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جن لوگوں نے اس بحث کو چھیڑا ہے وہ بھی قیاس وظن ہی سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ باوجود تحقیق کے ہم کو کوئی ایسا مصنف نہیں ملا جس کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ رومن لا اور حنفی فقہ کے تمام یا اکثر مسائل کا مقابلہ کرچکا ہے۔

اس امر سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ فقہ حنفی میں ایسے مسائل موجود ہیں جو عرب اور عراق میں۔ اسلام سے پہلے معمول تھے۔ لیکن اس میں فقہ حنفی کی خصوصیت نہیں۔ یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے۔ جو مسائل آج خاص اسلام کے مسائل خیال کئے جاتے ہیں اور خود قرآن مجید میں اُن کا ذکر ہے اُن میں متعدد ایسے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں معمول و متداول تھے۔ علامہ ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں اُن کی تفصیل بھی کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے خراج و خمس کے متعلق جو قاعدے مقرر کئے وہ عموماً وہی ہیں جو نوشیرواں عادل نے اپنے زمانۂ حکومت میں وضع کئے تھے اور یہ کچھ توارد نہ تھا بلکہ حضرتؓ نے دانستہ نوشیرواں کی اقتداء کی تھی۔ چنانچہ علامہ طبری وابن الاثیر نے صاف انہیں الفاظ میں تصریح کی ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (۷۹) کیا ہے۔ علاوہ دوسری شہادتوں کے مؤرخانہ قیاس اس دعوے کے سخت مخالف ہے۔"

اس کے بعد پروفیسر موصوف اس کلیہ پر بحث کرکے کہ ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ ہر سلسلہ قانونی کو کسی واقعی یا فرضی واضع قانون کے نام سے موسوم کردیا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "اس لحاظ سے ابتدا ہی میں ایک قوی قیاس پیدا ہوتا ہے کہ جو باترتیب اور مضبوط سلسلۂ قانون مسلمان فاتحوں نے تمام ممالک مفتوحہ میں جاری کیا وہ بہ تبدیل ہیئت کوئی اعلیٰ درجہ کا مکمل رواج یافتہ سلسلۂ قانون تھا۔"

پروفیسر موصوف نے تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ جس وقت مسلمانوں نے شام، مصر، کو فتح کیا تو وہاں رومی قوانین کے متعدد مدرسے موجود تھے۔ بیروت میں الگزنڈر سیویرس کے زمانہ سے ایک مدرسۂ قانون چلا آتا تھا جس میں چار پروفیسر تھے۔ قیصریہ میں وکلاء کی ایک جماعت رہتی تھی۔ اسکندریہ میں قانون کی تعلیم جاری تھی۔ ان واقعات کی تفصیل کے بعد پروفیسر موصوف فرماتے ہیں کہ "اس قیاس کی نسبت کہ اسلامی قوانین پر رومی قانون کا اثر پڑا ہے اسقدر کہنا کافی ہوگا لیکن جس طریقہ سے کہ اسلامی فتوحات

ایک مقنن جب کسی ملک کے لئے قانون بناتا ہے تو اُن تمام احکام اور رسم و رواج کو سامنے رکھ لیتا ہے جو اُس ملک میں اُس سے پہلے جاری تھے اُن میں سے بعض کو وہ بعینہٖ لے لیتا ہے بعض میں ترمیم و اصلاح کرتا ہے۔ بعض کی بالکل مخالفت کرتا ہے۔ بے شبہ امام ابو حنیفہ نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ لیکن اس حیثیت سے وہ رومن لا کی بہ نسبت ایران کے قانون سے زیادہ مستفید ہوئے ہونگے۔ کیونکہ اوّلاً تو وہ خود فارسی النسل تھے اور اُن کی زبان مادری فارسی تھی۔ دوسرے اُن کا وطن کوفہ تھا اور وہ فارس کے اعمال میں داخل تھا۔

غرض یہ امر بہر حال قابل تسلیم ہے کہ امام صاحب کو فقہ کی توضیع میں اُن قواعد اور رسم و رواج سے ضرور مدد ملی ہوگی جو اُن ممالک میں جاری تھے لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی استعانت سے امام صاحب کے واضع قانون ہونے کی حیثیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ یعنے وہ ایک مستقل واضع قانون کہے جاسکتے ہیں یا صرف ناقل اور جامع۔ جہانتک ہماری تحقیق ہے مسلمانوں نے غیر قوموں کی قانونی تصنیفات سے بہت کم واقفیت حاصل کی۔ ترجموں کی فہرست میں ہم سیکڑوں ہزاروں کتابوں کے نام پاتے ہیں لیکن وہ فلسفہ، طب وغیرہ کی تصنیفات ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۰) ہوئیں اور جس طرح پر مسلمان ممالک مفتوحہ میں آباد ہوئے اگر ان امور پر غور کیا جائے تو یہ قیاس یقین سے بدل جاتا ہے"

اسلامی فتوحات کے طریقہ سے پروفیسر موصوف نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ شروع میں مسلمانوں نے غیر قوموں سے بجز جزیہ وصول کرنے کے اور کسی قسم کا اثر ڈالنا نہیں چاہا لیکن جب علمی ترقی کا زمانہ آیا تو انہوں نے غیر قوموں کے لئے قانون وضع کئے جو خود انہی قوموں سے ماخوذ تھے۔ پروفیسر موصوف کے الفاظ یہ ہیں۔ "نہ تو قرآن اور نہ ابتدائی خلافت کے زمانہ میں اس بات کی کچھ کوشش ہوئی کہ جو اعلیٰ قومیں عرب کے ماتحت ہوگئی تھیں۔ اُن کی دنیوی زندگی کے پیچیدہ معاملات میں دست اندازی کیجائے۔ نہ اسکے لئے فرصت تھی نہ دماغ اور نہ ایسے آدمی موجود تھے جو اس خدمت کو انجام دیسکتے۔ جب بغداد اور اندلس کے شہروں اور قاہرہ میں امن و امان کا زمانہ آیا اور مطالعہ و غور کا موقع ملا تو طب، ریاضیات، منطق اور علوم نفسیہ میں ترقی ہوئی۔ جس طرح کہ ارسطو سے عربوں نے منطق سیکھی اسی طرح بسل (BASIL) لیو (LEO) اور اُن کے یونانی شارحوں سے علم قانون اخذ کیا۔ اس کے بعد پروفیسر موصوف اس خیال کی قطعیت کے

قانون کی ایک کتاب کا بھی پتہ نہیں چلتا جو عربی زبان میں ترجمہ کی گئی ہو۔ اور اسقدر قطعاً ثابت ہے کہ امام صاحب نے جس زمانہ میں فقہ کی تدوین کی کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا اسلئے یہ احتمال کہ امام ابو حنیفہ نے غیر قوموں کی قانونی تصنیفات سے فائدہ اُٹھایا ہو بالکل بے اصل ہے۔ ملک میں رسم و رواج کی بنیاد پر جو احکام نافذ تھے۔ اس قابل نہ تھے کہ حیز تحریر میں آکر قانون کا لقب حاصل کر سکتے۔

مختصر یہ کہ جسقدر تاریخی قرائن موجود ہیں اُن سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ امام صاحب کو روم یا فارس کی کوئی قانونی تصنیف ہاتھ آئی جس کے نمونہ پر اُنہوں نے فقہ کی بنیاد رکھی اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ امام ابو حنیفہؒ سے پہلے فقہ کے مسائل جسقدر اور جس صورت میں مدون ہو چکے تھے وہ فن کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ ان باتوں کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اگر فقہ کو ایک قانون مانا جائے تو ضرور ماننا پڑے گا۔ کہ امام صاحب ہی اُس کے مقنن اور واضع تھے۔ البتہ اُن کو ملک کے رسم و رواج۔ مسائل معمول بہا۔ علما کے فتاوے۔ سے مدد ملی۔ لیکن یہ اُسی قسم کی مدد ہے جس سے دُنیا کے اور واضعان قانون بھی بے نیاز نہ تھے۔ اس لئے یہ امر امام صاحب

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۱) دلیل قائم کرتے ہیں کہ قرآن میں اسقدر کم احکام ہیں کہ اُن پر ایک قانون کی بنیاد نہیں قائم ہو سکتی۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ "قرآن میں صرف یہ احکام ہیں۔ خدا کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ تم اپنی بیبیوں کو دو دفعہ طلاق دیسکتے ہو پھر اُن کو رحمدلی یا مہربانی سے علحدہ کر دو۔ سود خوار قیامت میں آسیب زدوں کی طرح اُٹھیں گے میعادی قرض کو قلمبند کر لیا کرو۔ اگر بیبیوں کے ساتھ انصاف کر سکو تو کئی نکاح کر سکتے ہو لیکن چار سے زیادہ نہیں۔ مرد کو دو حصہ ملے گا اور عورت کو ایک لیکن صرف عورتیں ہوں تو دو۔ شوہر کو نصف حصہ ملیگا۔ مرض الموت میں وصیت کے وقت گواہوں کا ہونا ضرور ہے۔ سال بارہ مہینے کا ہوتا ہے مکاتب کو آزادی کا معاہدہ لکھدو اگر تمہاری مرضی ہو سزائے زنا۔ غیبت ۱۲۔

پروفیسر صاحب کے نزدیک قرآن میں صرف اسی قدر قانونی احکام مذکور ہیں۔ اور اسلئے اُن کے نزدیک قرآن مجید ایک وسیع قانون کی بنیاد نہیں قرار پا سکتا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "جو بیدھے قواعد اوپر درج ہوئے اُن میں مشکل سے رومی بنیاد کا پتہ لگ سکتا ہے ... اس لحاظ سے یہ امر اور بھی حیرت انگیز ہے کہ جو عمارت مسلمان فقیہوں نے ایسے پُرانے مصالحہ سے طیار کی وہ قریب قریب ہر ایک موڑ پر رومی قانون کی گلیوں

کی مقننیت کے رُتبہ کو گھٹا نہیں سکتا۔

اِن عام مباحث کے بعد اَب ہم اُن خاصیتوں[1] کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے حنفی فقہ کو اور فقہوں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔

فقہ حنفی کی خصوصیتیں

فقہ حنفی کا اصول عقلی کے موافق ہونا۔

(۱) سب سے مقدم اور قابل قدر خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے وہ مسائل کا اسرار اور مصالح پر مبنی ہونا ہے۔ احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے۔ ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ یہ احکام تعبدی احکام ہیں یعنی ان میں کوئی سر اور مصلحت نہیں ہے۔ مثلاً شراب خواری یا فسق و فجور صرف اسلئے ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے اِن سے منع کیا ہے اور خیرات و زکوٰۃ صرف اسلئے مستحسن ہیں۔ کہ شارع نے ان کی تاکید کی ہے۔ ورنہ فی نفسہٖ یہ افعال بُرے یا بھلے نہیں ہیں۔ امام شافعی۔ کا اِسی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ اور شائد اسی کا اثر تھا کہ ابو الحسن اشعری نے جو شافعیوں میں علم کلام کے بانی ہیں علم کلام کی بنیاد اِسی مسئلہ پر رکھی۔

دوسرے فرقہ کا یہ مذہب ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔ البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن درحقیقت وہ مصلحت[2] سے خالی نہیں یہ

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۲) اور جزئیوں کو یاد دلاتی ہے" اس کے بعد پروفیسر موصوف نے دعوےٰ کیا ہے کہ مسائل مندرجہ[1] ذیل میں فقہ اسلام اور رومی قانون بالکل یکساں ہے اور بالآخر اُس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سلسلۂ قانون یعنی علم فقہ در اصل رومی قانون ہے لیکن بہ تبدیل ہیئت پروفیسر موصوف نے نو صفحوں میں یہ بحث لکھی ہے ہم نے اُس کا خلاصہ لکھدیا ہے۔ لیکن کوئی ضروری بات ترک نہیں کی بلکہ اکثر اُن کے خاص فقرے لکھدیئے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے جن مقدمات کی ترتیب سے استدلال کیا ہے وہ مختصراً یُوں بیان کئے جاسکتے ہیں "قرآن مجید میں بہت کم احکام ہیں اور اُن سے قانون نہیں بن سکتا۔ ممالک مفتوحہ اسلام میں رومی قانون پہلے سے جاری تھا۔ مسلمانوں نے

[1] یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جن خصوصیتوں کا ہم نے دعویٰ کیا ہے وہ بلحاظ اکثر مسائل کے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض جزئیات کے لحاظ سے یہ خصوصیتیں امام صاحب کے مذہب میں[2] پائی جاویں اور دوسرے اماموں کے فقہ میں پائی جائیں۔ لیکن ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ امام صاحب کے اکثر مسائل میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں اور امام شافعی وغیرہ کے اکثر مسائل میں نہیں پائی جاتیں ۱۲ [2] ذالک کذالک ۱۲ من المحشی

[1] ہمنے بخوف تطویل اُن مسائل کو یہاں نقل نہیں کیا۔ لیکن آگے چلکر ان میں سے بہت سے مسائل کا ذکر آئے گا ۱۲

مسئلہ اگرچہ بوجہ اس کے کہ اُس کے دونوں پہلو بڑے بڑے علما نے اختیار کئے ہیں۔ ایک معرکتہ الآرا مسئلہ بن گیا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اِسقدر بحث واختلاف کے قابل نہ تھا تمام مہمات مسائل کی مصلحت اور غائیت خود کلام الٰہی میں مذکور ہے۔ گفتار کے مقابلہ میں قرآن کا طرز استدلال عموماً اسی اصول کے مطابق ہے۔ نماز کی مصلحت خدا نے خود بتائی کہ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ روزہ۔ کی فرضیت کے ساتھ ارشاد ہوا۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ جہاد کی نسبت فرمایا حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ اسی طرح اور احکام کے متعلق قرآن وحدیث میں جابجا تصریحیں اور اشارے موجود ہیں کہ اُن کی غرض وغائیت کیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا یہی مذہب تھا اور یہ اصول اُن کے مسائل فقہ میں عموماً مرعی ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ حنفی فقہ جسقدر اصول عقلی کے مطابق ہے اور کوئی فقہ نہیں۔ امام طحاوی نے۔ جو محدث اور مجتہد دونوں تھے اِس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو شرح معانی الآثار کے نام سے مشہور ہے اور جس کا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص وطریق نظر سے ثابت کیا جائے محدث مذکور نے فقہ کے ہر باب کو لیا ہے۔ اور اگرچہ انصاف پرستی کے ساتھ بعض مسئلوں میں امام

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۳) یونان وروم وغیرہ کی تصنیفات کے ترجمے کئے "۔ "فلاں فلاں مسائل میں اسلامی فقہ اور رومی قانون متحد ہیں "

یہ بحث حقیقت میں نہائیت مفید اور امپارٹنٹ بحث ہے لیکن جیسا کہ ہمنے اصل کتاب میں بیان کیا ہے اس معرکہ میں اُس شخص کو قدم رکھنا چاہیئے جو فقہ اسلام ورومن لا دونوں سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ پروفیسر موصوف بے شبہ رومن لا کی نسبت ہر قسم کی واقفیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں لیکن مسائل اسلام کے متعلق اُنکی وسعت معلومات کا اعتراف کرنا مشکل ہے۔ اُنہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید میں قانونی احکام صرف معدودے چند ہیں جن کی اُنہوں نے تفصیل کردی ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی آیات احکام کم وبیش پانسو ہیں اور اگرچہ اِن میں بہت سے احکام عبادات وغیرہ کے متعلق ہیں تاہم خاص وہ آیتیں جن میں قانونی احکام ہیں سَو سے کم نہیں۔ یہ آیتیں جُداگانہ جمع کرلی گئی ہیں اور علما نے اُن پر متعدد تفسیریں لکھی ہیں۔ اِن تمام احکام سے واقف ہونا تو ایک طرف بہ وفیسر صاحب کی وسعت معلومات کا یہ حال ہے کہ نکاح وطلاق کے مسائل میں سے اُن کو صرف دو مسئلے معلوم ہیں تعداد طلاق وتعداد نکاح۔ حالانکہ قرآن مجید میں۔ محرمات نکاح۔ موطؤہ اب۔ جمع بین الاختین۔ نکاح۔

ابوحنیفہؒ سے مخالفت کی ہے۔ لیکن اکثر مسائل کی نسبت مجتہدانہ طرز استدلال، سے ثابت کیا ہے "امام ابوحنیفہؒ کا مذہب۔ احادیث اور طریق نظر۔ دونوں کے موافق ہے" امام محمد نے بھی کتاب الحج میں اکثر مسائل میں عقلی وجوہ سے استدلال کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چھپ گئیں ہیں اور ہر جگہ ملتی ہیں جس کو تفصیل مقصود ہو ان کتابوں کی طرف رجوع کرے اِس دعوی سے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب عقل کے موافق ہے۔ شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں اور وہ انکار کیوں کرتے۔ اُن کے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات جسقدر عقل سے بعید ہوں اُسی قدر اُنکی خوبی ہے۔

امام رازی نے زکوٰۃ کی بحث میں لکھا ہے[۱] کہ امام شافعی کا مذہب امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ صحیح ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ امام شافعی۔ کا مذہب عقل و قیاس سے بعید ہے اور یہی اسکی صحت کی دلیل ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کے مسائل زیادہ تر تعبدی احکام ہیں جن میں عقل و رائے کو دخل نہیں "

بخلاف اور ہمعصروں کے امام ابوحنیفہؒ کا اِس اصول کی طرف مائل ہونا ایک خاص سبب سے تھا۔ دوسرے ائمہ جنہوں نے فقہ کی تدوین و ترتیب کی۔ اُن کی علمی ابتدا فقہی مسائل سے ہوئی تھی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۴) بامشرکات۔ طلاق قبل خلوت صحیحہ و بعد خلوت اور دونوں کے احکام۔ خلع اور ایلاء کے مسائل تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

وراثت کے متعلق پروفیسر صاحب کو صرف شوہر کا حصہ اور یہ کہ مرد کو عورت کے دو حصہ کے برابر ملتا ہے معلوم ہے۔ افسوس اُن کو یہ معلوم نہیں کہ وراثت کا پورا باب اجمالاً قرآن مجید میں مذکور ہے اور خصوصاً والدین کا حصہ اور کلالہ کے احکام تو صاف صاف تصریحاً مذکور ہیں۔ قصاص اور دیت کے مسائل جو نہایت تفصیل سے قرآن میں مذکور ہیں اور جن میں قتل عمد اور قتل خطا اور اُن کے احکام کی پوری تفصیل ہے پروفیسر صاحب کو سرے سے معلوم نہیں۔ حیرت ہے کہ اس محدود واقفیت کے ساتھ پروفیسر صاحب نے اِس بحث کے طے کرنیکی کیونکر جرأت کی؟

یہ تو ضمنی بحث تھی اَب ہم اُن مقدمات پر توجہ کرتے ہیں جن پر پروفیسر صاحب کی استدلال کی بناہے جسقدر اُنہوں نے خود تسلیم کر لیا ہے اور واقع میں بھی صحیح ہے کہ شروع اسلام یعنی خلافت راشدہ کے اخیر زمانہ تک مسلمان غیر قوموں سے بالکل الگ رہے اور اُن کے قانون اور احکام سے کسی قسم کی واقفیت نہیں حاصل کی۔ اسلئے دمشق و بیروت و اسکندریہ میں اُسوقت رومن لا کے جو مدرسے جاری تھے خود بقول پروفیسر صاحب کے

[۱] مناقب الشافعی مصنفہ امام فخر الدین رازی ۱۲

بخلاف اس کے امام ابو حنیفہؒ کی تحصیل علم کلام سے شروع ہوئی جس کی ممارست نے اُن کی قوت فکر اور حدتِ نظر کو نہائیت قوی کر دیا تھا۔ معتزلہ وغیرہ جن سے اُن کے معرکے رہتے تھے عقلی اصول کے پابند تھے ملسلئے۔ امام صاحب کو بھی اُن کے مقابلہ میں اُنہیں اصول سے کام لینا پڑتا تھا۔ اور متنازع فیہ مسئلوں میں مصالح و اسرار کی خصوصیتیں دکھائی پڑتی تھیں۔ اِس غور اور تدقیق ومشق و مہارت سے اُن کو ثابت ہو گیا تھا کہ شریعت کا ہر مسئلہ اصول عقل کے مطابق ہے۔ علم کلام کے بعد وہ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو اِن مسائل میں بھی وہی جستجو رہی۔

حنفی فقہ کے مسائل کا دوسرے فقہوں کے مسائل سے مقابلہ کیا جائے۔ تو یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے۔ معاملات تو معاملات عبادات میں بھی جس کی نسبت ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ اُس میں عقل کو دخل نہیں امام صاحب کے مسائل عموماً عقل کے موافق معلوم ہوتے ہیں۔

اگر اس بات پر غور کی جائے کہ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ شریعت میں کن مصلحتوں سے فرض کئے گئے ہیں اور اُن مصالح کے لحاظ سے اِن احکام کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا چاہئے تو وہی طریقہ موزوں ثابت ہوگا۔ جو حنفی فقہ سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۵) اسلامی فقہ پر اُس کا کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ اب قابل لحاظ یہ امر ہے کہ پروفیسر صاحب نے اسلام کے جو مسائل اس دعویٰ کے ساتھ پیش کئے ہیں کہ وہ رومن لا کے موافق ہیں وہ کس زمانہ کے ایجاد شدہ مسائل ہیں۔ مثلاً وراثت کے متعلق پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ مسائل ذیل یعنی اولاد سلسلہ اصولی۔ رشتہ داران طرفی خواہ آدھا خون ملا ہو یا کُل اور اُن کی اولاد۔ بی بی یا خاوند مولائی غلام آزاد یہ سب رومن لا کے موافق ہیں۔ اس کے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں ترکہ اس طرح تقسیم کیا جاتا تھا جو رومن لا کا طریقہ تھا یعنی کل حصے یہ تھے۔ نصف۔ ربع۔ ثمن۔ دو ثلث۔ ایک ثلث۔ سدس۔ یہی حصے رومن لا میں بھی تھے لیکن پروفیسر صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ حصص خود قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ اور قرآن مجید کی نسبت خود پروفیسر صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ اُس میں رومی بنیاد کا پتہ نہیں لگتا۔ البتہ ورثا کی بعض افراد قرآن مجید میں مذکور نہیں لیکن وہ زمانۂ رسالت خلافت تک پوری طرح سے معین و مقرر ہو چکے تھے۔ حدیث و آثار کی نہائیت قدیم کتابیں آج موجود ہیں اُن کو پڑھ کر متعصب سے متعصب شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

وصیت کے متعلق پروفیسر صاحب نے فقہ کے جن مسائل کو رومن لا سے ماخوذ سمجھا ہے اُنکی یہ تفصیل کی ہے۔

لیکن اِس لحاظ سے کہ نماز کی اصلی غرض کیا ہے؟ (یعنی خضوع۔ اظہار تعبد۔ اقرار عظمت الٰہی۔ دعا) اور اُس کے حاصل ہونے میں کن افعال کو کس نسبت سے دخل ہے؟ اِن افعال کے مراتب مختلف ہیں بعض لازمی اور ضروری ہیں۔ کیونکہ اُن کے نہ ہونے سے نماز کی اصل غرض فوت ہوتی ہے اِن افعال کو شریعت کی زبان میں فرض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں جو طریقۂ ادا میں ایک حُسن و خوبی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے فوت ہونے سے اصل غرض فوت نہیں ہوتی۔ اِن افعال کا رتبہ پہلی قسم سے کم ہے اور اُن کو سُنّت و مستحب سے تعبیر کرتے ہیں۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود فرض و واجب و سنت کی تصریح نہیں فرمائی۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ نماز کے تمام افعال یکساں درجہ نہیں رکھتے تھے اِس لئے تمام مجتہدین نے اُن کے امتیاز مراتب پر توجہ کی اور استنباط اجتہاد کی رو سے اُن افعال کے مختلف مدارج قایم کئے اور اُن کے جُدا جدا نام رکھے۔ امام ابو حنیفہؒ نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن اس باب میں اُن کو اور آیٔمہ پر جو ترجیح ہے وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے جن افعال کو جس رتبہ پر رکھا در حقیقت اُن کا وہی رتبہ تھا۔ مثلاً سب سے ضروری امر یہ ہے کہ نماز کے ارکان یعنی وہ

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۶) وصیت تقریری یا تحریری دو گواہوں کے سامنے۔ وصی۔ ایک ثلث جائداد سے زیادہ کی وصیت نہیں کرسکتا جب تک کہ ورثا نہ راضی ہوں۔ لیکن یہ مسایل بھی زمانۂ نبوت یا خلافت کے مسایل ہیں۔ اور اس امر سے ایک عام عربی داں بھی انکار نہیں کرسکتا۔ پروفیسر صاحب نے اور بھی مسایل گنائے ہیں جو اُن کی رائے میں رومن لا سے ماخوذ ہیں۔ ہم اُن سب کی تفصیل نہیں کرسکتے۔ مختصراً اسقدر کہنا کافی ہے کہ اُن میں اکثر مسایل اُسی زمانہ کے ہیں جن کی نسبت پروفیسر صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے قوانین و احکام سے کچھ واقفیت نہیں حاصل کی تھی۔

پروفیسر صاحب کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ قرآن مجید یا حدیث میں قانونی مسایل بہت کم تھے اُنکی بنیاد پر فقہ کا اتنا بڑا دفتر کہاں سے طیار ہوگیا؟ اسی حیرت نے اُن کو مجبور کیا کہ وہ فقہ اسلام کو رومن لا کا خوشہ چین بتائیں۔ لیکن پروفیسر صاحب کس کس بات پر حیرت کرینگے۔ قانونی مسایل تو خیر رومن لا سے ماخوذ ہیں۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ کے متعلق قرآن مجید و احادیث میں کون سی بڑی تفصیل ہے۔ پھر فقہ میں انہی مسائل کا ایک عظیم الشان سلسلہ کیونکر قائم ہوگیا؟ کیا یہ مسایل بھی رومن لا سے ماخوذ ہیں اس کو بھی جانے دو۔ تمام اور اسلامی علوم کیونکر پیدا

افعال جن کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ کیا ہیں؟ چونکہ نماز اصل میں اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا نام ہے۔ اسلئے اسقدر تو سب مجتہدوں کے نزدیک مسلم رہا کہ نیت۔ تکبیر۔ قرأت۔ رکوع۔ سجود۔ وغیرہ جن سے بڑھکر اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا فرض اور لازمی ہیں اور خود شارع نے اُن کے لازمی اور ضروری ہونے کی طرف اشارے کئے بلکہ بعض جگہ تصریح بھی کی لیکن اور ائمہ نے یہ زیادتی کی کہ ان ارکان کی خصوصیتوں کو بھی فرض قرار دیدیا۔ حالانکہ وہ خصوصیتیں لازمی نہ تھیں۔ اسلئے امام ابوحنیفہؒ اُن کے فرضیت کے قائل نہیں۔ مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کے سواء اور الفاظ سے بھی ادا ہو سکتی ہے جو اُس کے ہم معنی ہیں (مثلاً اللہ اعظم اللہ اجل) امام شافعی کے نزدیک نہیں ہو سکتی۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکبیر اگر فارسی زبان میں کہی جائے تب بھی جائز ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قرآن مجید کی کسی

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۷) ہوئے؟ اور اس وسعت کو کیونکر پہنچے۔؟ آنحضرتؐ کے زمانہ میں۔ تفسیر۔ حدیث۔ اصول حدیث۔ اصول فقہ۔ اسماء الرجال کے کتنے مسائل پیدا ہوئے تھے۔ اور آج اُن کی کیا حالت ہے؟۔ کیا آج یہ سب علوم جداگانہ فن نہیں ہیں؟ کیا اُن سے مسلمانوں کی دقت نظر۔ تیزی طبع۔ وسعت خیال۔ کا اندازہ نہیں ہوتا۔ کیا یہ علوم و فنون بھی مسلمانوں نے روم و یونان سے سیکھے۔؟۔

فقہ کے جن مسائل کو پروفیسر صاحب نے رومن لا سے ماخوذ بتایا ہے وہ تو اُس زمانہ کے مسائل ہیں جب خود بقول پروفیسر صاحب کے مسلمانوں نے غیر قوموں سے کچھ نہیں سیکھا تھا۔ لیکن زمانہ مابعد میں بھی فقہ نے رومن لا کا کبھی احسان نہیں اُٹھایا۔ پروفیسر صاحب کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ دولت عباسیہ کے عہد ترقی میں مسلمانوں نے یونان و مصر سے علوم و فنون لئے۔ لیکن اُن کو جاننا چاہئے کہ یونان و مصر کے شاگردوں کا گروہ ایک خاص گروہ تھا۔ بے شبہہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو غیر قوموں سے مستفید ہوتے تھے اور اِس کو عیب نہیں سمجھتے تھے لیکن مسلمانوں ہی میں وہ گروہ بھی تھا (اور وہی بہت بڑا گروہ تھا) جو اپنے فضل و کمال کے زعم میں غیر قوموں کی طرف کبھی رُخ نہیں کرتا تھا۔ مجتہدین اور فقہاء۔ اسی گروہ میں داخل ہیں۔ یونان و روم وغیرہ کی کتابیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں اُن کی نہایت مفصل فہرست ہم کو معلوم ہے۔ ان میں فلسفہ۔ طب۔ ہندسہ۔ نجوم۔ کیمیا۔ صنعت۔ تاریخ۔ تألیف۔ ناول۔ ہر قسم کی کتابیں ہیں لیکن قانون کی ایک تصنیف

آیت کے پڑھنے سے قرأت کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جو شخص عربی میں قرآن پڑھنے سے معذور ہے وہ مجبوراً ترجمہ پڑھ سکتا ہے[^1]۔ امام شافعی کے نزدیک ترجمہ سے کسی حالت میں نماز نہیں ہو سکتی

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ امام ابو حنیفہؒ یا کسی مجتہد نے صرف عقل و قیاس سے نماز کے ارکان متعین کئے ہیں۔ ائمہ نے اِن ارکان کے ثبوت کے لئے عموماً احادیث کی تصریحات و اشارات سے استدلال کیا ہے۔ چنانچہ ہر مجتہد کے نقلی دلائل کتب فقہ میں بہ تفصیل مذکور ہیں ہمارا یہ مطلب ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے دعوؤں پر جس طرح نقلی دلائل یعنی احادیث کی تصریحیں اور اشارے موجود ہیں۔ اسی طرح عقلی وجوہ بھی اُن کی صحت کے شاہد ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب شریعت کے اسرار اور مصالح کو نہایت دقیق نگاہ سے دیکھتے تھے۔

زکوٰۃ کے مسائل کا بھی یہی حال ہے۔ زکوٰۃ کا اصلی مقصد بنی نوع کی ہمدردی اور اعانت ہے اس لئے زکوٰۃ کے مصرف میں وہ لوگ خاص کر دیے گئے ہیں جو سب سے زیادہ ہمدردی اور اعانت کا استحقاق رکھتے ہیں۔ یعنی فقراء۔ مساکین۔ عمال زکوٰۃ۔ مولفتہ القلوب۔ مقروض۔ مسافر۔ غازی۔ مکاتب چونکہ ان لوگوں کی تصریح خود قرآن مجید میں مذکور ہے اس لئے اس امر میں سب

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۸) ہی نہیں جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ فقہا اور مجتہدین جو اسلام میں واضع قانون تھے غیر قوموں کی خوشہ چینی کو اپنی اصطلاح میں حرام کہتے تھے کیا۔ امام ابو حنیفہؒ۔ امام مالک۔ امام شافعی۔ امام احمد حنبل سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ مسائل فقہ کو جو اُن کے نزدیک مذہب کا ایک حصہ تھا روم و یونان سے سیکھتے۔ اگر پروفیسر صاحب کو ان ائمہ کے حالات معلوم ہوتے اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ فقہ کے تمام ابواب انہی بزرگوں کے عہد میں مرتب ہو گئے تھے تو وہ ہرگز ایسا دعویٰ نہ کرتے!

[^1]: امام محمد نے جامع صغیر میں جو روایت کی ہے اُس میں مجبوری کی قید نہیں ہے اور اِسی بنا پر مخالفین نے امام صاحب پر سخت اعتراض کیا ہے کہ "وہ قرآن کی حقیقت و مفہوم میں الفاظ کو دخل نہیں سمجھتے یعنے اُن کے نزدیک حرف قرآن کے معانی پر قرآن کا اطلاق ہو سکتا ہے"۔ بے شبہ امام صاحب کی اس غلطی کو ہم[^2] تسلیم کرتے ہیں لیکن فقہائے حنفیہ نے دعویٰ کیا ہے کہ امام صاحب نے بالآخر اس قول سے رجوع کیا ہے۔ ۱۲

[^2]: اگر غلطی ثابت ہو۔ تو پائے وصل کردن آمدی۔ نے برائے فصل کردن آمدی ۱۲ محشی

مجتہدین کا اتفاق رہا کہ یہ لوگ مصرف زکوٰۃ ہیں۔ لیکن تعیین نے ایک اختلاف پیدا کر دیا۔ امام شافعی نے اِن اقسام کے ذکر سے یہ خیال کیا کہ یہ سب اشخاص زکوٰۃ کے ادا میں لازمی ہیں یعنی جب تک اِن آٹھوں اقسام کے لوگوں کو زکوٰۃ ادا نہ کی جائے فرض ادا ہی نہیں ہو سکتا بخلاف اس کے امام ابو حنیفہ کا یہ مذہب ہے کہ زکوٰۃ اِن اقسام سے باہر نہ جانے پائے۔ باقی یہ امر کہ اِن لوگوں میں سے سب کو دی جائے یا بعض کو یہ امر مقتضائے وقت اور ضرورت پر موقوف ہے امام اور حاکم وقت ضرورت کے لحاظ سے جس کو چاہے انتخاب کر سکتا ہے[۱]۔

ایک اور مسئلہ جس میں امام ابو حنیفہ اور دوسرے ائمہ مختلف ہیں یہ ہے کہ چار پایوں کی زکوٰۃ ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک زکوٰۃ میں جانور یا اُس کی قیمت ادا کیجا سکتی ہے۔

امام شافعی کے نزدیک "قیمت ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا ہی نہیں ہو سکتی" حالانکہ زکوٰۃ کی غرض حاصل ہونے میں جانور اور اُس کی قیمت دونو برابر ہیں اس لئے شارع نے بھی کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔

اِن مسائل کے سوا عبادات کے اور سیکڑوں مسائل ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حنفی مسائل میں ہر جگہ مصالح اور اسرار کی خصوصیت ملحوظ ہے لیکن ہم تطویل کے لحاظ سے اُن سب کی تفصیل نہیں کر سکتے۔ معاملات کے مسائل میں یہ عقدہ زیادہ حل ہو جاتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ (۸۹) البتہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ بعض مسائل میں رومن لا و فقہ اسلام متحد کیوں ہیں۔ لیکن اس میں فقہ اسلام کی تخصیص نہیں۔ جن قانون کا گو وہ کتنی ہی بے تعلق ہوں آپس میں مقابلہ کیا جاوے بہت سے مسائل مشترک ثابت ہونگے اور قدرتاً ایسا ہونا ضرور ہے۔ جب تمام دنیا کے آدمیوں کی۔ ذاتی۔ تمدنی۔ ملکی ضرورتیں۔ اکثر متحد اور یکساں ہیں تو اِن ضرورتوں کے لحاظ سے ہر جگہ جو قوانین وضع کئے جاوینگے اُنکے مسائل کا مشترک ہونا کونسی تعجب کی بات ہے شعر

دو راہرو کہ بیک رہ روند در یک سمت عجب نباشد اگر اوفتند پے بر پے

---

[۱] کیونکہ ممکن ہے کہ آٹھوں طرح کے آدمی ایک وقت نہ مل سکیں تو زکوٰۃ ہی نہ دیجائے۔ حیلہ جو کیلئے فائدہ ہے۔ افسوس!! المحشی ۲ عفی اللہ۔ ہذا جبر ۱۲ محشی

امام ابوحنیفہ کا مذہب کس قدر مصالح اور اسرار کے مُوافق ہے۔

دوسری خصوصیت فقہ حنفی کا آسان اور سہل ہونا

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حنفی فقہ بہ نسبت تمام اور فقہوں کے نہائیت اور یسیر التعمیل ہے قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے "کہ خدا تم لوگوں کے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا"

رسول اللہ کا قول ہے کہ "میں نرم اور آسان شریعت لیکر آیا ہوں" بے شبہہ اسلام کو تمام اور مذہبوں کے مقابلہ میں یہ فخر حاصل ہے کہ وہ رہبانیت سے نہائیت بعید ہے۔ اُس میں عبادات شاقہ نہیں ہیں۔ اُس کے مسائل آسان اور یسیر التعمیل ہیں۔ حنفی فقہ کو بھی اور فقہوں پر یہی ترجیح حاصل ہے۔

حنفی فقہ کا آسان اور وسیع ہونا ایسا متعارف ہے کہ شعراء اور مصنفین اُسکو ضرب المثل کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔ انوری نے جو ایک فحاش اور بدزبان شاعر تھا اگرچہ بُرے موقع پر اس کا استعمال کیا اور کہا ع چوں رخصت ہائے بوحنیفہ + تاہم اصل مدعا کا ثبوت اُس کے کلام سے بھی ہوتا ہے۔ عبادات اور معاملات۔ کا کوئی باب کوئی فصل۔ لیلو یہ تفرقہ صاف نظر آتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسائل ایسے آسان اور نرم ہیں جو شریعت سہلہ کی شان ہے۔ بخلاف اس کے۔ اور ائمہ کے بہت سے احکام نہائیت سخت اور عسیر التعمیل ہیں۔ مثلاً کتاب الجنایات و کتاب الحدود کے مسائل۔ انہی میں سے سرقہ کے احکام ہیں چنانچہ ہم اُس کے چند جزئیات نمونہ کے طور پر یہاں لکھتے ہیں۔

اسقدر تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ سرقہ کی سزا قطع ید یعنے ہاتھ کاٹنا ہے۔ لیکن مجتہدین نے سرقہ کی تعریف میں چند شرطیں اور قیدیں لگائی ہیں جن کے بغیر قطع ید کی سزا نہیں ہوسکتی۔ ان شروط کے لحاظ سے احکام پر جو اثر پڑتا ہے وہ ذیل کی جزئیات سے معلوم ہوگا۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب کس قدر آسان۔ اور تمدن و شائستگی کے کس قدر موافق ہے +

سرقہ کے احکام

امام ابوحنیفہ کے مسائل	اور ائمہ کے مسائل
نصاب سرقہ۔ کم از کم ایک اشرفی ہے۔	ایک اشرفی کا رُبع۔
اگر ایک نصاب میں متعدد چوروں کا ساجھا ہے تو کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔	امام احمد کے نزدیک ہر ایک کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔
نادان بچّہ پر قطع ید نہیں۔	امام مالک کے نزدیک ہے۔
کفن چور پر قطع ید نہیں۔	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
زوجین میں سے اگر ایک دوسرے کا مال چُرائے تو قطع ید نہیں۔	امام مالک کے نزدیک ہے۔
بیٹا باپ کا مال چُرائے تو قطع ید نہیں۔	امام مالک کے نزدیک ہے۔
قرابت قریبہ والے مثلاً۔ چچا۔ بھائی وغیرہ پر قطع ید نہیں۔	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
ایک شخص کسی سے کوئی چیز مستعار لیکر انکار کر گیا۔ تو قطع ید نہیں۔	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
ایک شخص نے ایک چیز چرائی پھر بذریعہ ہبہ یا بیع اُس کا مالک ہو گیا۔ تو قطع ید نہیں۔	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
غیر مذہب والے جو مستامن ہو کر اسلام کی عملداری میں رہتے ہیں اُن پر قطع ید نہیں۔	اور ائمہ کے نزدیک ہے۔
قرآن مجید کے سرقہ پر قطع ید نہیں۔	امام شافعی و مالک کے نزدیک ہے۔
لکڑی۔ یا جو چیزیں جلد خراب ہو جاتی ہیں ان کے سرقہ سے قطع ید لازم نہیں آتا۔	اور ائمہ کے نزدیک لازم آتا ہے۔

فقہ کا ایک بڑا حصہ کتاب الخطر والاباحۃ ہے یعنی حرام وحلال۔ جائز و ناجائز کی تفصیل اس باب میں، یہ دعویٰ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ اور ائمہ کے بہت سے ایسے مسئلے ہیں جن کی پابندی کی جائے تو زندگی دشوار ہو جائے۔ بخلاف اس کے امام ابوحنیفہ۔ کے احکام نہائت

آسان اور سہل ہیں۔ مثلاً امام شافعی کے نزدیک جو پانی اُپلوں کی آگ سے گرم کیا گیا ہو اُس سے غُسل اور وضو ناجائز ہے۔ اسی طرح مٹی کے برتن جو اُپلوں کی آگ سے پکائے گئے ہوں اُن میں کھانا ناجائز ہے۔ رانگ۔ کانچ۔ بلور عقیق کے برتنوں کا استعمال ناجائز ہے۔ مثلاً پشمینہ۔ سمور۔ پوستین وغیرہ کا استعمال ناجائز ہے اور اُس کو پہن کر نماز نہیں ہوسکتی۔ برتن۔ یا کرسیاں اور زین وغیرہ جن پر چاندی کا کام ہو اُن کا استعمال ناجائز ہے بیع بالمعاطاتہ۔ یعنے خرید فروخت کا عام طریقہ جس میں بعث واشریت کی تصریح نہیں کی جاتی۔ ناجائز ہے۔ اِن تمام مسائل میں امام ابو حنیفہ۔ کا مذہب۔ امام شافعی سے مخالف ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حنفی فقہ۔ دوسرے فقہوں کی طرح تنگ اور سخت گیر نہیں ہے۔

تیسری خصوصیت

(۳) فقہ کا بہت بڑا حصہ جس سے دنیوی ضرورتیں متعلق ہیں معاملات کا حصہ ہے اور یہی وہ موقع ہے جہاں۔ ہر مجتہد کی دقت نظر اور نکتہ شناسی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے زمانہ تک معاملات کے احکام ایسے ابتدائی حالت میں تھے کہ متمدن اور تہذیب یافتہ ملک کے لئے بالکل ناکافی تھے۔ نہ معاہدات کے استحکام کے قاعدے منضبط تھے۔ نہ دستاویزات وغیرہ کی تحریر کا اصول قایم ہُوا تھا۔ نہ فصل قضایا اوائے شہادت کا کوئی باقاعدہ طریقہ تھا۔ امام ابو حنیفہ پہلے شخص ہیں جو ان چیزوں کو قانون کی صورت میں لائے۔ لیکن افسوس ہے کہ جو مجتہدین اُن کے بعد ہوئے اُنہوں نے بجائے اس کے کہ اُس کو اور وسعت دیتے۔ اُسے غیر تمدنی حالت کو قایم رکھنا چاہا۔ جس کا منشاء وہ زاہدانہ خیالات تھے جو علمائے مذہب کے دماغوں میں جاگزیں تھے۔ ایک مشہور محدث نے فقہا پر طعن کیا ہے کہ "اِن لوگوں کے نزدیک جب کسی زمین کا دعوےٰ کسی عدالت میں پیش کیا جائے تو ضرور ہے کہ عرضی دعویٰ میں زمین کا موقع بتایا جائے اُس کی حدود اربعہ دکھائی جائیں حیثیت اور صورت کی تفصیل ہو۔ حالانکہ رسول اللہؐ یا صحابہ کے زمانہ میں ان جزئیات اور قیدوں کا نام ونشان بھی نہ تھا۔" محدث مذکور کے نزدیک یہ بڑے الزام کی بات ہے۔ لیکن اگر اُن کو کسی ترقی یافتہ ملک میں رہنے کا اتفاق ہوتا اور معاملات سے بھی کام پڑتا تو معلوم ہوتا کہ جن چیزوں کو وہ الزام کی بات سمجھتے ہیں اُن کے بغیر زندگی بسر کرنی مشکل ہے۔

فقہ حنفی میں معاملات کے متعلق جو قاعدے ہیں نہایت وسیع تمدن کے موافق ہیں۔

امام شافعی۔ ہبہ کے لئے قبضہ کو ضروری نہیں سمجھتے۔ شفعہ ہمسایہ کو جائز نہیں رکھتے تمام معاملات میں مستور الحال کی شہادت کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ گواہان نکاح کے لئے ثقہ اور عادل ہونے کی قید ضروری سمجھتے ہیں۔ ذمیوں کے باہمی معاملات میں بھی اُن کی شہادت جائز نہیں قرار دیتے۔ بے شبہہ یہ باتیں اُن ممالک میں آسانی سے چل سکتی ہیں جہاں تمدن نے وسعت نہیں حاصل کی ہے اور معاملات کی صورتیں بالکل سادہ اور نیچرل حالت میں ہیں۔ لیکن جن ملکوں میں تمدن نے ترقی حاصل کی ہو۔ معاملات کی مختلف اور پیچ در پیچ صورتیں پیدا ہوتی جاتی ہوں حقوق کی تحدید اور انضباط کے بغیر چارہ نہ ہو وہاں ایسے احکام کا قائم رہنا آسان نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام مسائل میں امام ابو حنیفہ۔ امام شافعی سے مخالف ہیں۔ مورخ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ امام مالک کا مذہب اُنہی ممالک میں رواج پا سکا جہاں تمدن نے وسعت نہیں حاصل کی تھی[1]۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ امام مالک کے مسائل میں اصول تمدن کی رعایت نہ تھی۔

امام ابو حنیفہ نے جس وقت نظر اور نکتہ شناسی کے احکام منضبط کئے اس کا صحیح اندازہ تو اُسوقت ہو سکتا ہے کہ معاملات کے چند ابواب پر ایک مفصل ریویو لکھا جائے۔ لیکن ایسی تفصیل کے لئے نہ وقت مساعد ہے نہ اس مختصر کتاب میں اُس کی گنجائش ہے تاہم ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ اسلئے نمونہ کے طور پر ہم صرف مسائل نکاح ذکر کرتے ہیں جو عبادات اور معاملات دونوں کا جامع ہے۔

نکاح کو اگرچہ فقہا نے عبادات میں شامل کیا ہے لیکن یہ صرف ایک اصطلاح ہے ورنہ نکاح۔ بوجہ اس کے کہ تمدن و معاشرت کے بڑے بڑے نتائج اُس پر متفرع ہوتے ہیں معاملات کا نہایت ضروری حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نکاح کے مسائل

مسائل نکاح کے انتخاب کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ بعض بعض یورپین مصنفوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حنفی فقہ کے مسائل نکاح نہایت وحشیانہ اور ظالمانہ ہیں۔ لیکن ہم اس بحث میں دکھا دینگے کہ آج مہذب سے مہذب ملکوں میں بھی نکاح کے قواعد حنفی فقہ سے عمدہ تر نہیں ہیں منتھم نے اپنی کتاب یولٹی میں لکھا ہے کہ "رومن لا کے بموجب قواعد نکاح ایک مجموعۂ

[1] اس قول کو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں ۱۲

ظلم ہیں"۔

لیکن ہم ثابت کر دینگے کہ حنفی فقہ کے بموجب قواعد نکاح مجموعۂ انصاف ہیں۔ غالباً اس بحث سے اُن لوگوں کے خیالات کی بھی کسی قدر اصلاح ہو گی جو غلطی سے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ حنفی فقہ رومن لا سے ماخوذ ہے۔

نکاح وازدواج۔ تمدن اور معاشرت کا نہائیت وسیع حِصّہ ہے۔ نکاح بقول ایک حکیم کے جماعتوں کا شیرازہ۔ تہذیب کی اصل۔ تمدن کی بنیاد ہے"۔ اِس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ جس مقنن نے اُس کے اصول وضوابط کی عمدہ توضیح یا تشریح کی وہ قانون تمدن کا بہت بڑا نکتہ شناس ہے۔ اگرچہ امام ابوحنیفہ اِن اصول وضوابط کے موجد نہیں ہیں۔ شارع نے خود اُس کے مہمات مسائل بتا دیئے تھے۔ تاہم جس نکتہ سنجی کے ساتھ اُنھوں نے اِن اصول کی تشریح کی اور اُس پر احکام متفرع کئے وہ خود ایک بڑے مقنن کا کام تھا۔ شارع کا کلام کہیں مجمل واقع ہوا تھا کہیں محتمل المعینین۔ بعض جگہ صرف اشارے تھے۔ خاصکر جزئیات بہت کم مذکو تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ نکاح کے اکثر مسائل میں مجتہدین کی مختلف رائیں قائم ہو گئیں۔ یہی مختلف فیہ مسائل ہیں جن میں امام صاحب کے اجتہاد کے جوہر کھلتے ہیں۔ اور صاف نظر آتا ہے کہ جس طرح اُنھوں نے اِن موقعوں پر شارع کے اجمال کی تفصیل کی احتمالات کے محل معین کئے۔ اشاروں کی تصریحیں بتائیں۔ جزئیات کی تفریع کی۔ وہ اُنہیں کا کام تھا جن میں اور مجتہدین کسی طرح ان کی ہمسری نہیں کر سکتے۔

نکاح کے مسائل جن اصول پر متفرع ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) کن لوگوں کے ساتھ نکاح ہونا چاہیئے۔

(۲) معاملہ نکاح کس کے اختیار سے ہونا چاہیئے۔

(۳) اُس کی بقاو ثبات کا استحکام کس حد تک ضروری ہے۔

(۴) فریقین کے حقوق کیا قرار دیئے جائیں۔

(۵) نکاح۔ کن دستورات اور رسوم کے ساتھ عمل میں آئے۔

محرمات نکاح

یہ امر کہ نکاح کی وسعت کو کسی حد تک محدود کیا جائے۔ تھوڑے سے اختلاف کیساتھ

تمام مذاہب میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ ہر قوم نے چند محرمات قرار دیئے ہیں جنکے ساتھ ازدواج کو ناجائز قرار دیا ہے اور یہ محرّمات قریباً تمام مذہبوں میں مشترک ہیں۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ یہ امر نہائیت صریح اصول عقلی پر مبنی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ اور فلاسفر بنتھم نے کتاب یوٹلٹی میں محرّمات کی حرمت کے جو دلائل قائم کئے ہیں بالکل مشترک ہیں۔ چونکہ یہ امر بالکل اصول فطرت کے مطابق ہے اور قرآن مجید میں محرمات کے نام تصریحاً مذکور ہیں۔ اسلئے اصل مسئلہ میں تمام مجتہدین کا اتفاق رہا۔ لیکن جو جزئیات ظاہر نص کے ذیل میں نہیں آتیں۔ اُن میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ انہیں میں حرمت بالزنا کا مسئلہ ہے جو امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے اختلاف کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ امام شافعی کا مذہب ہے کہ زنا سے حرمت کے احکام نہیں پیدا ہوتے۔ مثلاً باپ نے کسی عورت سے زنا کیا تو بیٹے کا نکاح اُس عورت سے ناجائز نہیں ہے۔ امام شافعی نے اِس کو یہانتک وسعت دی ہے کہ ایک شخص نے اگر کسی عورت کے ساتھ زنا کیا اور اُس سے لڑکی پیدا ہوئی تو خود وہ شخص اُس لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے[1]۔ اُن کی دلیل ہے کہ زنا ایک حرام فعل ہے۔ اسلئے وہ حلال کو حرام نہیں کر سکتا۔ امام ابو حنیفہ[2] اسکے بالکل مخالف ہیں۔ اُن کے نزدیک مقاربت کے ذریعہ سے مرد اور عورت کے تعلقات پر جو فطری اثر پڑتا ہے وہ نکاح پر محدود نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے محرمات کی حرمت جس اصول پر مبنی ہے اُس کو نکاح کے ساتھ خصوصیت نہیں۔ اپنے نطفہ سے جو اولاد ہو گو زنا ہی سے ہو اُسکے ساتھ نکاح و مقاربت کا جائز رکھنا۔ بالکل اصول فطرت کے خلاف ہے۔ باپ کی موطؤہ کا بھی یہی حال ہے وعلٰے ہذا القیاس۔ خود قرآن مجید میں اس کے اشارے موجود ہیں۔ لیکن چونکہ یہاں نقلی بحث نہیں۔ ہم اُس کا ذکر نہیں کرتے۔

معاملہ نکاح میں اختیار

دوسری بحث یہ ہے کہ معاملہ نکاح کا مختار کون ہے؟ یہ ایک نہائیت مہتم بالشان سوال ہے۔ اور نکاح کے اثر کی خوبی یا برائی بہت کچھ اسی پر منحصر ہے۔ امام شافعی۔ و امام احمد حنبل کے نزدیک عورت گو عاقلہ بالغہ ہو۔ نکاح کے بارہ میں خود مختار نہیں ہے۔ یعنے کسی حال میں وہ اپنا نکاح آپ[3] نہیں کر سکتی۔ بلکہ ولی کی محتاج ہے اِن بزرگوں نے ایک طرف تو عورت کو

[1] اللہم ۱۲ [2] مغنی [3] ہذا ترغیب للاشتراء ۲

اسقدر مجبور کیا۔ دوسری طرف ولی کو ایسے وسیع اختیارات دیئے کہ وہ زبردستی جس شخص کے ساتھ چاہے نکاح باندھ دے عورت کسی حال میں انکار نہیں کر سکتی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بالغہ عورت اپنے نکاح کی آپ مختار ہے۔ بلکہ اگر نابالغی کی حالت میں ولی نے نکاح کر دیا ہو تو بالغ ہو کر وہ نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔

اِس اختلاف کی اصلی بنیاد عورتوں کے حقوق کے مسئلہ پر مبنی ہے۔ تمام مذہبوں میں عورتوں کی حالت نہایت پست قرار دی گئی ہے اور اُن کے حقوق نہایت تنگدلی سے قایم کئے گئے ہیں۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کے ہاں عورت کو میراث نہیں ملتی۔ خود عرب میں اسلام سے پہلے یہی دستور تھا۔ اس طرح کے اور بہت سے امور ہیں جن سے عورتوں کا کم رتبہ ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن اسلام نے مردوں اور عورتوں کے حقوق یکساں درجہ پر قایم کئے۔ اور فرمایا للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن امام ابوحنیفہؒ نے تمام مسائل میں اِس اصول مساوات کو مرعی رکھا ہے۔ اور یہی خصوصیت ہے جو اس باب میں اُن کی فقہ کو اور ایمہ کی فقہ سے ممتاز کرتی ہے۔ مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نکاح۔ طلاق عتق وغیرہ معاملات میں عورتوں کی شہادت اُسی طرح معتبر ہے جس طرح مردوں کی۔ بخلاف اس کے اور ایمہ مجتہدین کے نزدیک عورتوں کی شہادت کا اعتبار نہیں۔ بعض معاملات میں اُن بزرگوں نے عورتوں کی شہادت جایز بھی رکھی ہے تو یہ قید لگائی ہے کہ دو سے کم نہ ہوں۔ اور امام شافعی کے نزدیک تو چار سے کم کا کسی حالت میں اعتبار نہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جس طرح ایک مرد کی گواہی معتبر ہے عورت کی بھی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت منصب قضاء پر مامور کیجا سکتی ہے لیکن اور ایمہ مخالف ہیں۔ اِسی بنا پر اُن کے نزدیک جب مرد نکاح کے معاملہ میں خود مختار قرار دیا گیا ہے تو عورت کو بھی ایسا ہی اختیار دینا چاہیئے۔

اِس عام اصولِ مساوات کے قطع نظر۔ صورت متنازعہ میں خصوصیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ نکاح کا معاملہ۔ عام معاملات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ نکاح ایک ایسا تعلق ہے جس کا اثر نہایت وسیع ہے اور زندگی کے اخیر وقت تک قایم رہتا ہے۔ اس لئے ایسے معاملہ میں

سلہ خدا کے حقوق عطا کردہ سے محروم کرنا ہے ۱۲ محشی سلہ ہذا ۱۲ محشی

ایک فریق کو بالکل بے اختیار رکھنا نہایت ناانصافی ہے۔

اس بحث میں امام شافعی کا مدار محض نقلی دلیلوں پر ہے۔ لیکن اس میدان میں بھی امام ابوحنیفہ اُن سے پیچھے نہیں۔ اگر امام شافعی کو لانکاح الابولی۔ پر استدلال ہے تو امام صاحب کی طرف الثیب احق بنفسہا من ولیہا والبکر تستاذن فی نفسہا موجود ہے لیکن اس بحث کا یہ موقع نہیں۔

تیسری بحث یہ ہے کہ معاملۂ نکاح کا استحکام و بقا کس حد تک ضروری ہے۔ عقد نکاح کی خوبی کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے یعنی یہ کہ وہ تمدن کی بنیاد اور جماعتوں کا شیرازہ ہے اُسی حالت میں ہے جب وہ ایک مضبوط اور دیرپا معاملہ قرار دیا جاوے۔ ورنہ وہ صرف قضائے شہوت کا ایک ذریعہ ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اِس اصول کو نہایت قوت کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے۔ اُنہوں نے طریقۂ انعقاد۔ تعیین مہر۔ ایقاع طلاق۔ نفاذ خلع۔ کے جو قاعدے قرار دیئے ہیں اُن سب میں اِس اصول سے کام لیا ہے۔

عقد نکاح کا استحکام

اس باب میں سب سے مقدم اُن کا یہ مسئلہ ہے کہ الطلاق مع استقامۃ حال الزوجین حرام یعنی جب تک زوجین کی حالت استقامت پر ہے۔ طلاق دینا حرام ہے۔ ضرورت اور مجبوری کی حالت میں طلاق کو جائز قرار دیا ہے تو اُس کا طریقہ ایسا رکھا ہے جس سے اصلاح اور رجعت کی امید منقطع نہ ہو یعنی یہ کہ تین بار کرکے طلاق دے اور ہر طلاق میں ایک مہینہ کا فاصلہ ہو تاکہ اِس اثنا میں شوہر کو اپنے ارادے کے فیصل کرنے کے لئے کافی وقت ملے اگر وہ اس ارادے سے باز آنا چاہے تو باز آسکے۔ اور مستحب یہی ہے کہ باز آئے۔ اِس وسیع مدت میں اگر اصلاح و آشتی کی توقع نہ ہو۔ اور تجربہ سے ثابت ہو جائے کہ فریقین کی برہمی کسی طرح اصلاح پذیر نہیں ہے۔ تو مجبوراً طلاق دے۔ طلاق کے بعد اُس کو مہر ادا کرنا ہوگا۔ اور تین مہینہ تک زوجہ کی خورونوش کی کفالت کرنی ہوگی۔ اِس سے یہ مقصد ہے کہ جب تک وہ دوسرا شوہر نہ پیدا کرسکے۔ گذر اور بسر اوقات کے لئے اُس کو تکلیف نہ اُٹھانی پڑے اور مہر کی رقم عام مصارف میں کام آئے۔ اس باب میں امام صاحب کے مسائل جو اور آئمہ سے مختلف ہیں ہم اُن کو ذیل میں یکجائی طور پر لکھتے ہیں جس سے اندازہ ہوسکے گا کہ امام صاحب نے

معاملۂ نکاح کو کیسا مہتم بالشان اور مضبوط معاملہ سمجھا ہے۔ اور ہر حالت میں اُس کے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے ۔

۱۔ جب تک فریقین کی حالت میں استقامت ہو طلاق حرام ہے ۔	امام شافعی کے نزدیک حرام نہیں۔
۲۔ ایکبار تین طلاق دینا حرام ہے اور اُس کا مرتکب عاصی ہے ۔	امام شافعی و امام احمد حنبل کے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں ۔
۳۔ مہر کی تعداد کسی حالت میں دس درہم سے کم نہیں ہو سکتی۔ اس سے یہ مقصد ہے کہ مرد کو فسخ طلاق پر آسانی سے جرأت نہو کیونکہ یہ تعداد غریب اور مفلس کے لئے ہے۔ جسکو اس رقم کا ادا کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے امیروں کو دو چار ہزار کا ادا کرنا ۔	امام شافعی و امام احمد بن حنبل کے نزدیک ایک حبہ بھی مہر ہو سکتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ مرد بیدریغ بے سوچے سمجھے طلاق دینے پر جرأت کر سکتا ہے اور عورت کو بوجہ اس کے کہ تفریق کے بعد محض مفلس اور نادار رہگئی تکلیف کا احتمال ہے ۔
۴۔ خلوت صحیحہ سے پورا مہر واجب ہوتا ہے ۔	امام شافعی کے نزدیک نصف واجب ہوتا ہے ۔
۵۔ جسمانی بیماریاں مثل برص وغیرہ فسخ نکاح کا سبب نہیں ہو سکتیں ۔	امام شافعی و مالک کے نزدیک ان کی وجہ سے فسخ نکاح ہو سکتا ہے ۔
۶۔ اگر کوئی شخص مرض الموت میں طلاق دے اور عدت کے زمانہ میں اُس کا انتقال ہو جائے تو عورت کو میراث ملے گی ۔	امام شافعی کے نزدیک نہیں ملیگی ۔
۷۔ طلاق رجعی کی حالت میں وطی حرام نہیں ہے یعنی زوجیت کا تعلق ایسی معمولی بیزاری سے منقطع نہیں ہوتا ۔	امام شافعی کے نزدیک حرام ہے گویا وہ بائینہ ہو چکی ۔
۸۔ رجعت کیلئے اظہار زبانی کی ضرورت نہیں ہر فعل جس سے رضامندی ظاہر ہو رجعت	امام شافعی کے نزدیک بغیر اقرار و اظہار کے رجعت ہو ہی نہیں سکتی ۔

کیلئے کافی ہے مطلب یہ ہے کہ آسانی دیجائے تاکہ رجعت بادنے مسامحت ہوسکے ✦	
۹۔ رجعت پر گواہ مقرر کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ورنہ بعض حالتوں میں گواہ نہ مل سکے اور رجعت کی مدت قریب الانقضا ہے تو طلاق بائن ہوجائے گی ✦	امام مالک کے نزدیک بغیر استشہاد کے رجعت صحیح نہیں ہے ✦

نکاح کے فوائد مرتب ہونے کے لئے یہ ایک نہایت ضروری امر ہے کہ فریقین کے حقوق نہایت فیاضی اور اعتدال کے ساتھ قایم کئے جائیں۔ عورتوں کو مردوں کے ساتھ جن باتوں میں مساوات حاصل ہے وہ باطل نہ ہونے پائے۔ کیونکہ نکاح سے عورت کو اپنے امن و راحت کی توقع ہونی چاہئے۔ نہ یہ کہ اُس کے اصلی حقوق میں زوال آئے۔ یہ اسلام کی خاص فیاضی ہے جس کی نظیر اور کسی مذہب میں نہیں مل سکتی کہ اُس نے معاملۂ نکاح میں عورتوں کے حقوق نہایت وسعت کے ساتھ قایم کئے ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے اِس اصول کو تمام مسائل میں محفوظ رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان مسائل میں جہاں اور ائمہ نے اُن سے اختلاف کیا ہے صریح غلطی کی ہے مثلاً خلع کا معاملہ جو طلاق سے مشابہ ہے۔

عورتوں کے حقوق

اس باب میں تو سب آئمہ متفق ہیں کہ جس طرح مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ اسی طرح عورت کو کچھ معاوضہ دے کر خلع کا اختیار ہے۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ اِس معاوضہ کی کیا صورت ہے۔ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ اگر عورت کا قصور ہے اور خود اُس کی بدسلوکی تفریق کا سبب ہوئی ہے تو اُس مہر کے مقدار کی برابر شوہر کو معاوضہ دینا چاہیئے۔ مرد اگر اس مقدار سے زیادہ معاوضہ کا خواہاں ہو تو مکروہ ہے۔ لیکن اگر مرد کی شرارت ہے تو عورت بغیر کسی جرمانہ ادا کرنے کے خلع کی مستحق ہے اور مرد کو خلع کا معاوضہ لینا مکروہ ہے۔ امام شافعی و امام مالک کے نزدیک اولاً مرد جسقدر چاہے معاوضہ لے سکتا ہے۔ اور اس پر عورت کو مجبور کر سکتا ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ گو شرارت اور زیادتی مرد کی ہو تاہم وہ عورت سے معاوضہ لے سکتا ہے اور جسقدر چاہے لے سکتا ہے۔ حالانکہ یہ صریح ناانصافی ہے۔ کہ عورت بیگناہ بھی ہو اور معاوضہ بھی ادا کرے۔

اخیر بحث یہ ہے کہ نکاح کن دستورات کے ساتھ عمل میں آئے۔ اِن رسوم میں صرف دو مقصود پیش نظر ہیں۔ اوّل یہ کہ فریقین کی رضامندی محقق ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ واقعۂ عقد کا اشتہار ہو جائے۔ اِن اغراض کے لحاظ سے۔ امام ابو حنیفہ نے نہایت مناسب قاعدے قرار دیئے ہیں۔ یعنی یہ کہ فریقین ایسے الفاظ استعمال کریں جن سے ظاہر ہو کہ اُنہوں نے معاملۂ نکاح کو قبول کر لیا ہے اور یہ کہ عقد نکاح دو گواہوں کے سامنے عمل میں آئے یہ دونوں سادہ اور آسان شرطیں ہیں جو ہر موقع پر استعمال کی جا سکتی ہیں لیکن بعض ایمہ نے بخلاف اِس کے اِن شرطوں میں ایسی سخت قیدیں لگائی ہیں جن کی پابندی نہایت مشکل ہے امام شافعی کا مذہب ہے کہ گواہان نکاح عادل ہونے چاہئیں ورنہ نکاح صحیح نہیں۔ عدالت کے جو معنی مجتہدین اور خاصکر امام شافعی نے بیان کئے ہیں اُس کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک آدھ عادل ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر یہ قید ضروری سمجھی جاوے تو صحیح نکاح کا وجود ڈھونڈھے سے نہ مل سکے! امام شافعی و امام احمد حنبل کے نزدیک ضرور ہے کہ گواہ مرد ہوں۔ لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک عورتیں بھی گواہ ہو سکتی ہیں اور یہی قرین عقل بھی ہے امام شافعی نے یہ بھی قید لگائی ہے کہ خاص تزویج کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ حالانکہ خاص الفاظ کی پابندی کا کچھ حاصل نہیں۔ جو الفاظ اِس مفہوم پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً ہبہ تملیک وغیرہ سب عقد نکاح کے لئے کافی ہیں۔

دستور نکاح

(۴) ایک بڑی خصوصیت جو حنفی فقہ کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے ذمیوں یعنی اُن لوگوں کو جو مسلمان نہیں ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی حکومت میں مطیعانہ رہتے ہیں نہایت فیاضی اور آزادی سے حقوق بخشے ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جس کی نظیر کسی امام اور مجتہد کے مسائل میں نہیں ملتی۔ اگرچہ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت خود شارع کی ہدایتوں میں جابجا موجود ہے لیکن چونکہ وہ عام کلیات ہیں۔ اس کے علاوہ شارع کے بعض اقوال بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اسلئے اُن کی تعبیر مطالب میں اختلافات پیدا ہوئے ہیں تاہم کچھ شبہہ نہیں کہ جو تعبیر امام ابو حنیفہ نے کی وہی صحیح تعبیر تھی اسلام نہایت وسیع دنیا پر حکمران رہا ہے اور اُس کی حدود حکومت میں سیکڑوں غیر قومیں آباد تھیں اور ہیں اسلئے اگر اُن کے حقوق کی واجبی حفاظت نہ کی جاوے تو ایک دن بھی امن قائم نہیں رہ سکتا۔ امام ابو حنیفہ نے ذمیوں کو جو حقوق دیئے

چوتھی خصوصیت ذمیوں کے حقوق

ہیں دنیا میں کسی گورنمنٹ نے کبھی کسی غیر قوم کو نہیں دیئے یورپ جس کو اپنے قانون انصاف پر بڑا ناز ہے۔ بیشک زبانی دعویٰ کر سکتا ہے۔ لیکن عملی مثالیں نہیں پیش کر سکتا۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ کے یہ احکام۔ اسلامی گورنمنٹوں میں عموماً نافذ تھے اور خاصکر ہارون الرشید کی وسیع حکومت انہیں احکام پر قائم تھی۔

سب سے بڑا مسئلہ قتل و قصاص کا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ذمیوں کا خون مسلمانوں کے خون کے برابر ہے۔ یعنی اگر مسلمان۔ ذمی کو عمداً قتل کر ڈالے تو مسلمان بھی اُس کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ اور اگر غلطی سے قتل کیا ہے تو جو خون بہا مسلمان کے قتل بالخطا سے لازم آتا ہے وہی ذمی کے قتل سے بھی لازم آئیگا۔

تذکرہ امام رازی نے اپنی کتاب مناقب الشافعی میں حنفیوں کو طعنہ دیا ہے کہ اُنکے نزدیک ابوبکر صدیقؓ کا خون اور ایک ذلیل ذمی کا خون برابر ہے۔ یعنی اگر ابوبکر صدیقؓ بجرم کسی ذمی کو قتل کر ڈالتے تو حنفیوں کے نزدیک وہ بھی قتل کئے جانے کے مستحق تھے۔" حنفیوں نے اس مسئلہ کی تعمیم میں کہیں یہ مثال نہیں دی ہے۔ امام رازی نے اس غرض سے کہ وہ اس مسئلہ کو بدنما کر کے دکھائیں خود یہ مثال فرض کی ہے۔ لیکن ہم فخر کے ساتھ اس طعنہ کو قبول کرتے ہیں۔ بے شبہہ انصاف اور حق کی حکومت میں۔ شاہ و گدا۔ مقبول و مردود کا ایک رتبہ ہے۔ بے شبہہ یہ اسلام کی بڑی فیاضی ہے کہ اُس نے اپنی رعایا کو اپنی برابر سمجھا۔ اسلام کو اس انصاف پر ناز ہو سکتا ہے۔ اگر امام رازی کو عار آتی ہے تو آئے خود صحابہ کا کیا قول اور کیا عمل تھا؟ حضرت علیؓ کا قول ہے من کانت لہ ذمتنا فدمہ کدمنا ودیتہ کدیتنا" یعنی ذمی کا خون ہمارا خون ہے اور اُس کی دیت ہماری دیت ہے۔" حضرت علیؓ پر موقوف نہیں تمام مہاجرین و انصار کا یہی قول تھا اور اسی پر عمل تھا عبیداللہ جو حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند تھے۔ اُنہوں نے حضرت عمرؓ کے زخمی ہونے کے وقت دو شخصوں کو جو کافر تھے اور جن پر اُن کو شبہہ تھا قتل کر ڈالا۔ جب حضرت عثمانؓ مسندِ خلافت پر بیٹھے تو انہوں نے مہاجرین و انصار کو بُلایا اور اس بارہ میں رائے پوچھی۔ تمام مہاجرین نے بالاتفاق کہا کہ عبیداللہ کو قتل کرنا چاہیئے۔

۵۱؎ اس طرح یورپ کی کالے گورے کی تفریق شافعیوں کو ٹھنڈے دل سے ماننی پڑے گی۔ اللھم ۱۲ محشی

امام ابو حنیفہ نے ذمیوں کے لئے اور جو قواعد مقرر کئے وہ نہایت فیاضانہ قواعد ہیں وہ تجارت میں مسلمانوں کی طرح آزاد ہیں۔ ہر قسم کی تجارت کر سکتے ہیں۔ اور اُن سے اُسی شرح سے ٹیکس لیا جائیگا۔ جس طرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ جزیہ جو اُن کی محافظت کا ٹیکس ہے اُس کی شرح حسب حیثیت قائم کیجائیگی۔ مفلس شخص جزیہ سے بالکل معاف ہے اگر کوئی شخص جزیہ کا باقیدار ہو کر مرجاوے تو جزیہ ساقط ہو جائے گا۔ ذمیوں کے معاملات اُنہیں کی شریعت کے موافق فیصل کئے جائینگے۔ یہانتک کہ مثلاً اگر کسی مجوسی نے اپنی بیٹی سے نکاح کیا تو اسلامی گورنمنٹ اِس نکاح کو اُس کی شریعت کے موافق صحیح تسلیم کرے گی۔ ذمیوں کی شہادت اُن کے باہمی مقدمات میں مقبول ہوگی۔ ذمیوں کی اعزازی حالت یہ ہے کہ وہ حرم محترم میں جا سکتے ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہو سکتے ہیں تمام مسجدوں میں بغیر اجازت حاصل کرنے کے داخل ہو سکتے ہیں بجز اُن خاص شہروں کے جو مسلمانوں نے آباد کئے ہیں ہر جگہ وہ اپنی عبادت گاہ بنا سکتے ہیں۔ وہ اگر حربی کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیں تو سپہ سالار اُن پر اعتماد کر سکتا ہے۔ اور اُن سے ہر طرح کی اعانت لے سکتا ہے۔

اِس قسم کے اور احکام ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے عموماً تمام معاملات میں ذمیوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر قرار دیئے ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ بعض امور میں تو اُنہوں نے اعتدال سے زیادہ فیاضی کی ہے۔ مثلاً اس امر میں کہ ذمی کس حالت میں عہد سے باہر ہو جاتا ہے۔ اُن کا مذہب ہے کہ بجز اُس حالت کے کہ اُن کے پاس جمعیت ہو اور وہ گورنمنٹ سے بمقابلہ پیش آئیں۔ اور کسی صورت میں اُن کے حقوق باطل نہیں ہوتے مثلاً اگر کوئی ذمی جزیہ نہ ادا کرے۔ یا مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو۔ یا کافروں کی جاسوسی کرے۔ یا کسی مسلمان کو کفر کی ترغیب دے۔ یا خدا اور رسولؐ کی شان میں بے ادبی کرے۔ تو ان تمام حالتوں میں وہ سزا کا مستحق ہوگا لیکن باغی نہ سمجھا جائیگا اور اُس کے حقوق باطل نہ ہوں گے۔

اَب اِس کے مقابلہ میں اور ائمہ کے مسائل دیکھو امام شافعی کے نزدیک کسی مسلمان نے

گو بے جرم اور عمداً کسی ذمی کو قتل کیا ہوتا ہم وہ قصاص سے بری رہیگا صرف دیت دینی ہوگی یعنے مالی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ وہ بھی مسلمان کی دیت کی ایک ثلث۔ اور امام مالک کے نزدیک نصف۔ تجارت میں یہ سختی ہے کہ ذمی اگر تجارت کا مال ایک شہر سے دوسرے شہر کو لیجاوے تو سال میں جتنی بار لیجاوے ہر بار اُس سے نیا ٹیکس لیا جاوے گا۔

جزیہ کے متعلق امام شافعی کا مذہب ہے کہ کسی حال میں ایک اشرفی سے کم نہیں ہوسکتا اور بوڑھے۔ اندھے۔ اپاہج۔ مفلس۔ تارک الدنیا۔ تک اُس سے معاف نہیں بلکہ امام شافعی سے ایک اور روائیت ہے کہ جو شخص مفلس ہونے کی وجہ سے جزیہ نہیں ادا کرسکتا وہ اسلام کی عملداری میں نہ رہنے پاوے۔ خراج جو اُن پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مقرر کیا گیا تھا اُس پر اضافہ ہوسکتا ہے مگر کسی صورت میں کمی نہیں ہوسکتی۔ ذمیوں کی شہادت گو فریقین مقدمہ ذمی ہوں کسی حال میں مقبول نہیں۔ اس مسئلہ میں امام مالک و امام شافعی دونوں متفق الرائے ہیں ذمی کبھی حرم میں نہیں داخل ہوسکتا۔ اور نہ وہ مکہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہوسکتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک عام مسجدوں میں اجازت کے ساتھ داخل ہوسکتا ہے لیکن امام مالک اور امام حنبل کے نزدیک اُس کو بالکل اجازت نہیں مل سکتی۔ ذمی۔ اسلامی حدود حکومت میں کہیں اپنی عبادت گاہ نہیں بنا سکتا ہے۔ ذمیوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ اسلامی فوج میں شریک نہیں ہوسکتے۔ ذمی اگر کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے یا کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو تو اُسی وقت اُس کے تمام حقوق باطل ہوجاوینگے اور وہ کافر حربی سمجھا جائیگا۔ یہ احکام بھی عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ خاص ہیں ورنہ امام شافعی کے نزدیک بُت پرستوں کو جزیہ ادا کرنے پر بھی اسلامی حدوں میں رہنے کی اجازت نہیں۔

یہ تمام احکام ایسے سخت ہیں جن کا تحمل ایک ضعیف سے ضعیف محکوم قوم بھی نہیں کرسکتی اور یہی وجہ ہے کہ امام شافعی وغیرہ کا مذہب سلطنت کے ساتھ نہ نبہ سکا۔ مصر میں بے شبہہ ایک مدت تک گورنمنٹ کا مذہب شافعی تھا۔ لیکن اُس کا یہ نتیجہ تھا کہ عیسائی اور یہودی قومیں اکثر بغاوت کرتی رہیں۔

اِس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں ذمیوں کے متعلق چند ایسے احکام بھی مذکور ہیں جو نہایت سختی اور تنگ دلی پر مبنی ہیں اور چونکہ وہ اِس طریقہ سے ظاہر کئے گئے ہیں کہ گویا وہ خاص امام ابوحنیفہ کے مسائل ہیں اس لئے غیر قوموں کو مذہب حنفی پر بلکہ عموماً مذہب اسلام پر حملہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ ھدایہ میں ہے کہ "ذمیوں کو ضرور ہے کہ وہ وضع اور لباس میں مسلمانوں کی ہمسری نہ کریں۔ وہ گھوڑوں پر نہ سوار ہوں ہتھیار نہ لگائیں۔ زنار پہنیں۔ اُن کے گھروں پر علامت بنا دی جاوے جس سے ظاہر ہو کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں" وغیرہ وغیرہ صاحب ہدایہ نے اِن احکام کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ذمیوں کی تحقیر ضروری ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں اِس سے بھی زیادہ سخت و بے رحمانہ احکام ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہے متاخرین فقہا کی ایجاد ہے ورنہ امام ابوحنیفہ کا دامن اِس داغ سے پاک ہے۔

امام ابوحنیفہ سے جو کچھ اس باب میں مروی ہے وہ صرف اسقدر[1] ہے کہ ذمی زنار باندھیں اور ایسے زین پر سوار ہوں جن کی شکل تھیلی کی سی ہوتی ہے۔ البتہ قاضی ابویوسف صاحب[2] نے بعض اور احکام اس پر بڑھائے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ذمی مسلمانوں کے ساتھ وضع قطع لباس سواری میں مشابہت نہ اختیار کریں۔ اور لمبی ٹوپیاں اوڑھیں اور اُن کے زین کے آگے گول لکڑی ہو اور اُن کی جوتیوں کے تسمے دوہرے ہوں اور اُن کی عورتیں کجاؤں پر نہ سوار ہوں۔ قاضی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے بارہ میں یہی احکام صادر کئے تھے۔ اور اُس کی وجہ خود حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ذمیوں کی وضع مسلمانوں کی وضع سے الگ رہے۔

بلاشبہہ یہ حضرت عمرؓ کے احکام ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ احکام ذمیوں کی تحقیر کی وجہ سے صادر ہوئے تھے سخت غلطی ہے۔ افسوس ہے کہ اس غلطی کا ارتکاب اکثر متاخرین فقہا نے کیا بے شبہہ حضرت عمرؓ کا ایک طبعی مذاق تھا کہ وہ قومی امتیاز کو پسند کرتے تھے۔ اُنھوں نے اہل فوج کو اکثر فرمانوں میں لکھا ہے کہ "وہ جاڑوں میں دھوپ کھانا نہ چھوڑیں۔ گھوڑوں پر رکاب کے سہارے سے سوار نہ ہوں۔ موٹے کپڑے استعمال کریں"، جس سے مقصد

[1] دیکھو جامع صغیر امام محمد ۱۲ [2] قاضی ابویوسف صاحب نے یہ احکام کتاب الخراج میں لکھے ہیں ۱۲

یہ تھا کہ اہل عرب اپنے مُلک اور وطن کی خصوصیتوں کو محفوظ رکھیں۔ اسی بنا پر اُنہوں نے اہل عجم کو جنہوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا تاکید کی کہ وہ اپنی قومی خصوصیتوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اہل عجم زمانۂ اسلام سے پہلے زنّار باندھتے تھے۔ لمبی ٹوپیاں اوڑھتے تھے۔ اُن کے زین آجکل کے انگریزی زین کے مشابہ ہوتے تھے اُن کی عورتیں اونٹوں پر نہیں سوار ہوتی تھیں چنانچہ انہیں رسوم وعادات کی نسبت حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اہل ذمہ اُسکی پابندی کریں۔ یہی احکام ابو حنیفہ اور قاضی ابو یوسف نے قائم رکھے۔ جن کا مقصد صرف اسقدر ہے کہ دونوں قومیں اپنی خصوصیات پر قائم ہیں۔

البتہ امام ابو حنیفہ نے یہ حکم دیا ہے کہ اہل ذمہ اسلامی شہروں میں اپنی عبادتگاہیں نہ بنائیں لیکن اُن کا مقصد صرف اسقدر تھا کہ امن وامان میں خلل نہ ہو اور مسلمان رعایا جو اکثر عرب کی نسل سے تھے اور ناقوس کی صداؤں سے اُن کے کان آشنا نہ تھے فساد پر نہ آمادہ ہوں۔ اس حکم نے ذمیوں کے حق میں چنداں دقت بھی نہیں پیدا کی۔ مسلمانوں نے جو شہر آباد کئے وہ دو چار شہر سے زیادہ نہ تھے باقی تمام مُلک اُنہیں شہروں سے معمور تھا جو غیر قوموں کے آباد کئے ہوئے تھے اور جہاں ذمیوں کو عموماً عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت تھی۔ اسلامی شہروں میں بھی یہ قید اُسوقت تک قائم رہی جب تک فتنہ کا احتمال رہا۔ جب یہ خوف جاتا رہا تو ذمیوں کو عام اجازت مل گئی۔ چنانچہ بغداد میں جو خاص اسلامی شہر تھا۔ سیکڑوں ہزاروں چرچ اور گرجے تعمیر ہوئے۔

پانچویں خصوصیت فقہ حنفی کا نصوص شرعی سے مطابق ہونا

(۵) ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو احکام نصوص سے ماخوذ ہیں اور جن میں ائمہ کا اختلاف ہے اُن میں امام ابو حنیفہ جو پہلو اختیار کرتے ہیں وہ عموماً نہائیت قوی اور مدلّل ہوتا ہے نص کا لفظ قرآن۔ حدیث دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے وہ احکام بھی نصی کہے جاتے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ صرف حدیث سے ثابت ہیں لیکن اس موقع پر ہم اُن سے بحث نہیں کر سکتے۔ اور اُس کی مختلف وجوہ ہیں اوّل تو یہ کہ اس قسم کے مسائل نہائیت کثرت سے ہیں جن کا مختصر سے مختصر حصہ بھی اس کتاب میں آ نہیں سکتا۔ اگر چند مسائل نمونہ کے طور پر بیان کئے جائیں تو بدگمانوں کو اس سوءظن کا موقع باقی رہتا ہے کہ چند قوی

۱؎ خلیفہ منصور نے اپنے درباریوں کو اسی قسم کی ٹوپیاں اوڑھنے پر مجبور کیا تھا جسکی نسبت مورخین لکھتے ہیں کہ منصور نے عجم کی تقلید کی [illegible]

مسائل لے لئے اور ضعیف چھوڑ دیئے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ آج ان مسائل کا فیصلہ مجتہدانہ نہیں ہو سکتا۔ حدیث کے متعلق بہت بڑی بحث صحت و عدم صحت کی پیدا ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے مسائل فقہ میں ائمہ کو مختلف الآرا کر دیا ہے ایک امام کے نزدیک ایک حدیث قابل حجت ہے دوسرے کے نزدیک نہیں اس بحث کے تصفیہ کے لئے جو سامان ہمارے ملک میں موجود ہے وہ بالکل ناکافی ہے اور اُس سے کسی حدیث کی نسبت مجتہدانہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑا مرحلہ اسماء الرجال کا ہے اس فن کی جو کتابیں ہمارے ملک میں موجود ہیں مثلاً تہذیب الکمال مزی۔ تہذیب التہذیب۔ میزان الاعتدال طبقات الحفاظ۔ تہذیب الاسماء۔ واللغات وغیرہ ان میں جرح و تعدیل کے متعلق ائمہ کے جو اقوال مذکور ہیں اکثر اُن کا سلسلۂ سند مذکور نہیں اس لئے محدثانہ حیثیت سے اُس کے ثبوت و عدم ثبوت کا تصفیہ نہیں ہو سکتا اس کے علاوہ اکثر جروح مبہم ہیں اور جن جرحوں کو مفسر قرار دیا ہے۔ وہ بھی ابہام سے خالی نہیں۔ قدما نے اس فن میں جو تصنیفات لکھیں اُن سے بے شبہ یہ مباحث طے ہو سکتے ہیں لیکن وہ یہاں میسر نہیں آتیں علمائے حنفیہ نے خاص اس بحث پر کہ حنفی فقہ کے مسائل احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ بہت سی کتابیں لکھی ہیں جس کو زیادہ شوق ہو اُن تصنیفات کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

لیکن قرآن مجید میں اس بحث کا بڑا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن کے ثبوت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نزاع کا مدار صرف اس پر رہجاتا ہے کہ جو مسئلہ اُس سے مستنبط کیا گیا۔ صحیح طور پر کیا گیا۔ یا نہیں اس حالت میں بحث مختصر رہجاتی ہے اور نہایت آسانی سے اُس کا تصفیہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید سے جو احکام ثابت ہیں اُن کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے اور وہ فقہ کے مہمات مسائل ہیں اس لئے اگر یہ ثابت ہو کہ حنفی فقہ کے مسائل نصوص قرآن سے زیادہ مطابق ہیں تو مہمات مسائل میں فقہ حنفی کی ترجیح بآسانی ثابت ہو جائیگی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جائیگا۔ کہ امام ابو حنیفہ کو حیثیت اجتہاد میں تمام ائمہ پر ترجیح ہے کیوں کہ اجتہاد کا مدار زیادہ تر استنباط اور استخراج ہی پر ہے۔

ان وجوہ کی بناپر۔ اگرچہ ہم صرف اُن مسائل پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو قرآن سے ثابت

اس بنا کی بنا کی
ترجیح فقہ حنفی

کے مسائل حدیث کے مخالف ہیں

ہیں تاہم حدیث کے متعلق ایک اجمالی بحث ضرور ہے۔ جس سے بدگمانوں کو سوء ظن کا موقع نہ ہو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام صاحب کے بہت سے مسایل احادیث صحیحہ کے مخالف ہیں ان لوگوں میں سے بعض نے الزام دیا ہے کہ امام صاحب نے دانستہ حدیث کی مخالفت کی۔ بعض انصاف پسند وجہ یہ بتاتے ہیں کہ امام صاحب کے زمانہ تک احادیث کا استقصاء نہیں کیا گیا تھا اس لئے بہت سی حدیثیں اُن کو نہیں پہنچیں لیکن یہ خیال محض لغو اور بے سرو پا ہے امام صاحب کے زمانہ تک تو حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں لیکن جب جمع ہو چکیں اُسوقت بڑے بڑے محدثین اُن کے مسایل کو کیوں تسلیم کرتے رہے۔ وکیع بن الجراح جنکی روایتیں صحیح بخاری میں بکثرت موجود ہیں اور جن کی نسبت امام بن احمد حنبل کہا کرتے تھے کہ میں نے اُن سے بڑھ کر کسی کو حافظ العلم نہیں دیکھا وہ امام ابوحنیفہ کے مسائل کی تقلید کرتے تھے خطیب بغدادی نے اُن کے حال میں لکھا ہے۔ کان یفتی بقول ابی حنیفہ یحیی بن سعید بن القطان جو فن جرح و تعدیل کے موجد ہیں اکثر مسائل میں امام ابوحنیفہ کے پیرو تھے خود اُن کا قول ہے قد اخذ نا باکثر اقواله امام طحاوی جو حافظ الحدیث تھے اور مجتہد فی المذہب کا درجہ رکھتے تھے۔ پہلے شافعی تھے۔ پھر امام ابوحنیفہ کے مسایل اختیار کئے اور کہا کرتے تھے کہ میں ابوحنیفہ کا مقلد نہیں ہوں بلکہ مجھ کو اُن سے توارد ہے طحاوی۔ امام بخاری و مسلم کے ہمزمان ہیں اور یہ وہ زمانہ ہے جب حدیث کا دفتر کامل طور سے مرتب ہو گیا تھا۔ متاخرین میں علامہ ماردینی۔ حافظ زیلعی۔ ابن الہمام۔ قاسم بن قطلوبغا وغیرہم کی نسبت قلت نظر کا کون گمان کرسکتا ہے؟ یہ لوگ عموماً حنفی مسائل کے حامی ہیں۔

اس کے علاوہ جو لوگ عموماً حافظ الحدیث تسلیم کئے گئے ہیں اُن کے مسایل امام ابوحنیفہ سے کیوں موافق ہیں؟ طبقہ اولے میں سب سے بڑے محدث امام احمد حنبل ہیں جن کی شاگردی پر بخاری و مسلم کو ناز تھا۔ اور جن کی نسبت محدثین کا عام قول ہے کہ "جس حدیث کو احمد حنبل نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں" امام احمد حنبل بہت سے مسائل میں امام شافعی کے مخالف اور امام ابوحنیفہ کے موافق ہیں۔ خوارزمی نے لکھا ہے کہ فروع و جزئیات چھوڑ کر اُمہات فقہ کے متعلق ایک سو پچیس مسئلوں میں اُن کو امام ابوحنیفہ کے ساتھ اتفاق

سلہ مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ ترجمۂ وکیع بن الجراح ۱۲ سلہ تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر ترجمہ امام ابوحنیفہ ۱۲

ہے اور امام شافعی سے اختلاف، ہم نے خود بہت سے مسائل میں تطبیق کی ہے۔ جس سے خوارزمی کے دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ سفیان ثوری امام احمد حنبل کو محدثین نے امام الحدیث تسلیم کیا ہے اُن کے مسائل امام ابو حنیفہ کے مسائل کے موافق ہیں۔ قاضی ابو یوسف کہا کرتے تھے کہ۔ واللہ سفیان اکثر متابعۃ منی لابی حنیفۃ یعنی "خدا کی قسم سفیان مجھ سے زیادہ ابو حنیفہ کی پیروی کرتے ہیں"۔ صحیح ترمذی میں سفیان ثوری کے مسائل مذکور ہیں۔ جو زیادہ تر شافعی کے مخالف اور ابو حنیفہ کے موافق ہیں۔

اس خیال کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض محدثین مثلاً امام بخاری ابن ابی شیبہ نے امام ابو حنیفہ کے متعدد مسائل کی نسبت تصریح کی ہے کہ حدیث کے خلاف ہیں ابن ابی شیبہ نے امام ابو حنیفہ کے رد میں ایک مستقل باب لکھا ہے لیکن یہ خیال کرنیوالوں کی کوتاہ نظری ہے۔ اکثر ائمہ نے ایک دوسرے پر جرح و اعتراض کیا ہے امام شافعی امام مالک کے بااخلاص شاگرد تھے اور کہا کرتے تھے کہ "آسمان کے نیچے موطای امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں"۔ باوجود اس کے اُنھوں نے امام مالک کی ردّ میں ایک مستقل رسالہ لکھا جس میں دعویٰ کیا ہے کہ امام مالک کے بہت سے مسائل احادیث صحیحہ کے خلاف ہیں۔ امام رازی نے مناقب الشافعی میں اس رسالہ کا دیباچہ نقل کیا ہے اور خود ہماری نظر سے گذرا ہے لیث بن سعد جو مشہور محدث ہیں کہا کرتے تھے کہ امام مالک نے ستتر مسئلوں میں حدیث کی مخالفت کی۔ چنانچہ میرا ارادہ ہے کہ مَیں اُن کو اس امر کی نسبت خط لکھوں[۱]"۔ امام شافعی بھی اس اعتراض سے نہیں بچے اور کیونکر بچ سکتے تھے۔ جہر بسم اللہ و قنوت فی الفجر و ترک توریث ذی الارحام وغیرہ مسائل میں اُن کا مذہب صریح حدیثوں کے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اجتہادی امور ہیں اور اُن کی بناء پر ہم کسی کو مخالف حدیث نہیں کہہ سکتے۔ جس حدیث کو ایک مجتہد صحیح سمجھتا ہے ضرور نہیں کہ وہ دوسرے مجتہد کے نزدیک بھی صحیح ہو۔

پھر اس مرحلہ کے طے ہونے کے بعد استنباط و استدلال کی بحث باقی رہتی ہے جس میں مجتہدین بہت کم متفق الرائے ہو سکتے ہیں کیونکہ استنباط و استدلال کے اصول جداگانہ ہیں

[۱] اس قول کو حافظ ابو المحاسن نے قلائد العقیان میں نقل کیا ہے ۱۲

امام بخاری کا جزءالقرءۃ ہم نے دیکھا ہے۔ جامع صحیح ہیں۔ جہاں وہ امام ابوحنیفہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اُس سے بھی ہم واقف ہیں۔ بے شبہ ان مسئلوں میں امام بخاری کا دعویٰ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب حدیث کے مخالف ہے لیکن امام بخاری کی تحریر اور امام ابوحنیفہ کا فتویٰ دونوں ہمارے سامنے ہیں اور ہم خود سمجھ سکتے ہیں کہ اُن مسایل میں امام صاحب کا مذہب حدیث کے مخالف ہے۔ یا امام بخاری کی فہم و اجتہاد کے مخالف ہے۔

قرأت فاتحہ کے مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا استدلال اس آیت پر ہے۔ واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا امام بخاری جزءالقرأۃ میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت خطبہ کے بارہ میں اُتری ہے یعنی نماز سے اس کو تعلق نہیں۔ امام بخاری کا یہ جواب کس قدر حیرت انگیز ہے اگر رسالہ جزء القرأۃ خود ہماری نظر سے نہ گذرا ہوتا تو ہم کو مشکل سے یقین آتا کہ واقعی یہ امام بخاری کا قول ہے اول تو بیسیوں روایتوں سے ثابت ہے کہ یہ آیت نماز میں اُتری ہے لیکن اگر ہم اُنہی کے قول کو تسلیم کریں تو یہ کون نہیں جانتا کہ موقع ورود کے خاص ہونے سے آیت کا حکم جو صریحی عام ہے۔ خاص نہیں ہوسکتا۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ امام و مقتدی کو آمین آہستہ کہنی چاہئے۔ امام بخاری بخلاف اس کے جہر کے قائل ہیں اور دلیل یہ لاتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو" لیکن اس حدیث میں جہر کا کہاں ذکر ہے۔ اور مطلق آمین کہنے سے تو امام ابوحنیفہ کو بھی انکار نہیں۔ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ نبیذ تمر سے بشرطیکہ مسکر نہ ہو وضو جائز ہے امام بخاری اس کے خلاف ترجمۃ الباب باندھتے ہیں اور حدیث نقل کرتے ہیں کہ کل ما اسکر حرام۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ مقتدی کے لئے قرأۃ فاتحہ ضروری نہیں۔ امام بخاری وجوب کے مدعی ہیں اور جامع صحیح میں باب باندھا ہے کہ" امام و مقتدی پر ہر نماز میں خواہ سفر میں ہو یا حضر میں۔ نماز خواہ جہری ہو یا سرّی قراءت واجب ہے۔ اس دعویٰ پر وجہیں پیش کی ہیں ایک یہ کہ" کوفہ والوں نے حضرت عمرؓ کے پاس سعد بن ابی وقاص کی شکایت کی حضرت عمرؓ نے اُن کو معزول کردیا۔ اور بجائے اُن کے عمار کو مقرر کیا۔ کوفہ والے عمار کے

بھی شاکی ہوئے کہ اُن کو تو نماز پڑھنی بھی نہیں آتی۔ حضرت عمرؓ نے عمار کو بُلا بھیجا۔ اور اُن سے کہا کہ ان لوگوں کا یہ گمان ہے۔ عمار نے کہا واللہ میں اُن کے ساتھ رسول اللہؐ کی سی نماز پڑھتا تھا اور اُس سے کچھ کم نہیں کرتا تھا۔ میں عشاء کی نماز پڑھتا تھا تو پہلی دو رکعتوں میں دیر تک قیام کرتا تھا۔ اور دو اخیر کی رکعتوں میں تخفیف کرتا تھا"

اس حدیث سے قرأت فاتحہ کا وجوب کیونکر ثابت ہُوا حافظ ابن حجر وغیرہ نے جو تاویلیں کی ہیں اُن سے اگر بہزار وقت وجوب پر استدلال بھی ہو تو کیا اُس کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث کی مخالفت کی۔!!

حقیقت یہ ہے کہ کسی مجتہد کی نسبت یہ خیال کرنا کہ اُس کو احکام کے متعلق حدیثیں نہیں پہنچیں سخت غلطی ہے لیکن چونکہ حدیثوں کا معیار صحت وجوہ استنباط۔ طرق استدلال تمام مجتہدین کے نزدیک متحد نہیں۔ اس لئے مسایل میں اختلاف کا پیدا ہونا۔ ضرور تھا

اب ہم اس ضمنی بحث کو چھوڑ کر اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید کی تمام آئیتیں جن سے کوئی مسئلہ فقہی مستنبط کیا گیا ہے۔ اُن کے وہی معنی صحیح اور واجب العمل ہیں۔ جو امام ابو حنیفہ نے قرار دئیے ہیں۔ قرآن مجید میں احکام کی آئیتیں سَو سے متجاوز ہیں اس لئے ہم اُن کا استقصاء تو نہیں کر سکتے البتہ مثال کے طور پر متعدد مسایل کا ذکر کرتے ہیں جن سے ایک عام اجمالی خیال قائم ہو سکتا ہے۔

فرائض وضو

امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ وضو میں چار فرض ہیں۔ امام شافعی دو فرض اور اضافہ کرتے ہیں یعنی نیت اور ترتیب امام مالک بجائے ان کے موالات کو فرض کہتے ہیں۔ امام احمد حنبل کا مذہب ہے کہ وضو کے وقت بسم اللہ کہنا ضرور ہے۔ اور اگر قصداً نہ کہا تو وضو باطل ہے امام صاحب کا استدلال ہے کہ آئیت میں صرف چار حکم مذکور ہیں۔ اسلئے جو چیز ان احکام کے علاوہ ہے وہ فرض نہیں ہو سکتی۔ نیت و موالاۃ و تسمیہ کا تو آئیت میں کہیں وجود نہیں۔ ترتیب کا گمان البتہ واؤ کے حرف سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن علمائے عربیت نے متفقاً طے کر دیا ہے کہ واؤ کے مفہوم میں ترتیب داخل نہیں۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں ترتیب کی فرضیت کے لئے متعدد دلیلیں پیش کی ہیں۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ اُن کا رتبہ تاویل سے بڑھکر نہیں۔ بڑا استدلال یہ ہے کہ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ میں حرف فا تعقیب کے لئے ہے جس سے اسقدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ مُنہ کا پہلے دھونا فرض ہے اور جب ایک رکن میں ترتیب ثابت ہوئی تو باقی ارکان میں بھی ہونی چاہئے۔ دوسری دلیل یکھی ہے کہ وضو کا حکم خلاف عقل حکم ہے اسلئے اُس کی تعمیل بھی اُسی ترتیب سے فرض ہونا چاہئے جس طرح آیت میں مذکور ہے کیونکہ وضو کا حکم جس طرح خلاف عقل ہے۔ ترتیب بھی خلاف عقل ہے۔ امام رازی کی یہ دلیلیں جس رُتبہ کی ہیں خود ظاہر ہیں اُس پر ردّ و قدح کی ضرورت نہیں۔

عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ امام شافعی اسکے مخالف ہیں اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ وَاِنْ کُنْتُمْ مَرْضٰی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَائِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَیَمَّمُوْا یعنی اگر تم بیمار ہو۔ یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص غائط[1] سے آئے یا تم نے عورت کو چھُوا ہو۔ اور تم کو پانی نہ ملے تو تم تیمم کرو۔

امام صاحب فرماتے ہیں کہ "عورت کے چھونے سے جماع و مقاربت مُراد ہے اور یہ قرآن مجید کا عام طرز ہے کہ ایسے امور کو صریحاً تعبیر نہیں کرتا" لُطف یہ ہے کہ اسی لفظ کا ہم معنے لفظ "مس" جس کے معنے چھونے کے ہیں۔ خدا نے اس آیت میں جماع کے معنی میں استعمال کیا ہے اور خود امام شافعی تسلیم کرتے ہیں کہ وہاں جماع ہی مقصود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ملامستہ کے ظاہری معنی لینے ایسی غلطی ہے۔ جو ہرگز اہل زبان سے نہیں ہوسکتی اس آیت میں غائط کا لفظ بھی تو ہے اس کو تمام مجتہدین کنایہ قرار دیتے ہیں۔ ورنہ ظاہری معنی لئے جائیں تو لازم آئے کہ جو شخص ہموار زمین سے ہوکر آئے اُس پر وضو کرنا واجب ہو۔

میری رائے میں امام شافعی کا اگرچہ یہ مذہب ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن اُن کا استدلال اس آیت پر نہیں ہے وہ حدیث سے استناد کرتے ہونگے۔ غالباً اُن کے بعد اُن کے مقلدوں نے حنفیہ کے مقابلہ کے لئے آیت سے استدلال

[1] غائط کے معنی ہموار زمین کے ہیں لیکن اُس سے جائے ضرور یعنی پاخانہ مراد ہے ۱۲

کیا اور اُس کو امام شافعی کی طرف منسوب کر دیا۔

ایک تیمم سے کئی فرض اداء ہو سکتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ ایک تیمم سے کئی فرض اداء ہو سکتے ہیں۔ امام مالکؒ شافعیؒ کی رائے ہے کہ ہر فرض کے لئے نیا تیمم کرنا چاہئے۔ امام صاحب کا استدلال ہے کہ جو حیثیت وضو کے حکم کی ہے وہی تیمم کی ہے اور جب ہر نماز کے لئے نئے وضو کی ضرورت نہیں تو تیمم کی تجدید کی بھی ضرورت نہیں البتہ جن لوگوں کا مذہب ہے کہ ایک وضو سے کئی نمازیں نہیں ادا ہو سکتیں وہ تیمم کی نسبت بھی یہ حکم لگا سکتے ہیں لیکن وضو و تیمم میں تفریق کرنی جیسا کہ امام شافعی وغیرہ نے کی محض بے وجہ ہے۔

تیمم کا اثناء نماز میں پانی پر قادر ہونا۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ اثنائے نماز میں تیمم کو اگر پانی ملجائے تو تیمم جاتا رہیگا امام مالک و احمد حنبل اس کے مخالف ہیں امام صاحب کا استدلال یہ ہے کہ قرآن میں تیمم کا جواز اس قید کے ساتھ مشروط ہے کہ لم تجدوا ماءً یعنی جب پانی نہ ملے۔ صورت مذکورہ میں جب شرط باقی نہیں رہی تو مشروط بھی باقی نہیں رہا۔

باب الصلوٰۃ تکبیر تحریمہ جزو نماز نہیں

امام صاحب کا قول ہے کہ تکبیر تحریمہ جزو نماز نہیں اور فارسی زبان میں تکبیر کہنا درست ہے امام شافعی وغیرہ مخالف ہیں۔ امام صاحب کا استدلال ہے کہ جس آیت سے تکبیر کی فرضیت ثابت کی گئی ہے یعنی وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی اُس میں زبان کی کوئی خصوصیت نہیں اور چونکہ وَذَکَرَ الخ پر فاء تعقیب داخل ہے اس لئے نماز کا وجود تکبیر سے موخر ہونا ضرور ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تکبیر گو فرض ہے لیکن نماز میں داخل نہیں۔ اور جزو نماز نہیں۔

مقتدی کو قرأت فاتحہ ضروری نہیں

امام صاحب کا مذہب ہے کہ مقتدی کو قرأت فاتحہ ضروری نہیں۔ امام شافعی و امام بخاری وجوب کے قائل ہیں۔ امام صاحب اس آیت سے استدلال کرتے ہیں واذا قری القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا یعنی جب قرآن پڑھا جاوے تو سنو اور چپکے رہو" اگرچہ اس آیت سے سری نمازوں میں بھی ترک قرأۃ کا حکم ثابت ہوتا ہے[۱] لیکن خاصکر جہری نماز کے لئے تو وہ نص قاطع ہے۔ جس کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ تعجب ہے کہ شافعیہ نے ایسے

[۱] متابعۃ للامام۔ مقتدی اور امام چونکہ سری طور پر آیات پڑھینگے۔ اسلئے طابق النعل بالنعل ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ بطی و سرعۃ فطرتی طور پر ہر ایک شخص میں پڑی ہوئی ہے لہذا یہ حکم سری نمازوں میں بھی ثابت ہوا ۱۲ محشی

صاف اور صریح آیت کے مقابلہ میں حدیثوں سے استدلال کیا ہے حالانکہ حدیثیں جو اس باب میں وارد ہیں خود متعارض ہیں جس درجہ کی وجوب قراءت کی حدیثیں موجود ہیں اُسی درجہ کی ترک قراءت کی بھی ہیں۔

امام بخاری نے اس بحث میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ آیت کے استدلال کا جواب دیں لیکن جواب ایسا دیا ہے جس کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے۔ انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ۔ ترجمہ "یعنی سوائے اس کے نہیں ہے کہ حرام کیا خدا نے تم پر مُردہ کو اور خون کو اور سُور کے گوشت کو اور اُس چیز کو جس پر خدا کے سوا اور کسی کا نام لیا جاوے لیکن جو شخص مجبور ہو بشرطیکہ نافرمان اور حد سے گذر جانیوالا نہ ہو تو اُس پر گناہ نہیں ہے" اس آیت سے بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں جن میں مجتہدین کو باہم اختلاف ہے ان تمام مختلف فیہ مسائل میں امام ابوحنیفہ نے آیت کا جو مطلب قرار دیا ہے وہ صحیح ہے۔

کتاب الحظر والاباحۃ یعنی حلال و حرام کا باب۔

پہلی بحث یہ ہے کہ مُردہ کے کیا معنے ہیں۔ امام ابوحنیفہ وہی عام معنی لیتے ہیں جو عام اطلاق میں شائع ہے امام شافعی نے اس کو بہت وسعت دی ہے یہان تک کہ وہ مُردہ جانور کے بالوں اور ہڈیوں کو بھی مُردہ کہتے ہیں اس بنا پر اُن کی رائے ہے کہ ان چیزوں سے کسی قسم کا تمتع مثلاً پوستین وغیرہ کا استعمال جائز نہیں۔ امام مالک بال اور کھال کا کام میں لانا جائز قرار دیتے ہیں لیکن ہڈی کا استعمال اُن کے نزدیک بھی حرام ہے۔

امام شافعی نے اور امام مالک نے مُردہ کے جو معنے لئے۔ چونکہ صاف غلط معلوم ہوتے ہیں اس لئے اُن کے مقلدوں نے تاویلیں کیں۔ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ "ہڈی کو مُردہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ خدا نے قرآن میں کہا ہے من یحیی العظام یعنی "ہڈی کو کون زندہ کریگا" اور زندہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو پہلے مر چکی ہو اسی طرح خدا نے زمین کو مُردہ کہا ہے"۔ امام رازی کی یہ تاویل نہایت تعجب خیز ہے اس قسم کے اطلاقات مجازی اطلاق ہیں جن پر احکام کی تفریع نہیں ہو سکتی۔ امام رازی نے زمین کا مُردہ ہونا قرآن مجید سے ثابت کیا ہے تو زمین اور خاک کے استعمال کو بھی ناجائز قرار دینا چاہئے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ خون جس کو اس آیت میں حرام کہا ہے اُس سے کیا مُراد ہے امام ابو حنیفہ کے نزدیک وہ دم مسفوح ہے یعنی جس خون میں روانی ہو۔ اس بناء پر وہ مچھلی کے خون کو حرام نہیں کہتے۔ امام شافعی کے نزدیک اس میں کوئی تخصیص نہیں اور ہر قسم کا خون حرام ہے امام صاحب کا استدلال یہ ہے کہ یہ تخصیص خود خدا نے کی ہے۔ چنانچہ دوسرے موقع پر فرمایا ہے۔ قل لا اجد فیما اوحی الی محرمًا علیٰ طاعمٍ یطعمہ الا ان یکون میتۃ او دمًا مسفوحًا اس آیت میں خون کی تحریم کو مسفوح کے ساتھ مقید کر دیا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ باغٍ وعادٍ سے کیا مراد ہے امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ کھانے میں بغاوت وعدوان نہ ہو یعنی جو شخص مجبور ہو اور جاں بلب ہو اُس کو مُردہ وسُور کا گوشت کھانا جائز ہے لیکن اس شرط پر کہ سد رمق سے زیادہ نہ کھائے اور کسی دوسرے مضطر سے چھین کر نہ کھائے۔ امام شافعی بغاوت وعدوان کے یہ معنے لیتے ہیں کہ اس شخص نے سُلطان وقت سے بغاوت نہ کی ہو اور گنہگار نہ ہو اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان شخص جو سلطان وقت سے باغی ہو کسی موقع پر فاقہ سے جاں بلب ہو جائے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اُس کو مُردہ یا سُور کا گوشت بقدر سد رمق کے کھانا جائز ہے۔ بخلاف اس کے امام شافعی کا قول ہے کہ وہ اگر باغی نہ ہوتا تو کھانا جائز تھا لیکن بغاوت کی حالت میں اُس کو یہ اجازت نہیں بلسکتی[1]۔

امام شافعی نے ان الفاظ کے جو معنے لئے اولاً تو سیاق عبارت سے بالکل بیگانہ ہیں دوسرے اصول شرع اُس کی مساعدت نہیں کرتے۔ شریعت نے ضرورت کے وقت جن چیزوں کی رخصت یا اجازت دی ہے وہ کسی جُرم وعصیان سے باطل نہیں ہوتی۔ جھوٹ بولنا گناہ ہے اور بعض حالتوں میں مثلاً جب جان کا خوف ہو اُس کی اجازت دی گئی ہے کیا ایک گناہگار شخص اس اجازت سے متمتع نہیں ہو سکتا؟ صورت متنازعہ میں اگر اُس شخص کو اسلئے کھانے کی اجازت نہیں دی گئی کہ اُس کا ہلاک ہونا ہی بہتر ہے تو حرام کی کیا تخصیص ہے اُسکے لئے تو حلال غذا کی بھی اجازت نہ ہونی چاہئے۔

[1] اللہم۔ خداوند تعالیٰ سے تو باغی کو توبہ کے لئے ایک خاص وقت تک حصہ مل سکے۔ لیکن سلطنۃ کے باغی پر اتنا تشدد!! احالانکہ بغاوۃ السلطنۃ.... فیہ شیٔ ۱۲ محشی

یہ مسائل تو نصی تھے امام ابو حنیفہ نے اس آیت سے ایک قیاسی مسئلہ قائم کیا ہے اور امام شافعی نے اُس سے مخالفت کی ہے یعنی ایک شخص پیاس سے جاں بلب ہو اور بجز شراب کے اور کوئی چیز مل نہ سکے تو اُس کو شراب پینے کی اجازت ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ہے اور امام شافعی کے نزدیک نہیں۔ امام شافعی اگر ظاہریوں کی طرح قیاس کے منکر ہوتے تو اس جواب سے کچھ تعجب نہ ہوتا۔ لیکن قیاس کے قایل ہو کر یہ مخالفت محل تعجب ہے کیونکہ یہ حالت اور جس حالت کا ذکر قرآن میں صریحاً ہے دونوں کی علت مشترک ہے یعنی حفاظت نفس۔ پھر حکم کے نہ مشترک ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

باب الجنایات

جنایات کے باب میں جو احکام قرآن مجید میں وارد ہیں۔ اُن کی تعبیر جس صحت کے ساتھ امام ابو حنیفہ نے کی کسی دوسرے مجتہد نے نہیں کی۔ زمانۂ جاہلیت میں قصاص کے جو قاعدے رائج تھے نہائیت ناانصافی اور جہالت پر مبنی تھے۔ اسلام نے نہائیت خوبی سے اُس کی اصلاح کی اور ایسے احکام مقرر کئے جن سے بڑھ کر کبھی ہوئے نہ ہو سکتے۔ جاہلیتہ میں قصاص کا اعتبار مقتول و قاتل کی حیثیت سے کیا جاتا تھا۔ جو معزز قبیلے تھے۔ وہ دوسرے قبیلوں سے اس طرح قصاص لیتے تھے کہ اپنے غلام کے بدلے دوسرے قبیلہ کے آزاد کو اپنی عورت کے بدلے اُن کے مرد کو اور اپنے مرد کے بدلے دوسرے قبیلہ کے دو مردوں کو قتل کرتے تھے خدا نے قصاص کا عام حکم صادر فرمایا جس کا یہ مطلب ہے کہ قصاص کا حکم کسی قید کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ قاتل ہر حالت میں مقتول کے بدلے مارا جائے گا خواہ شریف ہو یا رذیل۔ مرد ہو۔ یا عورت۔ غلام ہو یا آزاد۔ مسلم ہو یا ذمی۔ زیادہ توضیح کے لئے اُن صورتوں کی خاص طرح پر بھی نفی کی جو عرب میں اسلام سے پہلے جاری تھیں چنانچہ ارشاد فرمایا کہ کتب علیکم القصاص فی القتل الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ ترجمہ۔ یعنی "تم پر مقتولوں کے بارہ میں قصاص فرض کیا گیا آزاد۔ آزاد کے بدلے غلام غلام کے بدلے عورت۔ عورت کے بدلے"۔

زمانہ جاہلیتہ میں یہ بھی دستور تھا کہ قتل عمد کے بارہ میں مالی معاوضہ دیدینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور اُس کو دیت کہتے تھے اسلام نے اُس کو باطل کیا اور دیت کو جو ایک قسم کا جرمانہ ہے صرف شبہ عمد اور قتل خطاء کی حالت میں جایز رکھا۔ اور اُس کی مقدار مسلمان و ذمی کے لئے

یکساں مقرر کی۔ چنانچہ خدا نے ارشاد فرمایا کہ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ

ترجمہ۔ یعنی مسلمان کی شان نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کرے۔ مگر غلطی سے اور جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کرے تو اُس کو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اور مقتول کے اہل کو دیّت دینی ہوگی۔ اور اگر مقتول اُس قوم سے ہو کہ تمہارے اور اُن کے درمیان میثاق ہے تو دیّت دینی ہوگی۔ اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا۔

یہ احکام نہائیت صاف اور صریح طور پر قرآن سے ثابت ہوتے ہیں اور امام ابو حنیفہ انہیں احکام کے قائیل ہیں لیکن امام شافعی وغیرہ نے بعض مسائیل میں اختلاف کیا ہے جسکی نسبت ہم افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ یقیناً اُن کی غلطی ہے۔

پہلا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی و امام مالک و احمد حنبل قائیل ہیں کہ "غلام کے بدلے آزاد قتل نہیں کیا جاسکتا"۔ غلام اور آزاد میں ایسا بے رحمانہ تفرقہ کرنا ہرگز قرآن سے ثابت نہیں ہوتا۔ اگر اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ کی تخصیص سے استدلال ہے تو الانثیٰ بالانثیٰ کی تخصیص سے کہ عورت کے بدلے مرد نہ قتل کیا جاوے۔ حالانکہ اس کا کوئی قائیل نہیں۔

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی ذمی کی دیّت مسلمان کی دیّت سے کم قرار دیتے ہیں حالانکہ دیّت کے جو الفاظ خدا نے مومن کے حق میں استعمال کئے وہی اُن لوگوں کے حق میں بھی ارشاد کئے۔ جو مسلمانوں سے میثاق و معاہدہ رکھتے ہیں۔ بے شبہ یہ اسلام کی نہائیت فیاض دلی ہے کہ اُس نے مسلمان و ذمی کا حق برابر رکھا لیکن افسوس ہے کہ ایسے فیاضانہ حکم کی لوگوں نے غلط تاویل کی۔

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی قتل عمد کی حالت میں بھی مالی معاوضہ ادا کرنا کافی سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن مجید میں قتل عمد کی حالت میں قصاص کا حکم ہے دیّت کی کہیں اجازت نہیں اور یہی اقتضائے عقل ہے۔ جاہلیت میں قتل۔ مقدمات دیوانی کی حیثیت رکھتا تھا اور اسوجہ سے مالی معاوضہ اُس کا بدل ہوسکتا تھا۔ لیکن اسلام ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہوسکتا تھا۔

چوتھا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی کیفیت قتل میں مساوات کو لازمی قرار دیتے ہیں یعنی اگر قاتل نے پتھر سے سر پھوڑ کر کسی کو مارا ہو تو وہ بھی پتھر سے سر توڑ کر مارا جائے۔ یا کسی نے آگ سے جلا کر مارا ہو تو وہ بھی آگ سے جلا کر مارا جائے لیکن اس قسم کی مساوات پر قرآن کا کوئی لفظ دلالت نہیں کرتا۔

پانچواں اختلاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قتل عمد کی حالت میں کفارہ لازم نہیں آتا۔ امام شافعی قصاص و کفارہ دونوں لازمی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں کفارہ کا حکم قتل خطا کے ساتھ مخصوص ہے۔ قتل عمد میں کفارہ کا کچھ ذکر نہیں۔

وراثت

وراثت کے بعض احکام میں جو نہایت مہتم بالشان ہیں امام ابوحنیفہ اور امام شافعی میں اختلاف ہے ان مسائل میں امام ابوحنیفہ نے جو پہلو اختیار کیا وہ نہایت صریح طور سے قرآن سے ثابت ہے وراثت کے قاعدے جو اسلام نے مقرر کئے۔ وہ تمام دنیا کے قواعد وراثت سے الگ ہیں اور ایسے دقیق اور نازک اصول پر مبنی ہیں جو علانیہ اس بات کی دلیل ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی اُن احکام کا واضع نہیں ہو سکتا۔ وراثت کا اصلی اصول یہ ہے کہ متوفی اگر اپنی جائداد کسی خاص شخص کو دے جاتا تو اُسی کو ملتی لیکن جب اُس نے کوئی ہدایت نہیں کی تو اُس پر لحاظ ہو گا کہ اس کے فطری تعلقات کن کن لوگوں کے ساتھ کس کس تفاوت کے ساتھ تھے جو لوگ یہ تعلقات رکھتے ہیں وہ اُسی تفاوت درجات کے ساتھ اُس کی جائیداد کے مالک ہونگے گویا متوفی کی یہ معنوی ہدایت ہے کہ لوگوں کو اسی مناسبت سے دیا جائے جس نسبت سے میرے تعلقات اُن کے ساتھ تھے۔ دوسرا اصول جو پولٹیکل اکانمی کا عام اصول ہے یہ ہے کہ دولت کا بہت سے اشخاص میں تقسیم ہونا اس سے اچھا ہے کہ دو ایک شخص تک محدود رہے۔ یہ عمدہ اصول تمام اور قوموں کی نگاہ سے رہ گئے۔ اور اسوجہ سے اُن کا قانون وراثت بھی ناتمام اور محدود رہگیا۔ عیسائیوں کے قانون میں بڑے بیٹے کو جائیداد پہنچتی ہے دوسرے بھائیوں کو کچھ دست برداشتہ ملتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں صرف اولاد ذکور جائیداد کی مالک ہے۔ باپ بھائی وغیرہ محروم مطلق ہیں لیکن اسلام نے نہایت دقت نظر سے اُن نازک تعلقات پر نگاہ کی ورثاء کو متوفی کے ساتھ ہیں اور اُسی نسبت سے تین درجہ

قرار دئے۔ ذوی الفروض۔ عصبات۔ ذوی الارحام۔ ان تینوں درجوں کی تصریح قرآن مجید میں موجود ہے اور خاصکر ذوی الارحام کا ذکر ان آیتوں میں ہے لِلرِّجَالِ نصیب مما ترك الوالدان والاقربون ولکل جعلنا موالی مما ترك الوالدان والاقربون واولی الارحام بعضھم اولی ببعض امام ابوحنیفہ نے توریث کے احکام میں یہ تینوں مراتب قایم رکھے۔ لیکن امام شافعی و امام مالک نے ذوی الارحام کو سرے سے خارج کردیا۔ چنانچہ اُن کے نزدیک نانا۔ بھتیجیاں۔ بھانجے وغیرہ کسی حال میں ورثہ نہیں پاسکتے ان بزرگوں نے ذوی الارحام کو عام سمجھا ہے اور ذوی الفروض۔ وعصبات اُس کے افراد قرار دیئے ہیں۔ جیسا کہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ ایک صریح غلطی ہے۔

نکاح وطلاق

نکاح وطلاق کے متعلق قرآن میں بہت سے احکام مذکور ہیں۔ جن میں سے بعض بعض میں مجتہدین مختلف الآرا ہیں ان اختلافی مسائل میں دو مسئلے نہائیت مہتم بالشان ہیں اور ہم اس موقع پر اُنہیں کا ذکر کرتے ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک گو عورت بالغہ اور عاقلہ ہو تاہم کسی حالت میں بغیر ولی کی ولائیت کے نکاح نہیں کرسکتی امام ابوحنیفہ کے نزدیک بالغہ عاقلہ اپنے نکاح کی آپ مختار ہے اس دعویٰ پر دونوں طرف سے قرآن کی آئیتیں اور حدیثیں پیش کی گئی ہیں۔ احادیث کی بحث کا تو یہ محل نہیں۔ قرآن مجید سے امام شافعی کا جو استدلال ہے اور جس کو خود اُنہوں نے کتاب الام میں بڑے شد و مد سے لکھا ہے وہ اس آئیت پر مبنی ہے۔

واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن

ترجمہ" اور جب تم طلاق دو عورتوں کو اور وہ اپنی مدت کو پہنچیں تو اُن کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کریں"۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ تعضلوھن میں اولیائے نکاح سے خطاب ہے۔ اور اُن کو حکم دیا گیا ہے کہ عورتوں کو نکاح سے نہ روکیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اولیائے نکاح کو روکنے کا حق حاصل ہے۔ ورنہ نہی کی کیا ضرورت ہے"۔ امام شافعی نے اس مطلب کی تائید میں آئیت کی شان نزول کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "معقل بن

یسار نے اپنی بہن کی شادی۔ اپنے چچیرے بھائی سے کردی تھی۔ شوہر نے چندروز کے بعد طلاق دیدی۔ لیکن عدت گذر جانے کے بعد اُس کو ندامت ہوئی اور اُس نے دوبارہ نکاح کرنا چاہا عورت بھی راضی ہوگئی معقل نے سنا تو بہن کے پاس گئے اور کہا کہ میں نے نکاح کردیا تھا اُس نے طلاق دیدی۔ اب میں کبھی اُس سے نکاح نہ ہونے دوں گا۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ امام شافعی نے آیت کے جو معنے لئے اگر ہم نے خود اُن کی کتاب میں اُس کو تصریحاً نہ دیکھا ہوتا تو ہم کو مشکل سے یقین آتا کہ یہ اُنہیں کا قول ہے۔

اوّل ہم کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ آیت کے یہ معنے ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں اسقدر تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ طَلَّقْتُمُ میں شوہروں کی طرف خطاب ہے۔ اور جب یہ مسلم ہے تو ضرور ہے کہ تَعْضُلُوْهُنَّ میں بھی اُنہیں کی طرف خطاب ہو ورنہ عبارت بالکل بے ربط ہوگی کیونکہ اس تقدیر پر آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "اے شوہرو! جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت کو پہنچ چکیں۔ تو اے نکاح کے اولیاء! تم اُن عورتوں کو نکاح سے نہ روکو" اس عبارت کی بے ربطی میں کون شبہہ کرسکتا ہے؟ شرط میں تو شوہروں سے خطاب ہو اور جزاء میں اُن سے کچھ واسطہ نہ رہے۔ اور اولیائے نکاح سے تخاطب کیا جائے۔ یہ کونسا طریقۂ کلام ہے؟ امام رازی باوجودیکہ شافعی ہیں۔ تاہم اُنہوں نے تفسیر کبیر میں صاف تصریح کی ہے کہ "یہ معنی بالکل غلط ہیں۔ اور خدا ایسی بے ربط عبارت بول نہیں سکتا۔ اگر ہم یہ معنی تسلیم بھی کرلیں۔ تو بھی امام شافعی کا استدلال تمام نہیں ہوتا کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ جو شخص ایک کام سے روکا جائے وہ اُس کام کا حق بھی رکھتا ہو۔

اب ہم اس آیت کا صحیح محمل بیان کرتے ہیں۔ جاہلیۃ میں اکثر دستور تھا کہ لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دیتے تھے اور اس غیرت سے کہ جو عورت اُن کے ہم بستر رہ چکی ہے دوسرے کے آغوش میں نہ جانے پائے۔ اُس عورت کو دوسرا نکاح بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ اس بُری رسم کو خدا نے مٹایا اور یہ آیت نازل کی۔ جس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "اے شوہرو۔ جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ چکیں۔ تو اُن کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے (یعنی جن کو اب وہ شوہر بنانا چاہتی ہیں) نکاح کریں" امام ابوحنیفہ نے اس آیت کے

یہی معنی لئے ہیں اور اس سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ عورتیں نکاح کے معاملہ میں خود مختار ہیں۔ اس استدلال کی زیادہ تائید یَنکِحنَ کے لفظ سے ہوتی ہے کیونکہ اس لفظ میں نکاح کے فعل کو عورتوں کی طرف منسوب کیا ہے نہ اولیائے نکاح کی طرف۔

دوسرا مسئلہ تین طلاقوں کا ہے۔ اسقدر تو چاروں ائمہ مجتہدین کے نزدیک مسلم ہے کہ اگر کوئی شخص ایکبار تین طلاق دے تو طلاق واقع ہو جائے گی اور پھر رجعت نہ ہو سکے گی لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس طرح طلاق دینا جائز اور مشروع ہے یا نہیں۔ امام شافعی کے نزدیک مشروع ہے اور خدا نے اُس کی اجازت دی ہے امام ابو حنیفہ کے نزدیک حرام اور ممنوع ہے اور طلاق دینے والا گنہگار ہے۔ امام ابو حنیفہ کا استدلال یہ ہے کہ خدا نے طلاق کا جو طریقہ بتلایا ہے وہ اس آئیت پر محدود ہے۔ الطلاق مرّتان فامساکٌ بمعروفٍ او تسریحٌ باحسان" یعنی طلاق دو بار کر کے ہے پھر یا تو بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یعنی رجعت کر لینا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے" پس اس آئیت میں طلاق کا جو طریقہ بتایا گیا صرف وہی شرعی طلاق ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے امام ابو حنیفہ کے قول پر یہ اعتراض کیا ہے کہ " اگر ایکبار تین طلاق دینا شرعاً جائز نہیں تو اس کے نفاذ کے کیا معنے۔ حالانکہ نفاذ سے امام ابو حنیفہ کو بھی انکار نہیں" اس کا جواب ایک بڑی نازک بحث پر مبنی ہے جس کا یہ موقع نہیں مگر اجمالاً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کسی کام کا ممنوع ہونا دوسری چیز ہے۔ اور نافذ ہونا دوسری چیز ہے۔ باپ کا اولاد کو کم و بیش حصوں میں جائداد ہبہ کرنا۔ شرعاً ممنوع ہے لیکن اگر کوئی ناانصاف باپ ایسا کرے تو اُس کا نفاذ ضرور ہو گا۔

اب ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہم امام ابو حنیفہ کی نسبت یہ عام دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کے مسائل صحیح اور یقینی ہیں۔ امام ابو حنیفہ مجتہد تھے پیغمبر نہ تھے۔ اسی لئے اُن کے مسائل میں غلطی کا ہونا ممکن ہے۔ نہ صرف امکان بلکہ ہم وقوع کا دعویٰ کر سکتے[1]

[1] یہ ہر ایک امام اور مجتہد کیلئے ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جو شخص حق اجتہاد علامہ ہونیکے باعث رکھ سکتا ہے اُسکو یہ پہنچتا ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے ایک فیصلہ کرے لیکن معمولی عالم طالبعلم کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اگر اس خبط میں پڑینگے تو اپنا عزیز وقت جو بہتر سے بہتر مصرف میں آ سکتا ہے چاہ کندن و کاہ برآوردن کی مثل صادق کرینگے وما علینا الا البلاغ ۱۲ محشی مولوی فاضل لاہوری جھنگی

ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خود اُن کے خاص شاگردوں نے بہت سے مسائل میں اُن سے مخالفت کی۔ مدت رضاعت۔ قضاء قاضی کا ظاہراً و باطناً نافذ ہونا۔ قتل بالمثقل۔ نکاح محرمات میں حد کا نہ لازم آنا۔ اِن تمام مسائل میں ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہ کے مذہب کی کوئی صحیح تاویل نہیں ہو سکتی ایسے اور بھی مسائل ہیں۔ لیکن ہمارا مقصد اس موقع پر صرف یہ ہے کہ ایک مجتہد کا جس حد تک صائب الرائے ہونا ممکن ہے امام صاحب اُس حد تک صائب الرائے تھے۔

خاتمہ

امام صاحب کے تلامذہ

ایشیائی ملکوں میں اگرچہ شاگردی اور اُستادی کا تعلق عموماً نہایت قوی تعلق ہوتا ہے لیکن بعض شاگردوں کو مختلف وجوہ سے کچھ ایسی خصوصیت ہو جاتی ہے کہ جہاں اُستاد کا نام آتا ہے ممکن نہیں کہ اُن کا نام نہ آئے۔ جیسا کہ ہم اِس کتاب کے پہلے حصہ میں لکھ آئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی درس تدریس کا دائرہ اسقدر وسیع تھا کہ خلیفہ وقت کی حدود حکومت اس سے زیادہ وسیع نہ تھیں۔ حافظ ابوالمحاسن شافعی نے نو سو اٹھارہ شخصوں کے نام بقید نام و نسب لکھے ہیں جو امام صاحب کے حلقہ درس سے مستفید ہوئے تھے۔ اِس گروہ میں سے چند بزرگ ایسے ہیں جن کی بیوگرفی کے بغیر امام صاحب کی علمی تاریخ ناتمام رہتی ہے۔ چالیس شخص جو امام صاحب کے ساتھ فقہ کی ترتیب و تدوین میں شریک تھے۔ اُن کے شاگرد اور ارادتمند خاص تھے۔ امام صاحب کی زندگی کا بڑا کارنامہ فقہ ہے۔ اِس لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ امام صاحب کی تاریخ میں انہی لوگوں کا ذکر چھوڑ دیا جائے جو ایسے بڑے کام میں اُن کے شریک اور مددگار تھے۔ ان لوگوں کے حالات صرف امام ابوحنیفہ کی

تاریخ سے وابستہ نہیں ہیں۔ بلکہ اُس سے عام طور پر حنفی فقہ کے متعلق ایک اجمالی خیال قائم ہوتا ہے، یعنی ان لوگوں کی عظمت وشان سے فقہ حنفی کی خوبی اور عمدگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی امام صاحب کا بلند رتبہ ہونا ثابت ہوتا ہے کہ جس شخص کے شاگرد اس رتبہ کے ہونگے وہ خود کس پایہ کا ہوگا؟ خطیب بغدادی نے وکیع بن الجراح کے حال میں جو ایک مشہور محدث[1] تھے لکھا ہے کہ ایک موقع پر وکیع کے پاس چند اہل علم جمع تھے۔ کسی نے کہا کہ اِس مسئلہ میں ابو حنیفہ نے غلطی کی۔ وکیع بولے کہ "ابو حنیفہ کیونکر غلطی کر سکتے ہیں!! ابو یوسف و زفر قیاس میں۔ یحییٰ بن زائدۃ حفص بن غیاث حبان ۔ مندل ۔ حدیث میں۔ قاسم بن معن لغت و عربیت میں۔ داؤد الطائی وفضیل بن عیاض زہد و تقویٰ میں۔ اِس رتبہ کے لوگ جس شخص کے ساتھ ہوں وہ کہیں غلطی کر سکتا ہے اور کرتا بھی تو یہ لوگ اُس کو کب غلطی پر رہنے دیتے"۔

شاگرد کا رتبہ واعتراز اُستاد کے لئے باعث فخر خیال کیا جاتا ہے۔ اگر یہ فخر صحیح ہے تو اسلام کی تمام تاریخ میں کوئی شخص امام ابو حنیفہ سے بڑھ کر اس فخر کا مستحق نہیں ہے۔ امام صاحب اگر یہ دعویٰ کرتے تو بالکل بجا تھا کہ جو لوگ امام صاحب کے شاگرد تھے وہ بڑے بڑے ائمہ مجتہدین کے شیخ اور اُستاد تھے امام شافعی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں نے امام محمد سے ایک بار شتر علم حاصل کیا ہے[2]"۔ یہ وہی امام محمد ہیں جو امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں اور جن کی تمام عمر امام صاحب کی حمایت میں صرف ہوئی۔ انصاف یہ ہے کہ امام صاحب کے بعض شاگرد خصوصاً قاضی ابو یوسف۔ و امام محمد۔ اِس رتبہ کے عالم تھے کہ اگر امام ابو حنیفہ کی تبعیت سے الگ ہو کر مستقل اجتہاد کا دعویٰ کرتے تو اُن کا جدا طریقہ قائم ہو جاتا[3]۔ اور امام مالک و شافعی کی طرح اُن کے بھی ہزاروں لاکھوں مقلد بن جاتے۔

امام صاحب کے زمانہ میں جو مذہبی علوم نہائیت اوج و ترقی پر تھے وہ فقہ ۔ حدیث ۔ اسماء

---

[1] وکیع کا مستقل ترجمہ اس کتاب کے آیندہ صفحوں میں دیکھو ۱۲ [2] ہمارے زمانہ کے کم نظروں کو اس روائیت سے تعجب ہوگا اور وہ اس کو حنفیوں کی گڑھت سمجھیں گے مگر اُن کو معلوم ہونا چاہئے کہ علامہ نووی نے جو مشہور محدث ہیں اس روائیت کی تصدیق کی ہے۔ دیکھو تہذیب الاسماء واللغات نووی۔ ترجمہ امام محمد [3] ہذا۔ کاف داف لفضل الامام الاعظم رحمۃ اللہ ۱۲ محشی

الرجال تھے۔ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ان علوم کے ارکان تھے اکثر امام صاحب ہی کے شاگرد تھے اور شاگرد بھی برائے نام شاگرد نہ تھے بلکہ مدتوں امام صاحب کی صحبت میں رہے اور اُن کی فیض صحبت کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔ فقہ کے متعلق تو غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن حدیث کی نسبت اس دعویٰ پر لوگوں کو تعجب ہوگا اور یہ تعجب بجا ہے کیونکہ امام صاحب کی شاگردی کے تعلق سے جو لوگ مشہور ہوئے وہ اکثر فقیہ ہی تھے۔ محدثین میں سے جو امام صاحب کے شاگرد ہیں اگرچہ بجائے خود شہرت عام رکھتے ہیں لیکن اُنکی شاگردی کا تعلق چنداں مشہور نہیں۔ میں اس موقع پر جن لوگوں کے نام لکھوں گا اِس تعلق کا ذکر بھی خصوصیت کے ساتھ کروں گا اور رجال کی نہایت معتبر کتابوں کا حوالہ دوں گا۔

امام صاحب کے بیشمار شاگردوں میں سے ہم اُن چالیس شخصوں کا مختصر تذکرہ لکھنا چاہتے تھے جو امام صاحب کے ساتھ تدوین فقہ میں شریک تھے لیکن افسوس ہے کہ ہم اُن میں سے صرف چند شخصوں کا نام معلوم کر سکے۔ یعنی قاضی ابو یوسف۔ زُفر۔ اسد بن عمر۔ عافیۃ الاَزدی۔ داؤد طائی قاسم بن معن علی بن مسہر یحییٰ بن زکریا۔ حبان۔ مندل چنانچہ ان لوگوں کے مختصر حالات ہم ذیل میں لکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اُن شاگردوں کا ذکر بھی ضرور ہے جو حدیث و رجال کے فن میں امام وقت تھے چنانچہ پہلے ہم انہی سے شروع کرتے ہیں۔

یحییٰ بن سعید القطان

محدثین

فن رجال کا سلسلہ انہی سے شروع ہُوا۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ فن رجال میں اوّل جس شخص نے لکھا وہ یحییٰ بن سعید القطان ہیں پھر ان کے بعد اُن کے شاگردوں میں یحییٰ بن معین۔ علی بن المدینی۔ امام احمد حنبل۔ عمرو بن علی الفلاس ابو خثیمہ نے اِس فن میں گفتگو کی۔ اور اُن کے بعد اُن کے شاگردوں یعنی امام بخاری و مسلم وغیرہ نے حدیث میں اُن کا یہ پایہ تھا کہ جب حلقہ درس میں بیٹھتے تو امام احمد بن حنبل علی بن المدینی

---

۵۱ ان لوگوں کا ذکر اس حیثیت سے مورخ خطیب نے قاضی ابو یوسف کے ترجمہ میں لکھا ہے (دیکھو مختصر تاریخ بغداد ترجمہ ابو یوسف) ۱۲

وغیرہ مؤدب کھڑے ہو کر ان سے حدیث کی تحقیق کرتے اور نماز عصر سے جو اُن کے درس کا وقت تھا مغرب تک برابر کھڑے رہتے۔ راویوں کی تحقیق و تنقید میں یہ کمال پیدا کیا تھا کہ ائمہ حدیث عموماً کہا کرتے تھے کہ یحییٰ جس کو چھوڑ دینگے ہم بھی چھوڑ دینگے[1]۔ امام احمد بن حنبل کا مشہور قول ہے کہ مارأیت بعینی مثل یحیی بن سعید القطان یعنی میں نے اپنی آنکھوں سے یحییٰ کا مثل نہیں دیکھا[2]۔ اس فضل و کمال کے ساتھ امام ابوحنیفہ کے حلقۂ درس میں اکثر شریک ہوتے اور اُن کی شاگردی پر فخر کرتے۔ اُس زمانہ تک تقلید معیّن کا رواج نہیں ہوا تھا تاہم اکثر مسائل میں وہ امام صاحب ہی کی تقلید کرتے تھے۔ خود اُن کا قول ہے قد اخذنا باکثر اقواله یعنی ہم نے امام ابوحنیفہ کے اکثر اقوال اخذ کئے[3]۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں وکیع بن الجراح کا ذکر کیا ہے لکھا ہے یفتی بقول ابی حنیفة وکان یحیی القطان یفتی بقوله ایضاً یعنی وکیع امام ابوحنیفہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے اور یحییٰ قطان بھی انہیں کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔

۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸ھ میں بمقام بصرہ وفات پائی۔

عبداللہ بن المبارک

محدث نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں ان کا ذکر ان لفظوں سے کیا ہے "وہ امام جس کی امامت و جلالت پر ہر باب میں عموماً اجماع کیا گیا ہے جس کے ذکر سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے جس کی محبت سے مغفرت کی امید کیجا سکتی ہے"۔

حدیث میں جو ان کا پایہ تھا اُس کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ محدثین ان کو امیرالمومنین فی الحدیث کے لقب سے پکارتے تھے۔ ایک موقع پر ان کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ان سے خطاب کیا کہ یا عالم المشرق امام سفیان ثوری جو مشہور محدث ہیں اس موقع پر

---

[1] فتح المغیث و جواہر المضیئہ ۱۲ [2] تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر ترجمہ یحییٰ القطان ۱۲ [3] میزان الاعتدال علامہ ذہبی دیباچہ ۱۲ [4] اب چونکہ تقلید معیّن رائج ہو چکی ہے اسلئے ہر ایک کو تقلید سے علیحدہ ہونے کا حق حاصل نہیں ہو سکتا ۱۲ محشی [5] تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر ترجمہ امام ابوحنیفہ ۱۲

موجود تھے بولے کہ کیا غضب ہے! عالم مشرق کہتے ہو! وہ عالم الشرق والغرب ہیں۔[1] امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ عبداللہ بن المبارک کے زمانہ میں اُن سے بڑھ کر کسی نے حدیث کی تحصیل میں کوشش نہیں کی۔" خود عبداللہ بن المبارک کا بیان ہے کہ "میں نے چار ہزار شیوخ سے حدیث سیکھی جن میں سے ہزار سے روایت کی۔[2]" صحیح بخاری و مسلم میں انکی روایت سے سیکڑوں حدیثیں مروی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ فن روایت کے بڑے ارکان میں سے ہیں۔ حدیث و فقہ میں ان کی بہت سی تصنیفات ہیں لیکن افسوس کہ آج اُن کا پتہ نہیں۔

ان کے فضل و کمال زہد و تقویٰ نے اسقدر لوگوں کو مسخر کر لیا تھا کہ بڑے بڑے اُمراء و سلاطین کو وہ رُتبہ حاصل نہ تھا۔ ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید۔ رقہ گیا۔ اسی زمانہ میں عبداللہ بن المبارک بھی رقہ پہنچے۔ ان کے آنے کی خبر مشہور ہوئی تو ہر طرف سے لوگ دوڑے اور اسقدر کشمکش ہوئی کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں۔ ہزاروں آدمی ساتھ ہوئے اور ہر طرف گرد چھا گئی ہاروں الرشید کی ایک حرم نے جو برج کے غرفہ سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ یہ کیا حال ہے۔ لوگوں نے کہا "خراسان کا عالم آیا ہے جس کا نام عبداللہ بن المبارک ہے" بولی کہ حقیقت میں سلطنت اس کا نام ہے ہارون الرشید کی حکومت بھی کوئی حکومت ہے کہ پولیس اور سپاہیوں کے بغیر ایک آدمی بھی حاضر نہیں ہو سکتا۔[3]

یہ امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگردوں میں ہیں اور امام صاحب کے ساتھ ان کو خاص خلوص تھا۔ ان کو اعتراف تھا کہ جو کچھ مجھ کو حاصل ہوا امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کے فیض سے حاصل ہوا۔ اُن کا مشہور قول ہے کہ لولا ان اللہ تعالیٰ اغاثنی بابی حنیفۃ وسفیان کنت کسایر الناس[4] یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے ابوحنیفہ و سفیان کے ذریعہ سے میری دستگیری نہ کی ہوتی تو میں ایک عام آدمی سے بڑھ کر نہ ہوتا" امام ابوحنیفہ کی شان میں ان کے اشعار اکثر منقول ہیں خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں چند اشعار نقل کئے ہیں جن میں سے ایک یہ شعر ہے ؎

رأیتُ ابا حنیفۃ حین قوّی ۔۔۔ واطلب علمہ بحرٌ غزیزٌ[5]

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات علامہ نووی ۱۲ [2] تہذیب الکمال ترجمہ عبداللہ بن المبارک ۱۲ [3] تاریخ بن خلکان ترجمہ عبداللہ بن المبارک ۱۲ [4] تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر۔ ترجمہ امام ابوحنیفہ ۱۲ [5] غزیر بالضم و فتح را نام آبے است ۱۲ منتخب اللغات ۱۲ محشی

مرو کے رہنے والے تھے ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱ھ میں مقام ہیت وفات پائی +

یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ

مشہور محدث تھے۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں صرف اُن لوگوں کا تذکرہ لکھا ہے جو حافظ الحدیث کہلاتے تھے۔ چنانچہ یحییٰ کو بھی انہیں لوگوں میں داخل کیا ہے۔ اور ان کے طبقہ میں سب سے پہلے انہیں کا نام لکھا ہے۔ علی بن المدینی جو امام بخاری کے مشہور اُستاد ہیں کہا کرتے تھے کہ "یحییٰ کے زمانہ میں یحییٰ پر علم کا خاتمہ ہو گیا"[1]۔ صحاح ستہ میں ان کی روائیت سے بہت سی حدیثیں ہیں۔ وہ محدث اور فقیہ دونوں تھے اور ان دونوں فنوں میں بہت بڑا کمال رکھتے تھے چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع کیا ہے۔ اَحَدُ الْفُقَهَاءِ الْكِبَارِ وَالْمُحَدِّثِيْنَ الْاَثْبَاتِ[1]

یہ امام ابو حنیفہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور مدت تک اُن کے ساتھ رہے تھے یہاں تک کہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو صاحب ابی حنیفہ کا لقب دیا ہے۔ یہ تدوین فقہ میں امام صاحب کے شریک اعظم تھے۔ امام طحاوی نے لکھا ہے کہ "تیس برس تک وہ شریک رہے"۔ اگرچہ یہ مدت صحیح نہیں لیکن کچھ شبہ نہیں کہ وہ بہت دن تک امام صاحب کے ساتھ تدوین فقہ کا کام کرتے رہے اور خاص کر تصنیف و تحریر کی خدمت انہی سے متعلق تھی[2]۔ میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ "بعض لوگوں کا قول ہے کہ کوفہ میں اول جس شخص نے تصنیف کی وہ یحییٰ ہیں"۔ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تحریر کا کام یحییٰ سے متعلق تھا اس لئے بعض لوگوں نے اُنھی کو مستقل مصنف سمجھ لیا۔

مدآین میں منصب قضاء پر ممتاز تھے اور وہیں ۱۸۲ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی +

وکیع بن الجراح

فن حدیث کے ارکان میں شمار کئے جاتے تھے۔ امام احمد حنبل کو ان کی شاگردی پر فخر تھا

[1] میزان الاعتدال علامہ ذہبی ترجمہ یحییٰ ۱۲ [2] الجواہر المضیئہ ترجمہ یحییٰ ۱۲ [3] اثبات بالفتح ثقہ دان و ثبات دارندگان مدکار زجمع ثبت ۱۲ منتخب محشی

چنانچہ جب وہ ان کی روائیت سے کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو ان لفظوں سے شروع کرتے تھے "یہ حدیث مجھ سے اُس شخص نے روائیت کی کہ تیری آنکھوں نے اُس کا مثل نہ دیکھا ہوگا"[۱] یحییٰ بن معین جو فن رجال کے ایک رُکن خیال کئے جاتے ہیں اُن کا قول تھا کہ "میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کو وکیع پر ترجیح دوں"[۲] اکثر ائمہ حدیث نے اُن کی شان میں اس قسم کے الفاظ لکھے ہیں۔ بخاری و مسلم میں اکثر ان کی روائیت سے حدیثیں مذکور ہیں۔ فن حدیث و رجال کے متعلق ان کی روائیتیں اور رائیں نہایت مستند خیال کی جاتی ہیں۔

یہ امام ابو حنیفہ کے شاگرد خاص تھے اور اُن سے بہت سی حدیثیں سُنی تھیں اکثر مسائل میں امام صاحب کی تقلید کرتے تھے اور اُنہی کے قول کے موافق فتوے دیتے تھے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ کان یفتی بقول ابی حنیفۃ وکان قد سمع منہ شیئاً کثیراً[۳] علامہ ذہبی نے بھی تذکرۃ الحفاظ میں اس کی تصدیق کی ہے ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔

یزید بن ہرون

فن حدیث کے مشہور امام ہیں بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے شاگرد تھے امام احمد حنبل علی بن المدینی یحییٰ بن معین۔ ابن ابی شیبہ وغیرہ نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے۔ علامہ نووی نے ان کے تلامذہ کی نسبت لکھا ہے کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا یحییٰ بن ابی طالب کا بیان ہے کہ ایک بار میں ان کے حلقۂ درس میں شریک تھا۔ لوگ تخمینہ کرتے تھے کہ حاضرین کی تعداد کم و بیش ستر ہزار تھی[۴]۔ کثرت حدیث میں لوگ انکی مثال دیتے تھے خود ان کا بیان ہے کہ "مجھ کو بیس ہزار حدیثیں یاد ہیں"[۵]۔ علی بن المدینی۔ (امام بخاری کے اُستاد) کہا کرتے تھے کہ میں نے ان سے زیادہ کسی کو حافظ حدیث نہیں دیکھا۔[۶]

فن حدیث میں ان کو امام ابو حنیفہ سے تلمذ تھا۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں

---

[۱] تہذیب الاسماء واللغات علامہ نووی ترجمہ وکیع بن الجراح ۱۲ [۲] تہذیب الاسماء واللغات ۱۲ [۳] حافظ عبد البر کے قول میں "شیئاً" کے بجائے "حدیثاً" کا لفظ ہے جو صاف اور صریح اس دعویٰ پر دلالت کرتا ہے (دیکھو عقود الجمان خاتمہ فصل اوّل) ۱۲ [۴] تہذیب الاسماء واللغات نووی ترجمہ یزید بن ہرون [۵] تہذیب الاسماء واللغات ۱۲ [۶] تہذیب ۱۲ محشی

جہاں اُن لوگوں کے نام لکھے ہیں جنہوں نے امام صاحب سے حدیثیں روائیت کیں ان کا نام بھی لکھا ہے۔ یہ ایک مدّت تک امام صاحب کی صحبت میں رہے اور اسوجہ سے ان کو امام صاحب کے اخلاق و عادات پر رائے قائم کرنے کا کافی موقع ملا تھا۔ اُن کا قول ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں کی صحبت اٹھائی لیکن ابو حنیفہ سے کسی کو بڑھ کر نہیں پایا[۱]۔ ۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶۲ھ میں وفات پائی +

حفص بن غیاث

بہت بڑے محدث تھے خطیب بغدادی نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے اور علامہ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے امام احمد حنبل۔ علی بن المدینی وغیرہ نے ان سے حدیثیں روائیت کیں۔ یہ اس خصوصیت میں ممتاز تھے کہ جو کچھ روائیت کرتے تھے زبانی کرتے تھے کاغذ یا کتاب پاس نہیں رکھتے تھے چنانچہ اس طرح جو حدیثیں روائیت کیں اُس کی تعداد تین یا چار ہزار ہے[۲]۔ یہ امام صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں امام صاحب کے شاگردوں میں چند بزرگ نہائیت مقرب اور با اخلاص تھے جن کی نسبت وہ فرمایا کرتے تھے کہ "تم میرے دل کی تسکین اور میرے غم کے مٹانے والے ہو" حفص کی نسبت بھی امام صاحب نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہیں[۳]۔ مختصر تاریخ بغداد میں ان کی نسبت لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگردوں میں تھے +

مدت تک دُنیاوی تعلقات سے آزاد رہے لیکن اخیر میں ضرورتوں نے بہت تنگ کیا اتفاق یہ کہ انہی دنوں یعنی ۱۷۷ھ میں ہارون الرشید نے ان کا شہرۂ حسن کران کو طلب کیا اور قضا کی خدمت سپرد کی۔ چونکہ قرض سے زیر بار تھے مجبوراً قبول کرنا پڑا۔ قاضی ابو یوسف قاضی القضاۃ تھے اور قضا کا تمام سررشتہ اُن کے اہتمام میں تھا۔ چونکہ ہارون الرشید نے قاضی صاحب کے بغیر اطلاع حفص کو مقرر کر دیا اسلئے اُن کو فی الجملہ خیال ہُوا اور حسن بن زیاد سے کہا کہ حفص کے فیصلے ہمارے مرافعہ میں آئیں تو اُن کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھنا چاہئیے

[۱] تہذیب الکمال حافظ مزی ترجمہ امام ابو حنیفہ ۲ [۲] میزان الاعتدال ترجمہ حفص ۱۲ [۳] الجواہر المضیئۃ ترجمہ حفص بن غیاث

لیکن جب اُن کے فیصلے دیکھے تو اعتراف کیا کہ حفص کے ساتھ تائید الٰہی ہے[51]۔

۱۱۷ھ میں پیدا ہوئے۔ تیرہ برس کوفہ میں اور دو برس بغداد میں قاضی رہے ۱۹۶ھ میں وفات پائی ✦

ابو عاصم النبیل

ان کا نام ضحاک بن مخلد ہے۔ مشہور محدث ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں انکی روایت سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ علامۂ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ "انکی توثیق پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔" نہائیت پارسا اور متورع تھے۔ امام بخاری نے روائیت کی ہے کہ ابو عاصم نے خود کہا کہ "جب سے مجھ کو معلوم ہوا کہ غیبت حرام ہے میں نے آجتک کسی کی غیبت نہیں کی۔"[52]

ان کا لقب۔ نبیل تھا جس کے معنی معزز کے ہیں۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ لقب کیوں ہوا؟ ایک روائیت ہے کہ ایک دفعہ شعبہ نے کسی وجہ سے قسم کھالی کہ "میں حدیث نہیں روائیت کروں گا۔" چونکہ وہ بہت بڑے محدث تھے اور اُن کے درس سے ہزاروں طلبا مستفید ہوتے تھے لوگوں کو بہت تشویش ہوئی۔ ابو عاصم نے یہ حال سُنا تو اُسی وقت شعبہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ "میں اپنے غلام کو آپ کی قسم کے کفارہ میں آزاد کرتا ہوں آپ قسم توڑ ڈالئے اور حدیث کا درس دیجئے۔" شعبہ کو ان کے شوق اور ہمت پر تعجب ہوا اور فرمایا کہ انت نبیل" اُسوقت سے یہ لقب مشہور ہو گیا۔

یہ بھی امام صاحب کے مختص شاگردوں میں تھے۔[53] خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی نے ان سے پوچھا کہ سفیان ثوری زیادہ فقیہ ہیں یا ابو حنیفہ" بولے کہ "موازنہ تو اُن چیزوں میں ہوتا ہے جو ایک دوسری[54] سے ملتی جُلتی ہوں۔ ابو حنیفہ نے فقہ کی بنیاد ڈالی ہے اور سفیان صرف فقیہ ہیں۔"

۲۱۲ھ میں نوّے برس کی عمر میں وفات پائی ✦

---

[51] الجواہر المضیئۃ۔ ترجمہ حفص بن غیاث ۱۲ [52] الجواہر المضیئۃ۔ ترجمہ ابو عاصم ۱۲ [53] الجواہر المضیئۃ ۱۲ [54] اللہ اکبر ۱۲ محشی

عبدالرزاق بن ہمام

علامہ ذہبی نے ان کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع کیا ہے احد الاعلام الثقات بہت بڑے نامور محدث تھے صحیح بخاری و مسلم وغیرہ ان کی روائتوں سے مالا مال ہیں۔ امام احمد حنبل سے کسی نے پوچھا کہ حدیث کی روائیت میں آپنے عبدالرزاق سے بڑھکر کسی کو دیکھا؟ جواب دیا کہ نہیں۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام سفیان بن عینیہ۔ یحییٰ بن معین علی بن المدینی۔ امام احمد حنبل۔ فن حدیث میں ان کے شاگرد تھے طالبان حدیث بہت دور سے قطع المنازل کر کے ان کی خدمت میں سیکھنے جاتے تھے یہانتک کہ بعضوں کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کے پاس اسقدر رُور و دراز مسافتیں طے کر کے لوگ نہیں گئے حدیث میں ان کی ایک ضخیم تصنیف موجود ہے جو جامع عبدالرزاق کے نام سے مشہور ہے۔ امام بخاری نے اعتراف کیا ہے کہ "میں اس کتاب سے مستفید ہوا ہوں" علامہ ذہبی نے اس کتاب کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ "علم کا خزانہ ہے"۔

ان کو ابو حنیفہ سے فن حدیث میں تلمذ تھا عقود الجمان کے مختلف مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب کی صحبت میں زیادہ رہے۔ چنانچہ اُن کے اخلاق و عادات کے متعلق انکے اکثر اقوال کتابوں میں مذکور ہیں۔ اُن کا قول تھا کہ "میں نے امام ابو حنیفہ سے بڑھ کر کسی کو حلیم نہیں دیکھا"۔

۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۱۱ھ میں انتقال کیا۔

داؤد الطائی

خدا نے عجب حسن قبول دیا تھا۔ صوفیہ ان کو بہت بڑا مُرشد کامل مانتے ہیں تذکرۃ الاولیاء میں ان کے مقامات عالیہ مذکور ہیں۔ فقہا اور خصوصاً فقہائے حنفیہ ان کے تفقہ اور اجتہاد کے قائل ہیں محدثین کا قول ہے کہ ثقۃ بلا نزاع اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ان تمام القاب کے مستحق تھے۔ محارب بن دثار جو مشہور محدث تھے کہا کرتے تھے کہ "داؤد اگر اگلے زمانہ میں ہوتے تو

---

۱ انساب سمعانی و تاریخ یافعی ترجمہ عبدالرزاق بن ہمام ۲ میزان الاعتدال ذہبی ۱۲

خدا قرآن مجید میں اُن کا قصہ بیان کرتا ۔[۱]

ابتداء میں فقہ و حدیث کی تحصیل کی پھر علم کلام میں کمال پیدا کیا اور بحث و مناظرہ میں مشغول ہوئے ۔ ایک دن کسی موقع پر ایک شخص سے گفتگو کرتے کرتے اُس پر کنکری پھینک ماری اُس نے کہا "داؤد! تمہاری زبان اور ہاتھ دونوں دراز ہو چلے" اُن پر عجیب اثر ہوا بحث و مناظرہ بالکل چھوڑ دیا تاہم تحصیل علم کا مشغلہ جاری تھا ۔ برس دن کے بعد کل کتابیں دریا میں ڈبو دیں اور تمام چیزوں سے قطع تعلق کر لیا ۔ امام محمد کا بیان ہے کہ "میں داؤد سے اکثر مسئلہ پوچھنے جاتا ۔ اگر کوئی ضروری اور عملی مسئلہ ہوتا تو بتا دیتے ورنہ کہتے کہ بھائی! مجھے اور ضروری کام ہیں" یہ امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں خطیب بغدادی ۔ ابن خلکان ۔ علامہ ذہبی اور دیگر مورخین نے جہاں ان کے حالات لکھے ہیں امام صاحب کی شاگردی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے ۔ تدوین فقہ میں بھی امام صاحب کے شریک تھے اور اُس مجلس کے معزز ممبر تھے سنہ ۱۶۰ھ میں وفات پائی ۔

اِن بزرگوں کے سوا اور بھی بہت سے نامور محدثین مثلاً فضل بن دکین ۔ حمزہ بن حبیب الزیات ۔ ابراہیم بن طہمان سعید بن اوس ۔ عمر بن میمون فضل بن موسی ۔ وغیرہ امام صاحب کے تلامذہ میں داخل ہیں ۔ لیکن ہم نے صرف اُن لوگوں کا ذکر کیا ہے جو تلامذۂ خاص کہے جا سکتے ہیں اور جو مدتوں امام صاحب کی صحبت سے مستفید ہوئے ہیں +

فقہاء

جو تدوین فقہ میں شریک تھے

قاضی ابو یوسف[۲]

ان کی منزلت اور عظمتِ شان اس قابل تھی کہ ان کا مستقل تذکرہ لکھا جاتا اور جب ہی اُنکے علمی کمالات کا اندازہ بھی ہو سکتا ۔ لیکن یہ فرصت کے کام ہیں خدا کسی کو توفیق دے تو یہ کام پورا ہو سکتا ہے ۔ اِس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے میرا اسی قدر فرض ہے کہ اُن کی مختصر تاریخ لکھوں جس سے اُن کی لائف اور علمی کمالات پر ایک اجمالی رائے قائم ہو سکے ۔

[۱] تاریخ ابن خلکان ۱۲ [۲] انکے سوانح عمری مولانا محمد عبد الحلیم شرر لکھنوی نے بھی لکھے ہیں ۱۲ محشی

نسب اور ولادت

ان کا نسب انصار سے ملتا ہے ان کے مورث اعلیٰ سعد بن صبتہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کے باپ ایک غریب آدمی تھے اور مزدوری محنت کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ ۱۱۳ھ یا ۱۱۲ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے۔ ان کو اگرچہ بچپن سے لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا۔ لیکن باپ کی مرضی نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی پیشہ سیکھیں اور گھر میں چار پیسے کما کر لائیں۔ تاہم قاضی صاحب جب موقع اور فرصت پاتے علما کی صحبت میں جا بیٹھتے۔ ایک دن امام ابوحنیفہ کے حلقۂ درس میں حاضر تھے کہ ان کے باپ پہنچے اور وہاں سے زبردستی اٹھا لائے۔ گھر پر آکر سمجھایا کہ بیٹا ابوحنیفہ کو خدا نے رزق کی طرف سے اطمینان دیا ہے۔ تم اُن کی ریس کیوں کرتے ہو؟ قاضی صاحب نے مجبوراً لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا اور باپ کے ساتھ رہنے لگے۔ امام ابوحنیفہ نے دو چار دن کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ "یعقوب اب نہیں آتے" ان کو امام صاحب کی جستجو کا حال معلوم ہوا تو حاضر ہوئے اور ساری کیفیت بیان کی امام صاحب نے چپکے سے ایک تھیلی حوالہ کی گھر پر آکر دیکھا تو سو درہم تھے۔ امام صاحب نے اِن سے یہ بھی کہدیا کہ جب خرچ ہو چکے تو مجھ سے کہنا اسی طرح برابر ان کو مدد دیتے رہے یہاں تک کہ قاضی صاحب نے تمام علوم میں کمال حاصل کیا اور اُستاد وقت بن گئے۔

تحصیل علوم کے سامان

قاضی صاحب نے امام ابوحنیفہ کے علاوہ اور بہت سے ائمہ وقت کی خدمت میں علم کی تحصیل کی۔ اعمش۔ ہشام بن عروہ۔ سلیمان تیمی۔ ابو اسحٰق شیبانی۔ یحییٰ بن سعید الانصاری وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں محمد بن اسحٰق سے مغازی و سیر پڑھی۔ محمد بن ابی لیلیٰ سے فقہ کے مسائل سیکھے۔ خدا نے ذہن و حافظہ ایسا قوی دیا تھا کہ ایک ہی زمانہ میں ان تمام علوم کی تحصیل کرتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر نے جو ایک مشہور محدث ہیں لکھا ہے کہ "ابو یوسف محدثین کے پاس حاضر ہوتے اور ایک جلسہ میں پچاس ساٹھ حدیثیں سُن کر یاد کر لیتے"۔

عہدۂ قضا

امام ابوحنیفہ جب تک زندہ رہے۔ قاضی صاحب اُن کے حلقۂ درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے رہے۔ اُن کی وفات کے بعد دربار سے تعلق پیدا کرنا چاہا۔ چنانچہ خلیفہ مہدی عباسی نے ۱۶۶ھ میں ان کو قاضی کی خدمت دی۔ مہدی کے بعد اُس کے جانشین ہادی نے بھی

ان کو اُسی عہدہ پر بحال رکھا۔ لیکن ہارون الرشید نے ان کی لیاقتوں سے واقف ہو کر تمام ممالک اسلامیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا اور یہ وہ عہدہ تھا جو اُس وقت تک اسلام کی تاریخ میں کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا بلکہ زمانہ مابعد میں بھی بجز قاضی احمد بن ابی داؤد کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ قاضی صاحب نے سررشتہ قضا میں جو ترقیاں کیں اُن کی تفصیل خود اُن کی لائف لکھی جائے تو لکھی جا سکتی ہے۔

وفات

جمعرات کے دن ظہر کے وقت ربیع الاول کی پانچویں تاریخ ۱۸۲ھ میں وفات پائی محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ مرتے وقت یہ الفاظ اُن کی زبان پر تھے "اے خدا تو جانتا ہے کہ میں نے کوئی فیصلہ عمداً خلاف واقع نہیں کیا۔ میری ہمیشہ کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو تیری کتاب اور تیرے پیغمبر کے طریقہ کے موافق ہو۔ جب کوئی مشکل مسئلہ آتا تھا تو میں امام ابوحنیفہ کو واسطہ بناتا تھا اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے ابوحنیفہ تیرے احکام کو خوب سمجھتے تھے اور عمداً حق کے رستہ سے باہر نہ جاتے تھے"۔ قاضی صاحب بہت بڑے دولتمند تھے لیکن دولت کا استعمال اچھی طرح کیا۔ مرتے وقت وصیت کی کہ چار لاکھ روپے مکہ معظمہ مدینہ منورہ کوفہ۔ بغداد کے محتاجوں کو دئے جائیں۔

کثرت حدیث

قاضی صاحب متعدد علوم میں کمال رکھتے تھے۔ اگرچہ اُن کی شہرت زیادہ تر فقہ میں ہوئی لیکن اور علوم میں بھی وہ اپنے آپ ہی نظیر تھے۔ مورخ ابن خلکان نے ہلال بن یحییٰ کا قول نقل کیا ہے کہ ابو یوسف تفسیر۔ مغازی۔ ایام العرب کے حافظ تھے اور فقہ اُن کا ادنیٰ سا علم تھا"۔ حدیث میں اُن کا یہ پایہ تھا کہ حفاظ حدیث میں شمار کئے جاتے تھے چنانچہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اُن کا ترجمہ لکھا ہے۔ یحییٰ بن معین کہا کرتے تھے کہ "اہل الرائے میں ابو یوسف سے بڑھکر کوئی شخص کثیر الحدیث نہیں"۔ امام احمد حنبل کا قول ہے کہ کان منصفاً فی الحدیث مزنی جو امام شافعی کے مشہور شاگرد ہیں کہا کرتے تھے ابو یوسف اتبع القوم للحدیث[۱] خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام احمد حنبل کا قول نقل کیا ہے کہ "اول جب مجھ کو علم حدیث کا شوق پیدا ہوا تو ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوا"۔ یحییٰ بن معین و امام احمد حنبل اور بہت سے ائمہ حدیث نے قاضی صاحب سے حدیثیں روایت کیں۔ اس سے زیادہ اُنکی

[۱] یہ اقوال علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کئے ہیں (۱۲)

عظمت شان کی کیا دلیل ہوگی۔[۱]

فقہ میں جو اُن کا پایہ ہے اُس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کو خود اُن کے کمال کا اعتراف تھا۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے۔ امام صاحب عیادت کو گئے۔ واپس آئے تو ساتھیوں سے کہا کہ "خدانخواستہ اگر یہ شخص ہلاک ہوا تو دُنیا کا عالم ہلاک ہوا۔" اور ائمہ بھی اُن کے حدّت ذہن اور قوت فہم کے معترف تھے۔ امام اعمش اُس زمانہ کے ایک مشہور محدث تھے اُنہوں نے قاضی صاحب سے ایک مسئلہ پوچھا۔ اُنہوں نے جواب بتایا امام اعمش نے کہا اس پر کوئی سند بھی ہے؟ قاضی صاحب نے فرمایا ہاں وہ حدیث جو فلاں موقع پر آپ نے مجھ سے بیان کی تھی۔ امام اعمش نے کہا "یعقوب یہ حدیث مجھ کو اُس وقت سے یاد ہے جب تمہارے والدین کا عقد بھی نہیں ہوا تھا لیکن اُس کا صحیح مطلب آج ہی سمجھ میں آیا۔"[۲]

قاضی صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے فقہ حنفی میں تصنیفیں کیں مختلف علوم میں اُنکی تصنیفات بہت ہیں اور ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں اُن کی مفصل فہرست بھی نقل کی ہے لیکن ہماری نگاہ سے صرف کتاب الخراج گزری ہے اس لئے ہم اُس کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ ہارون الرشید نے خراج وجزیہ وغیرہ کے متعلق قاضی صاحب سے یادداشتیں طلب کی تھیں۔ قاضی صاحب نے اُس کے جواب میں چند تحریریں بھیجیں۔ یہ کتاب اُنہیں تحریروں کا مجموعہ ہے۔[۳] اگرچہ اس میں بہت سے مضامین ہیں لیکن زیادہ تر خراج کے مسائل ہیں اور اس لئے اُس کو اُس زمانہ کا قانون مالگذاری کہہ سکتے ہیں اِس کتاب میں زمین کے اقسام بلحاظ حیثیت اور بلحاظ تنوع۔ لگان کی مختلف شرحیں۔ کاشتکاروں کی حیثیتوں کا اختلاف۔ پیداوار کی قسمیں۔ اِس قسم کے اور مراتب کو اِس خوبی اور دقّت نظر کے ساتھ منضبط کیا ہے اور ان کے متعلق قواعد قرار دئے ہیں کہ اُس زمانہ کے لحاظ سے تعجب ہوتا ہے طرز تحریر میں ایک بڑی خوبی ہے کہ نہایت آزادانہ ہے۔ قواعد اور ہدائیتوں کے ساتھ

تصنیفات

---

[۱] قاضی صاحب کی نسبت کتب رجال میں جرحیں بھی منقول ہیں مگر وہ عموماً ناقابل اعتبار ہیں کیونکہ یا تو وہ مبہم جرحیں ہیں یا اُن کا منشاء اجتہادی مسائل کا اختلاف ہے ۱۲ [۲] اللہ اکبر ۱۲ المحشی [۳] ابن خلکان ترجمہ قاضی ابو یوسف ۱۲ [۴] یہ کتاب مصر کے مطبع میریہ میں ۱۳۰۲ھ میں چھاپی گئی ہے ۱۲

جا بجا اُن ابتریوں کا ذکر ہے جو انتظامات سلطنت میں موجود تھیں اور اُن پر نہایت بیباکی کے ساتھ خلیفۂ وقت کو متوجہ کیا ہے۔

قاضی صاحب کی تاریخ زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے وہ یہ ہے کہ ہارون الرشید جیسے جبّار اور خود پرست بادشاہ کے دربار میں وہ اپنے فرائض اس جرأت اور آزادی سے ادا کرتے تھے جس کی مثال ایشیائی سلطنتوں میں بہت کم مل سکتی ہے کتاب الخراج میں ایک جگہ وہ ہارون الرشید کو لکھتے ہیں کہ "امیر المومنین اگر تو اپنی رعایا کے انصاف کے لئے مہینہ میں ایکبار بھی دربار کرتا اور مظلوموں کی فریاد سُنتا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ تیرا شمار اُن لوگوں میں نہ ہوتا جو رعیت سے پردہ کرتے ہیں اور اگر تو دو ایک دربار بھی کرتا تو یہ خبر تمام اطراف میں پھیل جاتی اور ظالم اپنے ظلم سے باز آتے۔ بلکہ اگر عمّال و صوبہ داروں کو یہ خبر پہنچے کہ تو برس دن میں ایک دفعہ انصاف کے لئے بیٹھتا ہے تو ظالموں کو کبھی ظلم پر جرأت نہ ہونے پائے!!"

قاضی صاحب کے سوا کس کی جرأت تھی کہ ہارون الرشید کو یہ الفاظ لکھتا؟

تعجب یہ ہے کہ ایسا آزاد اور پاکیزہ نفس بھی دشمنوں کے حملہ سے نہیں بچا۔ قاضی صاحب کے مخالفین نے اُن کو خوشامدی اور زمانہ ساز کہا ہے اور اس مضمون کی چند روائتیں بھی گھڑلی ہیں بعض مورخین جن کو رطب و یابس سے کچھ بحث نہیں اِن بیہودہ روایتوں کو نقل ہی کر دیتے ہیں جو کوتاہ بینوں کے لئے "موئے بس است" کا کام دیتی ہے اس قسم کی بعض حکائیتیں تاریخ الخلفا میں منقول ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کتاب الخراج کے فقرے جو ہمنے نقل کئے ہیں جس قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں اُن کے مقابلہ میں اِن روائیتوں کا کس حد تک اعتبار ہو سکتا ہے۔

حاطب اللیل مؤرخین ایک طرف۔ بعض محدثین نے بھی مخالفت کے جوش میں تحقق حق کی پروانہ کی بیہقی نے امام شافعی کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اُس میں لکھا ہے کہ "امام شافعی جب ہارون الرشید کے دربار میں گرفتار ہو کر آئے تو قاضی ابو یوسف اور امام محمد نے ہارون الرشید کو امام شافعی کے قتل کی رائے دی اور

آزادی کے ساتھ اپنے فرائض کا انجام دینا

مخالفین کی تہمت آمیز روائتیں

کہا کہ اگر جلد تدارک نہیں کیا جاتا تو یہ شخص سلطنت کو صدمہ پہنچائیگا!!" افسوس۔ امام بیہقی کو
باوجود محدثیت یہ بھی خیال نہ آیا کہ قاضی ابو یوسف اس زمانہ سے بہت پہلے انتقال کر چکے
تھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ خود محدثین ہی نے اس روایت کی تکذیب کی حافظ ابن حجر نے جن سے
بڑھکر اُن کے بعد محدث نہیں ہوا امام شافعی کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے[1] جو آجکل مصر
میں چھاپی گئی ہے۔ وہ اس روایت کو نقل کرکے لکھتے ہیں فہی مکذوبۃ وغالب ما فیہا
موضوع وبعضہا ملفق من روایات ملفقۃ وواضح ما فیہا من الکذب قولہ
فیہا ان ابا یوسف ومحمد بن الحسن حرضا الرشید علی قتل الشافعی۔ یعنے یہ
روایت جھوٹی ہے اور اُس کا اکثر حصہ موضوع ہے اور بعض حصے دوسری مختلط روایتوں سے
ماخوذ ہیں اور جو صریح جھوٹ اُس میں ہے وہ یہ ہے کہ ابو یوسف ومحمد بن الحسن نے ہارون الرشید
کو امام شافعی کے قتل کی ترغیب دی۔

اوّلیت

قاضی صاحب کی طرف بعض اوّلیات بھی منسوب ہیں۔ مورخ ابن خلکان نے لکھا ہے
کہ قاضی ابو یوسف پہلے شخص ہیں جس نے علماء کے لئے ایک خاص لباس تجویز کیا کہ آجتک
برتا جاتا ہے ورنہ اُن سے پہلے تمام لوگوں کا ایک لباس تھا۔"

امام محمد بن الحسن الشیبانی رضی

یہ فقہ حنفی کے دوسرے بازو ہیں۔ ان کا اصلی وطن دمشق کے متصل ایک گانوں تھا جس کو
حرستا کہتے ہیں۔ ان کے والد وطن چھوڑ کر واسط چلے آئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی امام
محمد ۱۳۵ھ میں یہیں پیدا ہوئے۔ سن رشد کا آغاز تھا کہ کوفہ جانا ہوا۔ یہاں علوم کی تحصیل
شروع کی اور بڑے بڑے فقہاء ومحدثین کی صحبت اُٹھائی مسعر بن کدام امام سفیان ثوری
مالک بن دینار۔ امام اوزاعی۔ وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں۔ کم وبیش دو برس تک امام
ابوحنیفہ کی خدمت میں رہے۔ امام صاحب کی وفات کے بعد قاضی ابو یوسف سے بقیہ تحصیل
کی۔ پھر مدینہ منورہ گئے اور تین برس تک امام مالک سے حدیث پڑھتے رہے۔ آغاز شباب
ہی میں ان کے فضل وکمال کے چرچے پھیل گئے تھے بیس برس کے سن میں مسند درس پر بیٹھے

[1] اس کتاب کا نام توالی التاسیس بمعالی ابن ادریس ہے۔ اور ۱۳۰۱ھ میں مطبع میریہ میں طبع ہوئی ہے ۱۲

اور لوگوں نے ان سے استفادہ شروع کیا۔ ہارون الرشید نے ان کے فضل و کمال سے واقف ہو کر قضا کی خدمت دی اور اکثر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ۱۸۹ھ میں رے۔ گیا تو ان کو بھی ساتھ لے گیا۔ رے کے قریب رنبویہ ایک گانوں ہے وہاں پہنچ کر قضا کی۔ اتفاق یہ کہ کسائی جو مشہور نحوی گذرا ہے وہ بھی اس سفر میں ساتھ تھا اور اُس نے بھی یہیں انتقال کیا۔ ہارون الرشید کو نہایت صدمہ ہُوا۔ اور کہا کہ "آج فقہ اور نحو دونوں کو ہم دفن کر آئے"

علامہ یزیدی نے جو ایک مشہور ادیب اور ہارون الرشید کے درباریوں میں تھے نہایت جانگداز مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

فقلت اذا ما اشکل الخطب من لنا   بایضاحہ یوما و انت فقید

ترجمہ "یعنے ہم نے کہا کہ جب تو نہ رہا تو ہمارے لئے مشکلات کا حل کرنیوالا کہاں سے آئے گا؟

امام محمدؒ نے اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ دربار کے تعلق سے بسر کیا۔ لیکن آزادی اور حق گوئی کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ۱۷۵ھ میں یحیٰی علوی نے جب علم بغاوت بلند کیا تو ہارون الرشید اُن کا سرو سامان دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ اور دب کر صلح اختیار کی معاہدہ صلح قلمبند ہُوا اور یحییٰ کے اطمینان کے لئے بڑے بڑے علماء فضلاء فقہاء اور محدثین نے اُس پر دستخط کئے یحییٰ صلح پر راضی ہو کر بغداد میں آئے تو چند روز کے بعد ہارون الرشید نے نقض عہد کرنا چاہا۔ تمام علماء نے ہارون الرشید کے خوف سے فتویٰ دیدیا کہ صورت موجودہ میں نقض عہد جائز ہے۔ لیکن امام محمدؒ نے علانیہ مخالفت کی اور اخیر تک اپنے اصرار پر قائم رہے۔

امام محمدؒ جس رتبہ کے شخص تھے اُس کا اندازہ۔ ائمہ مجتہدین کے اقوال سے ہو سکتا ہے امام شافعی کا قول ہے۔ کہ "امام محمدؒ جب کوئی مسئلہ بیان کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وحی اُتر رہی ہے" انہیں کا قول ہے "کہ میں نے امام محمدؒ سے ایک بار شتر کی برابر علم حاصل کیا" امام احمد حنبل سے کسی نے پوچھا کہ یہ دقیق مسائل کہاں سے حاصل ہوئے فرمایا محمد بن الحسنؒ کی کتابوں سے"[1]

امام محمدؒ کی حلقۂ درس سے اگرچہ اور بہت سے نامور علماء تعلیم پا کر نکلے۔ لیکن اُن سب میں امام شافعی کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے زمانہ کے کم نظروں کو

[1] یہ تمام اقوال محدث نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں نقل کئے ہیں ۱۲

اس سے تعجب ہوگا۔ اگلے زمانہ بھی ابن تیمیہ نے امام شافعی کی شاگردی سے انکار کیا تھا لیکن حق کو کون دبا سکتا ہے، تاریخ و رجال کی آج سیکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ وہ کیا شہادت دے رہی ہیں؟ بے شبہہ امام شافعی کو امام محمدؒ کی فیض صحبت نے بڑے بڑے کمالات کے رستے دکھائے اور اُس کا خود اُن کو اعتراف تھا۔ حافظ ابن حجر امام شافعی کا قول نقل کرتے ہیں۔ کان محمد بن الحسن جید المنزلۃ عند الخلیفۃ فاختلفت الیہ وقلت ھو اولی من جھۃ الفقہ فلزمتہ[1] وکتبت عنہ یعنی محمد بن الحسن خلیفہ کے ہاں بہت معزز تھے اس لئے میں اُن کے پاس آتا جاتا تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ وہ فقہ کے لحاظ سے بھی عالی رتبہ ہیں اِس لئے میں نے اُن کی صُحبت لازم پکڑی اور اُن کا درس قلمبند کرتا تھا۔

امام محمدؒ خود بھی امام شافعی کی نہایت عزت کرتے تھے اور تمام شاگردوں کی نسبت اُن کے ساتھ خاص مراعات کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ایک دن ہارون الرشید کے دربار میں جا رہے تھے۔ راہ میں امام شافعی ملے جو ان کی ملاقات کو آرہے تھے۔ اُسی وقت گھوڑے سے اُتر پڑے اور نوکر سے کہا کہ خلیفہ کے پاس جا اور عُذر بیان کر کہ میں اسوقت حاضر نہیں ہو سکتا۔ امام شافعی نے کہا میں اور کسی وقت حاضر ہوں گا آپ دربار میں تشریف لیجائیں امام محمدؒ نے کہا "نہیں وہاں جانا کچھ ضرور نہیں"[2]۔ امام محمدؒ و امام شافعی میں اکثر مناظرات بھی رہتے تھے۔ اور اسی بنا پر بعضوں کو اُن کی شاگردی سے انکار ہے۔ لیکن اُس زمانہ کی اُستادی و شاگردی میں یہ امور معیوب نہ تھے اور در اصل آج بھی معیوب نہیں۔

امام محمدؒ کی شہرت اگرچہ زیادہ تر فقہ میں ہے اور اُن کی تصنیفات عموماً اِسی فن کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ لیکن وہ تفسیر۔ حدیث۔ ادب۔ میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے امام شافعی کا قول ہے کہ "میں نے قرآن مجید کا عالم امام محمدؒ سے بڑھ کر نہیں دیکھا"[3]۔ ادب و عربیت میں اگرچہ اُن کی کوئی تصنیف موجود نہیں۔ لیکن فقہ کے جو مسائل نحو کے جزئیات پر مبنی ہیں اکثر جامع کبیر میں مذکور ہیں اور اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ اِس فن میں اُن کا کیا پایہ تھا چنانچہ ابن خلکان وغیرہ نے خصوصیت کے ساتھ اِس کا ذکر کیا ہے۔

حدیث میں اُن کی کتاب مؤطا مشہور ہے۔ اِس کے علاوہ کتاب الحجج جو امام مالک کی

[1] دیکھو توالی التاسیس مطبوعہ مصر صفحہ ۶۹-۱۲ [2] توالی التاسیس صفحہ ۶۹-۱۲ [3] الجواہر المضیئہ ترجمہ امام محمدؒ ۱۲

رد میں لکھی ہے۔ اُس میں اکثر حدیثیں روائت کی ہیں اور متعدد مسائل ہیں جوش ادعا کے ساتھ کہا ہے کہ مدینہ والوں کو دعویٰ ہے کہ وہ حدیث کے پیرو ہیں۔ حالانکہ ان مسائل میں صریح اُن کے خلاف حدیث موجود ہے۔

امام محمدؒ کی تصنیفات۔ تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور آج فقہ حنفی کا مدار انہی کتابوں پر ہے ہم ذیل میں اُن کتابوں کی فہرست لکھتے ہیں جن میں امام ابوحنیفہؒ کے مسائل روایتاً مذکور ہیں اور اس لئے وہ فقہ حنفی کے اصلی اصول خیال کئے جاتے ہیں۔

مبسوط۔ اصل میں یہ کتاب قاضی ابو یوسف کی تصنیف ہے۔ انہیں مسائل کو امام محمد نے زیادہ توضیح اور خوبی سے لکھا۔ یہ امام محمدؒ کی پہلی تصنیف ہے۔

جامع صغیر:۔ مبسوط کے بعد تصنیف ہوئی۔ اس کتاب میں امام محمدؒ نے قاضی ابو یوسف کی روائت سے امام ابوحنیفہؒ کے تمام اقوال لکھے ہیں۔ کل ۵۳۲ مسئلے ہیں جن میں سے ایک سو ستر مسائل کے متعلق اختلاف رائے بھی لکھا ہے۔ اِس کتاب میں تین قسم کے مسائل ہیں۔

(۱) جن کا ذکر بجز اس کتاب کے اور کہیں نہیں پایا جاتا۔

(۲) اور کتابوں میں بھی مذکور ہیں۔ لیکن اُن کتابوں میں امام محمدؒ نے تصریح نہیں کی تھی کہ یہ خاص ابوحنیفہ کے مسائل ہیں۔ اِس کتاب میں تصریح کر دی ہے۔

(۳) اور کتابوں میں مذکور تھے لیکن اس کتاب میں جن الفاظ سے لکھا ہے اُن سے بعض نئے فائدے مستنبط ہوتے ہیں۔ اِس کتاب کی تیس چالیس شرحیں لکھی گئیں جن کے نام اور مختصر حالات کشف الظنون وغیرہ میں ملتے ہیں۔

جامع کبیر۔ جامع صغیر کے بعد لکھی گئی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں۔ امام ابوحنیفہؒ کے اقوال کے ساتھ۔ قاضی ابو یوسف اور امام زفر کے اقوال بھی لکھے ہیں۔ ہر مسئلہ کے ساتھ دلیل لکھی ہے متاخرین حنفیہ نے۔ اصول فقہ کے جو مسائل قائم کئے ہیں زیادہ تر اِسی کتاب کی طرزِ استدلال و طریق استنباط سے کئے ہیں۔ بڑے بڑے نامور فقہاء نے اس کی شرحیں لکھیں جن میں سے ۴۲ شرحوں کا ذکر کشف الظنون میں ہے۔

زیادات۔ جامع کبیر کی تصنیف کے بعد جو فروع یاد آئے وہ اس میں درج کئے۔ اور اِسی لئے

زیادات نام رکھا۔

کتاب الحج۔ امام محمدؒ۔ امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ گئے۔ اور تین برس وہاں رہکر۔ امام مالک سے موطا۔ پڑھی۔ اہل مدینہ کا طریقۂ فقہ جدا تھا۔ بہت سے مسائل میں وہ لوگ امام ابوحنیفہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ امام محمدؒ نے مدینہ سے آکر یہ کتاب لکھی۔ اِس میں اوّل وہ ابوحنیفہ۔ کا قول نقل کرتے ہیں۔ پھر مدینہ۔ والوں کا اختلاف بیان کر کے۔ حدیث۔ آثر۔ قیاس سے ثابت کرتے ہیں۔ کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب صحیح ہے اور دوسروں کا غلط۔ امام رازی نے مناقب الشافعی میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔ میں نے اُس کا ایک قلمی نسخہ بھی دیکھا ہے۔

سیر صغیر و کبیر۔ یہ سب سے اخیر تصنیف ہے۔ اوّل سیر صغیر لکھی۔ اُس کا ایک نسخہ امام اوزاعی کی نظر سے گذرا۔ اُنہوں نے طعن سے کہا کہ اہلِ عراق کو فن سیر سے کیا نسبت! امام محمدؒ نے سُنا تو سیر کبیر لکھنی شروع کی۔ طیّار ہو چکی تو ساٹھ جزوں میں آئی۔ امام محمدؒ اس ضخیم کتاب کو ایک خچر پر رکھوا کر ہارون الرشید کے پاس لے گئے۔ ہارون الرشید کو پہلے سے خبر ہو چکی تھی۔ اُس نے قدر دانی کے لحاظ سے شہزادوں کو بھیجا کہ خود جا کر امام محمدؒ سے اُس کی سند لیں۔

اِن کتابوں کے علاوہ۔ امام محمدؒ کی اور تصانیف بھی فقہ میں موجود ہیں۔ مثلاً کیسانیات جرجانیات۔ رقیات۔ ہرونیات۔ لیکن یہ کتابیں فقہاء کی اصطلاح میں ظاہر الروایۃ میں داخل نہیں۔ بلکہ کتاب الحج جس کا ذکر اوپر ہو چکا وہ بھی اس سلسلہ سے خارج ہے۔

امام زفر

فقہ میں اگرچہ ان کا رتبہ امام محمدؒ سے زیادہ مانا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ اُن کی کوئی تصنیف موجود نہیں ہے اور اُن کے حالات بھی بہت کم معلوم ہیں اس لئے صاحبین سے اُن کو مؤخر رکھنا پڑا۔

یہ عربی النسل تھے۔ شروع زمانہ میں ان کو حدیث کا توغل رہا اور اسی وجہ سے جیسا کہ علامہ نووی نے تہذیب اللغات میں تصریح کی ہے۔ صاحب الحدیث کہلاتے تھے

پھر فقہ کی طرف توجہ کی اور اخیر عمر تک یہی مشغلہ رہا۔

یحییٰ بن معین جو فن جرح و تعدیل کے امام ہیں اُن کا قول ہے کہ زفر صاحب الرای ثقۃ ماموں بعض لوگوں نے اِن کی تضعیف بھی کی ہے۔ لیکن وہ مبہم ہے اور قابل اعتناء نہیں۔

اِن کو خاص کر قیاسی احکام میں نہایت کمال تھا۔ امام ابو حنیفہ اِن کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ اقیس اصحابی وکیع بن الجراح۔ جن کا ذکر اوپر گذر چکا اِن سے استفادہ کرتے تھے قضا کا عہدہ بھی ان کو ملا تھا۔ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۵۸ھ میں وفات کی۔

قاسم بن معن

بہت بڑے نامور شخص تھے صحاح ستّہ کے مصنفین نے اِن سے روایت کی ہے اگرچہ اِن کو حدیث وفقہ میں بھی کمال تھا لیکن عربیت و ادب میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے امام محمد اِن کی خدمت میں استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتے تھے۔ خلیفہ نے ان کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ مجبوراً قبول کرنا پڑا لیکن تنخواہ کبھی نہیں لی۔

امام ابو حنیفہ کو ان سے خاص محبت تھی۔ یہ بھی منجملہ اُن لوگوں کے ہیں جن کی نسبت امام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ تم لوگ میرے دل کی تسلی اور میرے غم کے مٹانے والے ہو" اِن کو بھی امام صاحب کے ساتھ نہایت خلوص تھا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ فقہ و عربیت دونوں کے امام ہیں۔ اِن دونوں علموں میں سے وسیع کون علم ہے؟ فرمایا کہ "واللہ امام ابو حنیفہ کی ایک تحریر کل فن عربیت پر بھاری ہے" ۱۷۵ھ میں وفات کی۔

اسد بن عمرو

یہ پہلے شخص ہیں جن کو امام ابو حنیفہ کی مجلس تصنیف میں۔ تحریر کا کام سپرد ہوا۔ بہت بڑے رُتبہ کے شخص تھے۔ امام احمد بن حنبل نے اِن سے روایت کی ہے اور یحییٰ بن معین نے اِن کو ثقہ کہا ہے۔

۵۱ تہذیب اللغات والاسماء۔ علامہ نووی ۱۲

ہلال رازی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ہارون الرشید مکہ معظمہ گیا۔ طواف سے فارغ ہو کر کعبہ میں داخل ہوا، اور ایک جگہ بیٹھ گیا۔ تمام اہل دربار اور اعیان ہاشم کھڑے تھے۔ مگر ایک شخص ہارون الرشید کی برابر بیٹھا۔ مجھ کو نہائت تعجب ہوا۔ لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اسد بن عمرو ہیں[۵۱]۔

علی بن المسہر

فن حدیث امام اعمش و ہشام بن عروہ سے حاصل کیا تھا۔ امام بخاری و مسلم نے ان کی روائیت سے حدیثیں نقل کی ہیں۔ امام احمد بن حنبل ان کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے امام سفیان ثوری نے امام ابوحنیفہ کی تصنیفات پر جو اطلاع حاصل کی انہیں کے ذریعہ سے کی۔ موصل کے قاضی تھے۔ ۱۸۹ھ میں انتقال کیا[۵۲]۔

عافیہ بن یزید

یہ وہی بزرگ ہیں جن کی نسبت امام ابوحنیفہ مجلس تصنیف میں فرمایا کرتے تھے کہ جب تک عافیہ نہ آچکیں کسی مسئلہ کو قلمبند نہ کرو۔ علامہ ذہبی نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ کان من خیار القضاۃ۔

حبان

کثیر الروائیۃ تھے۔ ابن ماجہ میں ان کی روائیت سے متعدد حدیثیں موجود ہیں۔ امام ابوحنیفہ ان کی قوت حفظ کے بہت مداح تھے۔ ۱۷۲ھ میں وفات کی۔

---

۵۱ الجواہر المضیئۃ ۱۲

۵۲ یہ حالات مجھ کو صرف الجواہر المضیئہ سے معلوم ہوئے ۱۲

مندل

حبان کے بھائی تھے۔ امام اعمش و ہشام بن عروہ و عبد الملک بن عمیر و عاصم احول و امام ابو حنیفہ سے حدیثیں روایت کیں۔ نہایت متورع اور پرہیزگار تھے۔ ۱۶۸ھ میں انتقال کیا ان کے بھائی حبان نے نہایت باثر مرثیہ لکھا ہے علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اُس کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔ دو شعر یہ ہیں:۔

فاذا اذکرُ فقدان اخی	انقلبتُ فی فراشی ارقا
واخ ای اخ مثل اخی	قد جری فی کلّ خیرٍ سبقا

(بے خواب)

ختم شد

افسانۂ یاران کہن خواندم و رفتم	
	دریاب کہ لعل و گہر افشاندم و رفتم

۱۵ دسمبر ۱۸۹۳ء
مقام علیگڈھ
شبلی نعمانی

نویسندہ محمد حیات کاتب ڈیرہ کاتبان لاہور
دمرکنٹایل پریس لاہور میں باہتمام لالہ دیوان چند پرنٹر چھپا اور ملک مبارک علی شاہ بکس پبلشر نے چھپوایا)